داغ

تمکین کاظمی [redacted]

ناشران

آئینۂ ادب ۔ چوک مینار (انارکلی) لاہور

بار اوّل
تعداد - ۱۱۰۰
سنہ ۱۹۶۰ء

160/ [redacted]

اہتمام

م، ع، سلام۔ آئینۂ ادب۔ چوک مینار انارکلی

لاہور

(اشرف پریس لاہور میں طبع ہوئی)



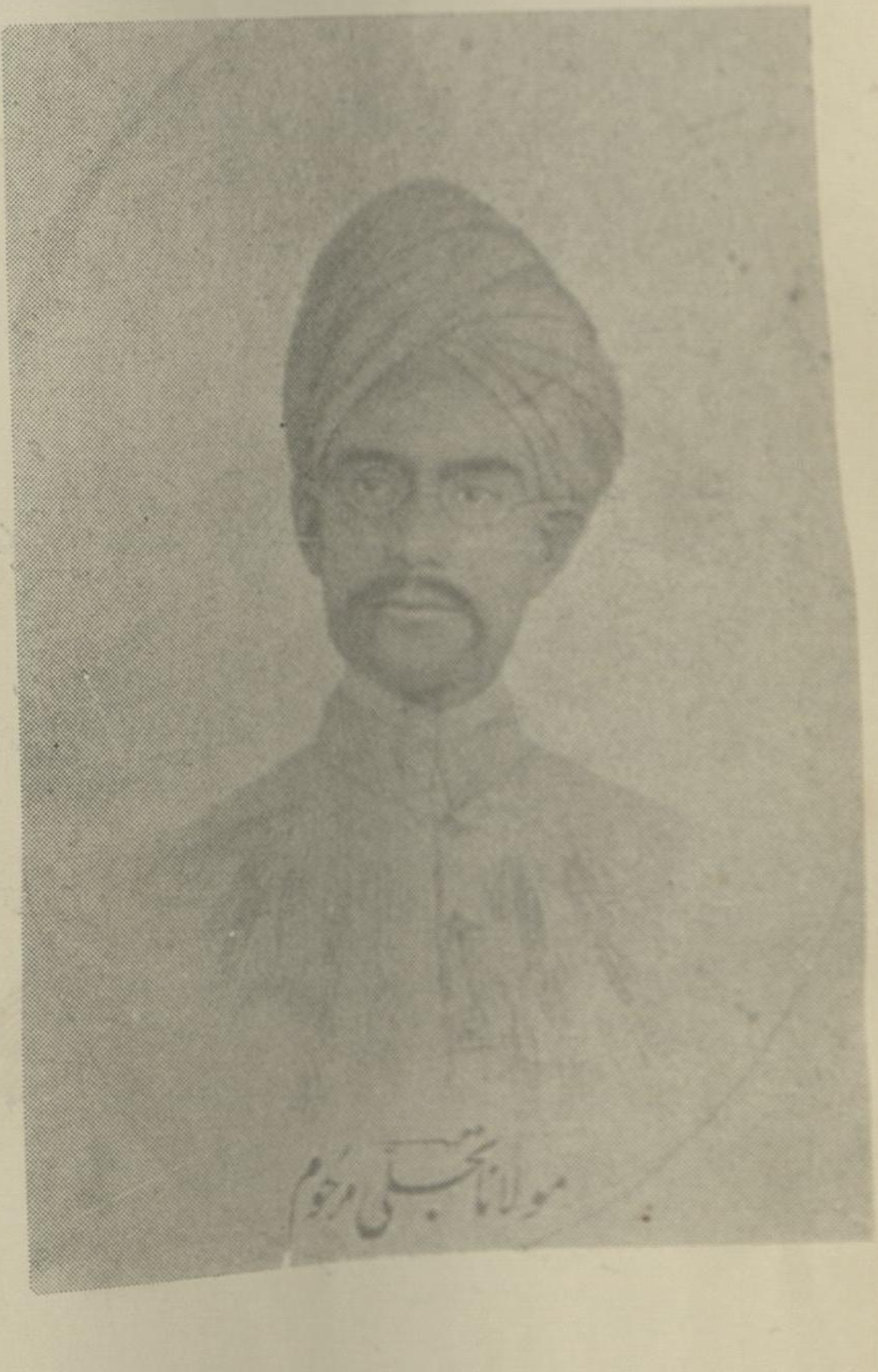
فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی

فہرس

حضرت والد ماجد

سیّد منتجب الدین تجلّی مغفور

کے نام



مولانا شبلی مرحوم

نواب صاحب سلام

میں خیر کا طالب ہوں آپ کے خط کا مشکور ہوں
مرمت کی کیا صورت ہوئی اس بارش میں بڑی مشکل سے
میر حجاب کل سے وارد ہیں اور آپ کے مشتاق
اونکا مکان گرا جاتا ہے بچ گئے اوسکی مرمت
مجبوری ہے یہاں تو کبھی لکھا تا نہیں زیادہ نیاز

فصیح الملک داغ دہلوی

۷ جمادی الاول سنہ ۱۳۲۱

یکشنبہ

دیباچہ

میرے والد مغفور (حضرت تجلّی) داغ کے حیدر آباد آنے کے بعد یعنی اپریل ۱۸۸۸ء سے اُن کی وفات فروری ۱۹۰۵ء تک مسلسل اُن سے ملتے جُلتے رہے ابتداً ایک طالب علم کی حیثیت سے پھر ایک شاگرد کی حیثیت سے، اِس سترہ سال کی ملاقات اور یگانگت کی وجہ سے دونوں میں خاصے مراسم تھے اور اسی وجہ سے داغ کے شاگردوں سے بھی برادرانہ تعلقات رہے چنانچہ آزاد، الم، بارق، تشنہ، خلق، رسا، زعم، ضیا، کیفی، ناظم، نادان، واصفی، وارث وغیرہ تو حیدر آباد ہی تھے، نوح، سائل، بیخود، اشمک، انجم، طالب وغیرہ سے بھی دوستی ہوگئی تھی۔

آج سے پچاس سال پہلے نہ تو کلب تھے نہ کوئی ایسے مقام جہاں شام گزاری جاسکے، شرفا اپنے دیوان خانوں ہی میں دوست احباب کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارتے تھے، چنانچہ ہمارا دیوان خانہ مُغلپورہ کا ادبی مرکز تھا، کیفی ناظم، ضیا، زعم، رسا، خلق، ترکی، وغیرہ روزانہ اکٹھا ہوتے اور شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ داغ کے قصّے بیان ہوتے، مَیں بھی کونے میں بیٹھا ہوا سُنا کرتا، اِس طرح مَیں داغ سے مانُوس ہوتا گیا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ یہ قصّے میری سمجھ میں نہ آتے اور مَیں رات کے کھانے پر والد سے پُوچھتا تو وہ اس کی تفصیل سُنا دیتے۔

جب ذرا سمجھ پیدا ہوئی تو مَیں نے بھی تک بندی یا قافیہ پیمائی شروع

کردی اور اپنی بکواس کیفی کو دکھانے لگا، جب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے تو ناظم سے اصلاح لیتا رہا اور جب ناظم نے ترک لباس کیا تو میں نے بھی تُک بندی ترک کردی مگر شعر و شاعری اور شعراء سے میری دلچسپیاں کم نہ ہوئیں ؛

امراؤ مرزا ناداں، داغ کے بھتیجے تھے اور داغ کے بعد ان کے شاگرد ہی ناداں کی زندگی کا سہارا تھے وہ ہمیشہ آیا کرتے تھے، نواب میر حسن علی خاں امیر کے فرزند میر آصف الدین صاحب سے میری خالہ اور میرے ماموں سیّد زین الدین صاحب (مہتمم محلّات مبارک) سے حسن علی خاں امیر کی صاجزادی بیاہی گئی تھیں اس لئے میری آمد و رفت امیر کے پاس بھی بہت تھی اور وہ بھی داغ ہی کے قصّے سُنایا کرتے تھے ؛

داغ کے مُلازم عبدالغنی اور جمال صاحب بھی اکثر آیا کرتے تھے ان سے بھی داغ ہی کی باتیں ہوتیں، مودود احمد تشنہ وظیفہ پر سبکدوش ہو کر پنشنت ہو گئے تو میرے پاس زیادہ آنے جانے لگے وہ بھی داغ ہی کے قصّے سُنایا کرتے تھے، چار پانچ سال مجھے محلّہ عثمان پورہ اور سُلطان پورہ میں رہنے کا اتفّاق ہوا تو عبدالصمد واضعی سے بھی زیادہ مُلاقاتیں ہونے لگیں انہوں نے بارہ سال اُستاد کی خدمت کی تھی اُن سے بھی بڑی اچھی باتیں معلوم ہوئیں ؛

میرے خُسر مولوی بہاءالدین، مولوی عنایت العلی دہلوی کے بیٹے اور مولٰنا کرامت علی محدّث دہلوی کے پوتے تھے داغ کے مراسم مولوی کرامت علی سے بھی تھے اور مولوی عنایت علی سے بھی دوستی تھی چنانچہ حیدرآباد آنے کے بعد سے داغ ان کے گھر آیا کرتے تھے، پھر مولوی بہاءالدین چونکہ

اعلیٰ حضرت غفران مکان کی خدمت میں باریاب تھے اور اکثر سفروں میں ہمرکابی کا اتفاق ہوتا تھا اس لئے داغ سے وہ بھی بے تکلف تھے، اور داغ کے بہت سے قصے سُنایا کرتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں مرزا سراج الدین احمد خاں سائل حیدرآباد آئے اور ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے مدت تک یہیں لیٹے رہے تو ان سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور داغ ہی کا ذکر رہنے لگا، اسی زمانے میں مرزا ناصر الدین احمد خاں (داغ کے نواسے) بھی حیدرآباد آگئے تو ان سے بھی یکجائی رہنے لگی، اس طرح ہر طرف داغ ہی کا چرچا رہا۔

۱۹۵۲ء میں صدیق محترم نیاز فتحپوری نے حسب عادت جنوری ۱۹۵۳ء کا پرچہ خاص نمبر بنانا چاہا تو مجھ سے مشورہ کیا اور میں نے داغ نمبر کا مشورہ دیا، نیاز صاحب خود بھی داغ کے معترف اور مداح تھے اس لئے انہوں نے داغ نمبر کا اعلان کر دیا اور مجھے "داغ اور حیدرآباد" پر ایک تفصیلی مضمون لکھنے کے لئے کہا اور ابھی میں نے یہ مضمون ختم بھی نہیں کیا تھا کہ اور ایک مضمون "داغ اور نظام" کی فرمایش بھی کی، چنانچہ یہ دونوں مضمون میں نے لکھ کر بھیج دئے مگر مُشکل یہ تھی کہ میرے مضامین فلسکیپ کے ۱۵۰ صفحات کے تھے اور نگار کا داغ نمبر طبع ہونے والا تھا ڈیڑھ سو صفحات پر، چونکہ بعض حضرات کے چھوٹے چھوٹے مضامین بڑے اچھے مِل گئے تھے اِس لئے مَیں نے اپنے مضامین کو روک کر ان مضامین کو شائع کر دینے کی خواہش کی اور نیاز صاحب نے ایسا ہی کیا۔

اِن مضامین کا تذکرہ محبّی مولٰنا حامد علی خاں مدیر الحمراء لاہور سے ہوا تو انہوں نے دونوں مضامین منگوا لئے اور ایک مضمون "داغ اور نظام"

مجلہ الحمراء بابتہ اپریل و مئی ۱۹۵۶ء میں شائع کر دیا۔

اسی اثناء میں مجھے خیال آیا کہ داغ کی مثنوی فریادِ داغ کو شائع کر دینا چاہیئے چنانچہ ایک بسیط مقدمہ فریادِ داغ پر لکھ کر میں نے برادرم تصدق حسین تاج کو دیدیا جسے انہوں نے کمرشیل بک ڈپو حیدرآباد سے شائع کرا دیا، پھر ایم عبدالسلام صاحب مالک آئینہ ادب لاہور نے اس کا ایک اڈیشن نہایت ہی خوبصورت شائع کیا۔

مقدمۂ داغ کے شائع ہونے کے بعد سے احباب نے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ داغ کی ایک سوانح عمری اسی طرح مرتب کر دو، داغ نے اپنی سوانح حیات جلوۂ داغ خود ہی لکھوائی تھی، پھر نثار علی شہرت دہلوی، سیماب صدیقی، افسیں اکبرآبادی نے دو تین سوانح عمریاں شائع کیں اور آخر میں نوراللہ محمد نوری نے بھی ایک مختصر سوانح عمری شائع کی تھی، اس طرح پانچ سوانح عمریاں داغ کی موجود تھیں اور ایک نگار کا داغ نمبر بھی اسی مقصد کو پورا کر رہا تھا، اس لئے میں نے احباب کے تقاضوں کو ٹال دیا مگر صدیقی عرشی رامپوری اور محبی مالک رام نے جب تحریک کی تو میں نے محض اس خیال سے اس کتاب کی ترتیب شروع کر دی کہ جو باتیں ان پانچوں سوانح عمریوں اور داغ نمبر میں نہ آسکیں انہیں منظر عام پر لاؤں۔

داغ کی سوانح عمری میں جو باتیں گفتنی تھیں وہ تو آچکی تھیں اور ان سے سب لوگ واقف تھے مگر بعض باتیں ایسی بھی تھیں جو ناگفتنی تھیں، یہ باتیں بعض تذکروں اور کتابوں میں اشارتاً کنایتاً بیان ہوئی تھیں اور اودھ پنچ کے کالم بھی ان سے سیاہ ہو چکے تھے مگر عوام کی نظروں سے یہ اوجھل تھیں، نگار کے داغ نمبر میں پھر انہیں منظر عام پر لایا گیا اور ان کی بھی اشاعت

ہو گئی۔

مُخبرِ صادقؐ نے تیرہ سو سال پہلے تصفیہ فرما دیا ہے کہ "تمہارے حسب تمہارے اخلاق ہیں اور تمہارے نسب تمہارے اعمال" اگر اس طرح چھان بین کی جائے تو معلوم نہیں دُنیا کی کتنی نامور ہستیاں اِس زد میں آجائیں، اِسی لئے سَتّارِ عیوب نے یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ قیامت کے روز ہر شخص ماں کے نام سے پُکارا جائے گا۔

سعادت و شقاوت ازلی ہے اِس سے نہ تو ماں کے بطن کا تعلق ہے اور نہ باپ کے صلب کا۔

گر رود سر برنہ گردد سر نوشت   ایں سُخن باید آب زر نوشت

ولادت کے اعتبار سے چاہے داغ کے متعلق ان کے معترضین کچھ بھی کہیں لیکن ان کے کردار اخلاق اور اعمال کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

داغ کے کردار کی مضبوطی ان کے اخلاق کی بلندی ان کے اعمال کی یکسانیت انہیں بڑا آدمی بنا دیتی ہے اور وُہ ایک خاص مقام اپنے لیئے پَیدا کر لیتے ہیں۔

مَیں نے صرف واقعات اور حالات پیش کئے ہیں ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ نہیں کیا ہے یہ کام بہت ہُوا اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، داغ کو لوگوں نے اب سمجھنا شروع کیا ہے، یُوں گزشتہ پچاس سال سے داغ گُمنامی میں نہیں رہے مگر داغ کی حقیقی عظمت اب ظاہر ہو رہی ہے اور وہ پچاس سال کے بعد پھر اُبھر رہے ہیں جبکہ ان کے معاصرین اسیرؔ، امیرؔ، جلالؔ، منیرؔ وغیرہ تقریباً گُم نام ہوتے جا رہے ہیں۔

اِس کتاب کی ترتیب میں مجھے محترمی مولانا غلام رسول مہرؔ، صدیقی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی، محبی پنڈت مانک رام (دہلی)، مکرمی ڈاکٹر زور، مشفقی مولوی محمد علی خاں آثر رامپوری، عزیزم فاضل زیدی سے خاصی مدد ملی ہے برادرم عزیزم میر یاسین علی خاں، بھائی تصدق حسین تاج اور محترمی پنڈت شاد میرٹھی کی امداد و اعانت کا بھی ممنون ہوں ۔

حادثات افکار اور آلام نے میرا حافظہ اتنا خراب کر دیا ہے کہ سینکڑوں قصے بھول گیا ہوں اگر آج سے پندرہ سال پہلے میں اسی کتاب کو مرتب کرتا تو بیشتر اہم واقعات اور قصے تفصیل سے بیان کر سکتا تھا جو میرے حافظے میں محفوظ تھے مگر اب نسیان نے انہیں اپنے قبضے میں لے لیا ہے ۔

تصنیف و تالیف میں دیانت اور رواداری میرا اصول رہا ہے اور میں ہمیشہ اس پر قائم رہا ہوں چنانچہ اس کتاب میں بھی میں نے کوئی بات دیانت داری سے ہٹی ہوئی نہیں لکھی ہے اور نہ داغ کو ہیرو بنا کر ان کے عیوب کو محاسن قرار دینے کی کوشش کی ہے جو کچھ مجھے معلوم ہوا میں نے صداقت اور ایمانداری سے پیش کر دیا ہے ۔

حالی نے "حیاتِ جاوید" مرتب کی تو اسے مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام نے "کتاب المناقب" فرمایا، جانسن نے سیاوج (SAVAGE .) اور کارلائل نے اسٹرلنگ (STERLING .) کی سوانح عمری لکھی تو ناقدین نے انہیں "ہدیۂ خلوص" یا "دوستانہ نذرِ عقیدت" قرار دیا ۔

حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے ۔

"انسان کے منتہائے کمال کی دلیل عیبوں سے پاک ہونا نہیں عیبوں کا کم ہونا ہے اور باوجود بے شمار خوبیوں کے اور حیرت انگیز اوصاف کے سرسید میں اس قسم کی کمزوری

کا پایا جانا ان کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دال ہے"۔

مجھے داغؔ کی بے شمار خوبیاں گنانے کی دُھن رہی ہے اور نہ چھوٹی موٹی کمزوریاں ظاہر کرکے ان میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت یا کاملیت ظاہر کرنے کا شوق رہا ہے، مَیں نے کوشش کی ہے کہ باسول کی طرح داغؔ کا مطالعہ کروں، میری عمر پندرہ تین سال کی تھی کہ داغؔ اللہ کو پیارے ہوگئے، مَیں نے داغؔ کے دوستوں، شاگردوں، عزیزوں، مُلازموں اور ملنے جُلنے والوں سے مختلف حالات معلوم کرکے ان کی سترہ سالہ آخری زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور صحیح واقعات نہایت ہی دیانت داری سے پیش کردئے ہیں۔

مَیں نے باسول کی تتبع کی ہے اور اِس کتاب کو فصلوں اور حصّوں میں تقسیم کئے بغیر بہ لحاظ سنین ترتیب دیا ہے اور ان موتیوں کی لڑی مرتب کردی ہے، خُدا کرے یہ کتاب سوانحی اعتبار سے کارآمد ہو اور اہل علم پسند کریں۔

حیدرآباد دکن
۷ر جون ۱۹۵۸ء

تمکین کاظمی

بِسم اللہ الرحمٰنِ الرّحیم

خاندان

سلطنتِ مُغلیہ کے زوال کے آخر زمانے میں ایک خاندان ترکِ وطن کر کے سمرقند پُہنچا جو قاسم جان، عارف جان اور عالم جان نامی تین بھائیوں پر مُشتمل تھا، حاکم سمرقند نے ان لوگوں کا شایانِ شان استقبال کیا اور اپنی مدارالمہامی دی، حاکم سمرقند کی زندگی تک اِس خاندان نے وہیں زندگی بسر کی مگر جب اس کا اِنتقال ہو گیا تو انہیں سمرقند چھوڑنا پڑا، وہاں سے نکل کر اٹک پُہنچے تو مرزا محمد بیگ صُوبہ دار اٹک نے بھی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنی بیٹی کا عقد عارف جان سے کر دیا ؞

عارف جان کو چار بیٹے نبی بخش خاں، احمد بخش خاں، الہٰی بخش خاں اور محمد علی خاں تولّد ہوئے مرزا محمد بیگ صُوبہ دار اٹک کے انتقال کے بعد یہ خاندان دہلی پُہنچا، اُس وقت یہ لوگ خاصے متموّل تھے علاوہ مال و اسباب کے نقد تیرہ ہزار اشرفیاں پاس تھیں، چنانچہ دہلی پہنچ کر بلّی ماران کے پاس ان لوگوں نے قیام کیا جس کی یادگار "قاسم جان کی گلی" اب تک موجود ہے ؞

احمد بخش خاں نے ابتداً گوالیار میں نوکری کر لی پھر نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے اور پھر راجہ بختاور سنگھ والئ الور کے

وکیل ریاست بن گئے، اُنہیں دنوں ریاست بھرت پور سے انگریزوں کی ٹھن گئی اور انگریزوں نے قلعہ ڈیگ پر چڑھائی کی تو احمد بخش خاں الور کے سواروں کا ایک دستہ لے کر انگریزوں کی مدد کے لئے پہنچ گئے، گھمسان کا رَن پڑا انگریز سپہ سالار کے گولی لگی اور وُہ گھوڑے سے گرنے لگا تو احمد بخش خاں نے اپنے آپ کو اس کے گھوڑے کی پیٹھ پر پہنچا کر اسے سنبھال لیا اور بڑی حفاظت سے میدانِ جنگ سے نکال لائے، اِس سپہ سالار نے مرتے مرتے ایک تحریر لکھ دی کہ احمد بخش خاں نے بڑی بہادری سے میری حفاظت کی ہے، لہٰذا انہیں اس کا مناسب صلہ دیا جائے، جب فتح کا دربار ہُوا تو لارڈ لیک نے احمد بخش خاں کو فیروز پور جھرکہ، پونا ہانا، بچھوڑا اور سانگرس کے اضلاع بطور جاگیر عطا کئے اور فخر الدولہ دلاور الملک، رستم جنگ، خطاب کے ساتھ سند دی، لارڈ لیک کی دریا دلی دیکھ کر راجہ بختاور سنگھ کو بھی جوش آگیا اور انہوں نے اسی دربار میں پرگنہ لوہارو اپنی طرف سے عنایت کرنے کا اعلان کر دیا، اِس طرح احمد بخش خاں نہ صرف جاگیر دار اور خطاب یافتہ ہو گئے بلکہ والئ ریاست بھی بن گئے ؎

الور کے قیام کے زمانے میں احمد بخش خاں نے ایک میوائن کو بیوی بنا لیا تھا جس کے بطن سے دو لڑکے شمس الدین خاں (ولادت ۱۸۰۹-۰۷ء) ابراہیم علی خاں اور دو لڑکیاں نواب بیگم اور جہانگیرا بیگم تولد ہوئے[1]، والئ ریاست بننے کے بعد انہوں نے نیاز محمد بیگ خاں مغل برلاس کی

[1] نواب بیگم وہی ہیں، زین العابدین خاں عارف سے اور جہانگیرا بیگم آگے ہیں اعظم خاں سے بیاہی گئیں، ۱۲

بیٹی بیگم جان سے شادی کی جن کے بطن سے دو بیٹے امین الدین خاں اور ضیاء الدین احمد خاں اور دو بیٹیاں ماہ رُخ بیگم اور بادشاہ بیگم تولد ہوئیں ؎

قاعدے کی رو سے شمس الدین خاں ریاست کے وارث نہیں ہوسکتے تھے۔ کیونکہ وُہ بیوی کے بطن سے نہ تھے اِس لیئے احمد بخش خاں نے انہیں فیروزپور جھرکہ دینا طے کرکے لوہارو بیگم جان کے بیٹوں کو دے دیا۔ اور ۱۸۲۲ء میں حکومت انگریزی اور ریاست الور سے ہی اس کی منظوری لے لی، اور ۱۸۲۵ء میں شمس الدین خاں سے بھی ایک دستاویز لکھوالی کہ پرگنہ لوہارو امین الدین خاں اور ضیاء الدین احمد خاں ہی کے قبضے میں رہے گا، اِس دستاویز پر جنرل اختر لونی اور سر جان مٹکاف کے دستخط بھی بطور گواہ لیئے گئے، اِس انتظام کے بعد ۱۸۲۶ء میں احمد بخش خاں خانہ نشین ہوگئے اور دو سال تک اِس تصفیہ پر عمل ہوتا دیکھ کر ۱۸۲۷ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے اس وقت شمس الدین خاں کی عُمر ۱۸ - ۱۹ سال اور امین الدین خاں ۱۱ - ۱۲ سال کے اور ضیاء الدین احمد خاں ۷ سال کے تھے ؎

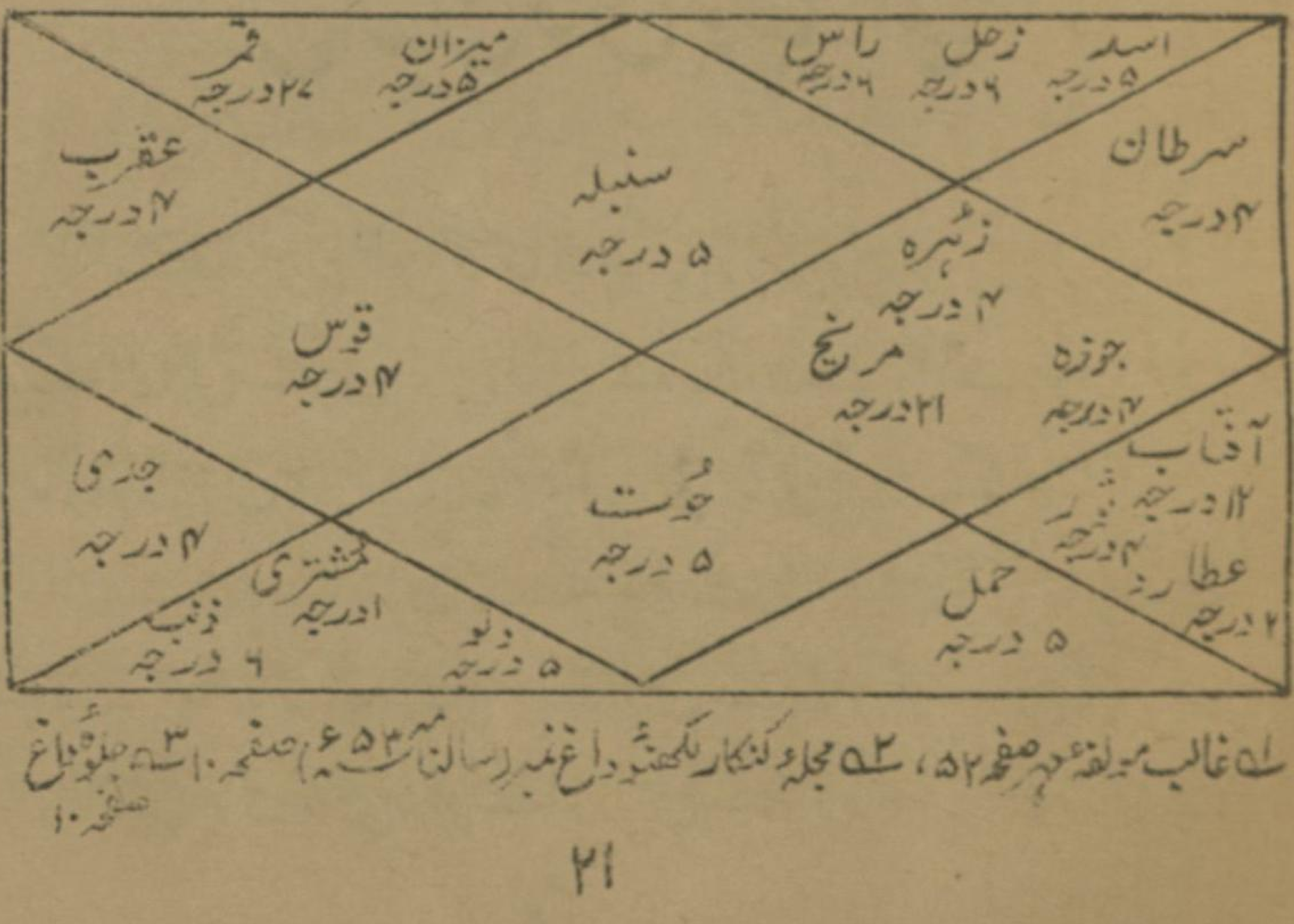
احمد بخش خاں کے مرتے ہی شمس الدین خاں نے دونوں علاتی بھائیوں کو محروم کردینا چاہا اور سرکار انگریزی میں درخواست کی کہ لوہارو اور دُوسرے علاقے میرے حوالے کردیئے جائیں اور چھوٹے بھائیوں کو صرف حصّہ دلایا جائے اُن دنوں سر ایڈورڈ کول برک دہلی میں رزیڈنٹ تھا اس نے شمس الدین خاں کی مخالفت کی مگر اتفّاق سے چند ہی روز کے بعد وُہ معزُول ہوگیا اور فرانسس ہاکنس اس کی جگہ آیا۔ جو

شمس الدین خاں کا دوست تھا اس نے ان کی طرفداری کی اور درخواست منظور ہو گئی جس کے نتیجے میں لوہارو بھی شمس الدین خاں کو مل گیا[1]۔

احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد شمس الدین خاں خود مختار تھے،

دلی میں ایک سادہ کار محمد یوسف کشمیری فن کار تھے جو بڑی عمدگی سے اپنا کاروبار چلاتے اور شرافت سے زندگی بسر کرتے تھے ان کی تین لڑکیاں تھیں جو بڑی خوبصورت تھیں ان کا غیر معمولی حسن و جمال ہی خاندان کی تباہی کا باعث ہوا، بڑی لڑکی کا حال تو معلوم نہ ہو سکا مگر قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جے پور میں کسی اچھے گھرانے میں پہنچ گئی، منجھلی لڑکی عمدہ خانم نواب یوسف علی خاں (جو بعد کو نواب رامپور ہوئے) سے متعلق ہو گئی، اور چھوٹی لڑکی وزیر بیگم شمس الدین خاں سے وابستہ ہوئی[2]

شمس الدین خاں اور چھوٹی بیگم کے اس سنجوگ کا نتیجہ ۱۲ ذی حجہ ۱۲۴۶ھ م ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء چہارشنبہ ۲۱ گھڑی ۲ پل (۲ بجے دن) کو عالم شہود میں جلوہ گر ہوا جس کا زائچہ یہ ہے[3]۔



۱ غالب مولفہ مہر صفحہ ۵۲، ۲ مجلہ نگار لکھنؤ داغ نمبر (سالنامہ ۱۹۵۳ء) صفحہ ۱۰، ۳ جلوۂ داغ صفحہ ۱۰

نام

اب تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نو مولود کا نام کیا رکھا گیا تھا، نثار علی شہرت نے آئینہ داغ میں لکھا ہے کہ ابراہیم نام رکھا گیا مگر کوئی روایت اس کی تصدیق نہ کر سکی خود داغ نے جلوۂ داغ میں کچھ نہیں لکھا یا ممکن ہے کہ شمس الدین خاں نے ابراہیم خاں نام رکھا ہو مگر شہرت نواب مرزا نام سے ہوئی جو یقیناً والدہ کا رکھا ہوا ہے۔

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ شادی کے بعد سسرال والوں نے نواب مرزا پکارنا شروع کیا جو مشہور ہو گیا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نواب مرزا سسرال کا دیا ہوا خطاب ہے تو پھر شادی تک کس نام سے مخاطب کئے جاتے تھے۔

شمس الدین خاں کو پھانسی

۱۸۳۲ء میں ہاکنس کا تبادلہ ہو گیا اور سر ولیم فریزر ریزیڈنٹ مقرر ہوا تو اس نے شمس الدین خاں کے حالات سے واقف ہو کر انہیں سمجھایا اور تینوں بھائیوں میں صفائی کرانی چاہی فریزر کے تعلقات اس خاندان سے دوستانہ اور بڑے گہرے تھے چنانچہ احمد بخش خاں کے بیٹے اسے چچا پکارتے تھے اسی لئے اس نے بڑی کوشش کی مگر شمس الدین خاں راضی نہ ہوئے اور اس نے مجبوراً سارے واقعات

صدر میں لکھ بھیجے اور پیروی کے لئے امین الدین خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو کلکتہ بھجوا دیا جہاں سے ۱۸۳۴ء میں تصفیہ ہو گیا اور پرگنہ لوہارو دونوں بھائیوں کے نام بحال کر دیا گیا،

کلکتہ کے اس فیصلے کے صادر ہونے کی اطلاع شمس الدین خاں کو ملی تو انہیں بہت رنج ہوا، ان کو متاثر دیکھ کر ان کے ایک مصاحب کریم خاں نے قسم کھائی کہ ولیم فریزر کو قتل کر دے گا چنانچہ انیا مئو کو ساتھ لے کر دہلی کا رُخ کیا اور شمس الدین خاں کی فرشی (چھوٹی) بندوق چھپائے دو مہینے تک فریزر کا تعاقب کرتا رہا اور ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو جبکہ فریزر کسی دعوت سے گھر لوٹ رہا تھا گولی مار دی۔

چونکہ شمس الدین خاں کی مخالفت کی شہرت ہو چکی تھی اس لئے فریزر کے قتل کے بعد ان پر نگاہیں پڑنے لگیں اس پر طرہ یہ ہوا کہ انہیں کے ایک عزیز فتح اللہ بیگ خاں اور مرزا غالب نے صاف صاف لفظوں میں اپنا شُبہ شمس الدین خاں پر ظاہر کیا، چنانچہ باقاعدہ تحقیقات شروع ہو گئی کسی کنوئیں سے شمس الدین خاں کی فرشی بندوق برآمد ہوئی تو کہیں سے چھٹیاں نکلی اور ان کا ایک سُرنگ گھوڑا بھی شہادت میں پیش ہوا، مقدمہ چلا قتل ثابت ہو گیا اور کریم خاں کو ۲۸ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی چونکہ عام طور پر دلّی کے لوگ اسے بے گناہ سمجھتے تھے اس لئے بعد نماز جمعہ تمام دلّی کی مساجد میں اس کے لئے دُعائے مغفرت کی گئی اور مدتوں اس کی قبر پر میلا لگا رہا۔

مجسٹریٹ نے کریم خاں کو سزائے موت دیتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا کہ کریم خاں قاتل ہے مگر یہ قتل شمس الدین خاں کی تحریک و اعانت سے

ہُوا ہے جو ایک ریاست کا والی ہے اِس لئے اُس کو سزا دینا میرے اختیار سے باہر ہے، جب یہ مسل کلکتہ بھجوائی گئی تو ضروری کارروائی کے بعد حکم ہُوا کہ شمس الدین خاں کو بھی پھانسی دی جائے، یہ کارروائی بصیغۂ راز ہوتی رہی اور کلکتہ سے حکم آتے ہی حکومت انگریزی نے شمس الدین خاں کو دہلی طلب کیا، جب وُہ دہلی جانے کے لئے تیار ہونے لگے تو خاندان کے تمام لوگ اور مصاحبین اور ملازمین نے مخالفت کی اور یہ رائے دی کہ راتوں رات یہاں سے نکل کر سکھوں کے علاقے میں پُہنچ جائیں، احمد بخش خاں کے زمانے کے ایک بوڑھے سانڈنی سوار نے جو بڑا وفادار تھا مجبور کیا کہ میری سانڈنی سنو کوس سے اِدھر دم لینے والی نہیں ہے میرے کپڑے پہن کر ہمیانی کمر سے باندھ کر نکل جائیے فرنگیوں پر بھروسہ نہ کیجئے وُہ آپ کو نہ چھوڑیں گے مگر شمس الدین خاں نے کسی کے مشورے کی پروا نہیں کی اور دس سوار ساتھ لے کر پالکی میں بیٹھ کر دہلی روانہ ہوگئے، شہر میں داخل ہوتے ہی ایجنٹ اور حکّام کو استقبال کے لئے موجود پایا، کرنیل سکنر نے جو ان کا دوست تھا آگے بڑھ کر کہا نواب صاحب! ہتھیار دیجئے اور بڑے صاحب (ایجنٹ) پر بھروسا کیجئے چنانچہ نواب نے تلوار حوالے کر دی، تلوار لیتے ہی مجسٹریٹ نے آگے بڑھ کر کہا "آپ سرکار کے حکم سے گرفتار کئے جاتے ہیں اِس وقت سے اپنے آپ کو قیدی تصوّر کیجئے"، اب شمس الدین خاں کی آنکھیں کھُلیں مگر کرتے کیا بے بس تھے پھر بھی سپاہیانہ آن بان دکھائی اور نہایت ہی جواں مردی سے موت کا استقبال کیا۔

انیا میو کو ان کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی اس نے سلطانی گواہ بن کر ساری کیفیت سُنا دی اور کارروائی مکمّل ہوگئی، مولٰنا ابوالکلام آزاد

فرماتے ہیں :-

"نندکمار کے بعد یہ دُوسری پھانسی تھی جو ایک ہندوستانی رئیس کے لئے انگریزی قانون کو تجویز کرنی پڑی چونکہ شمالی ہند میں اس وقت تک کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا تھا اس لئے حکومت کو غیر معمولی احتیاطوں سے کام لینا پڑا، کلکتہ سے ایجنٹ کو لکھا گیا کہ اِس بارے میں شاہِ دہلی سے ایک فرمان حاصل کرنا چاہیئے نیز عُلماء و ثقات شہر کا ایک محضر تیار کرانا چاہیئے کہ احکام شرع کی رو سے بھی فریزر کا قصاص ضروری ہے اور اس باب میں انگریزی فیصلہ شرع کے خلاف نہیں"۔

"مولوی رشید الدین کے مکاتیب کا جو قلمی مجموعہ میرے کُتب خانے میں ہے اس کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایجنسی کے دفتر انشاء نے ایک تحریر طیار کی تھی جس میں کُتب فقہ کی وُہ تصریحات نقل کر دی تھیں۔ جو ذمّی کے قصاص کے بارے میں ہیں اور صُورت یہ بتائی تھی کہ فریزر ذمیوں میں داخل تھے اس کے مُسلم قاتل اور محرّک قتل سے قصاص لینا واجب ہے، بادشاہ نے بڑی کوشش کر کے بعض علماء کو جو قلعہ سے وابستہ تھے اِس پر آمادہ کیا کہ اِس تحریر پر دستخط کر دیں اور اسی محضر کی بنا پر خود بھی ایک شقہ لکھ کر ایجنٹ کے حوالے کر دیا، یہ شقہ اور محضر تمام مُلک میں شائع کیا گیا اور رزیڈنٹوں اور پولیٹیکل ایجنٹوں کے ذریعہ تمام ریاستوں کے درباروں میں پہنچایا گیا تھا"۔[1]

---

[1] غالب مولفہ مولانا مہر حاشیہ ص ۵۲۔

شمس الدین خاں نے بڑی مردانگی سے جان دی پہلے سبز لباس پہنا جب وہ اُتروا دیا گیا تو سفید کپڑے پہن لئے جب پھانسی کے لئے لے چلے تو راستے میں ایک کنجڑے کی دُکان پر کیسرو نظر آئے جو افسر پالکی کے ساتھ تھا اسے کہا میرا جی چاہتا ہے کہ کیسرو کھاؤں اس نے پالکی رُکوا دی اور کیسرو خرید کر سامنے رکھے جب پالکی چلی تو یہ کیسرو کھاتے جاتے اور چھلکے باہر پھینکتے جاتے تھے اِس طرح مردانہ وار موت کا مقابلہ کیا، پھانسی پر لٹکنے کے بعد ان کی لاش قبلہ رُو ہو گئی جسے عام لوگوں نے ان کی بے گناہی کا ثبوت قرار دیا[1] ؛

۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو کشمیری دروازے سے باہر لنڈ پلٹن فوجیوں کے پہرے میں شمس الدین خاں کو پھانسی دی گئی ان کی میت ان کے خُسر مرزا مُغل بیگ خاں نے حاصل کر لی نماز جنازہ بعد نماز جمعہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت شاہ اسحٰق نے پڑھائی آٹھ ہزار آدمیوں نے نماز میں شرکت کی اور قدم شریف میں دفنایا گیا ؛

مشہور ہے کہ مدت تک دلّی کے لوگ شمس الدین خاں کی مزار پر پھول چڑھاتے رہے اور انہیں شہید کہا جاتا تھا ؛

ماں کی گود سے خالہ کی آغوش میں

نواب مرزا کی عمر چار سال چار مہینے ہوئی تھی کہ عین تسمیہ خوانی (بسم اللہ) کے زمانے میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، شمس الدین خاں نے چاندنی

[1] غالب مؤلفہ مہر صفحہ ۵۲ و ماہنامہ آجکل دہلی فروری ۱۹۵۶ء مقالہ مالک رام ،

چوک میں ایک مکان نواب مرزا کی والدہ کو دلادیا تھا جس میں وُہ رہتی تھیں اور وہیں نواب مرزا کی ولادت بھی ہوئی تھی چنانچہ پھانسی کے وقت بھی نواب مرزا اور ان کی والدہ اسی مکان میں تھیں، جب شمس الدین خاں کو پھانسی دی گئی اور ان کی جائداد ضبط ہونے لگی تو انگریزوں نے اس مکان کی تلاشی بھی لی اور غریب بیوہ اپنے کمسن لڑکے کو لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی، کمسن نواب مرزا پر قدرت مہربان تھی اس لئے ان کی خالہ عمدہ خانم نے اپنے پاس رکھ لیا البتہ دُکھیاری ماں انگریزوں کے خوف سے روپوش ہوگئی اور در در کی ٹھوکریں کھاتی پھری، نواب مرزا کی پرورش و پرداخت تین چار سال تک عُمدہ بیگم دہلی میں کرتی رہی، ۲۰ اگست ۱۸۴۰ء کو نواب محمد سعید خاں تخت نشین رامپور ہوئے تو یُوسف علی خاں بھی رامپور روانہ ہوئے جن کے ساتھ عمدہ خانم بھی نواب مرزا کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے رامپور پہنچ گئیں جہاں مولوی غیاث الدین صاحب (غیاث اللغات) کی شاگردی نواب مرزا نے کی اور خود نواب یُوسف علی خاں نے بھی کچھ پڑھایا۔

داغ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد شمس الدین خاں نے بڑی تفصیلی وصیت نامہ چھوڑا تھا جس میں ان کے اور ان کی والدہ کے نام جائداد اور نقد و جنس کی وصیت تھی مگر یہ وصیت نامہ انگریزوں نے غائب کر دیا اور کوئی چیز انہیں یا ان کی والدہ کو نہ مل سکی صرف ایک مکان جس میں ان کی ولادت ہوئی تھی جو ان کی والدہ کے نام خریدا گیا تھا ان لوگوں کو ملا اور کچھ نہ مل سکا، بظاہر داغ کے بیان کو صحیح نہ سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے کیونکہ شمس الدین خاں کو داغ کے علاوہ اور کوئی اولاد نرینہ نہ

تھی مرزا مُغل کی بیٹی سے دو لڑکیاں تھیں، دو ایک عورتیں اور بھی شمس الدین خاں سے وابستہ تھیں مگر وہ بھی صاحب اولاد نہ تھیں، شمس الدین خاں داغ کی والدہ سے ناخوش بھی نہ تھے، یقیناً انھوں نے تھوڑی بہت جائداد ان لوگوں کے نام لکھی ہوگی یا نقد رقم کی وصیت کی ہوگی، بہرحال جو کچھ بھی ہُوا غریب چھوٹی بیگم شمس الدین خاں کے بعد بالکل بے سہارا ہوگئیں ⁂

چھوٹی بیگم نے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور کیسے دن گزارے اس کی تفصیل تو معلوم نہ ہوسکی صرف اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دُوسرے شوہروں سے ایک لڑکی بادشاہ بیگم خفی اور ایک لڑکا آغا مرزا شاغل پیدا کیا اور آٹھ نو سال کی گردش کے بعد ان کے دن پھرے اور وہ ۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ میں ولیعہد سلطنت دہلی غلام فخرالدین صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر مرزا فخرو کے محل میں جا براجیں ⁂

داغ نے اپنی سوانح حیات میں جسے انہوں نے احسن مارہروی سے مرتب کرایا ہے اِس واقعہ کو یُوں لکھوایا ہے،

"مرزا (داغ) کی والدۂ ماجدہ نے صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولیعہد شاہِ دہلی کے دامن عاطفت میں امان لی اور اپنی زندگی کا بڑا حصہ محل شاہی میں گزارا اور نواب شوکت محل خطاب پایا"[1]

---

[1] جلوۂ داغ صفحہ ۱۰،

قلعۂ معلی میں

قلعہ میں پہنچنے کے بعد چھوٹی بیگم نے نواب مرزا (داغ) کو بھی بلوالیا،
۱۸۴۵ء / ۱۲۶۱ھ میں مرزا خورشید عالم پیدا ہوئے،

تعلیم و تربیت

قلعہ میں جس طرح تعلیم و تربیت ہوئی اس کی تفصیل جلوۂ داغ میں یوں لکھی ہے۔

"مرزا صاحب (داغ) بھی اپنی والدہ کے ساتھ قلعہ شاہی میں پہنچے اور گویا وہیں آپ کی تعلیم کی بسم اللہ ہوئی اگرچہ تعلیم کا سلسلہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور رامپور میں مولوی غیاث الدین صاحب (غیاث اللغات) سے فارسی درسی کتابیں پڑھی تھیں مگر پھر قلعۂ معلیٰ میں آکر مستقل طور پر مولوی سید احمد حسین صاحب ولد میر غلام حسین صاحب المتخلص بہ شکیبا جو میر تقی میر کے شاگرد تھے آپ کے معلّم مقرر ہوئے فارسی کی درسی کتابیں مرزا نے انہیں بزرگ سے تمام کیں، کتاب کا سبق لینے کے بعد خط کی مشق بھی ہوتی تھی چنانچہ پہلے مشہور خوشنویس سید امیر پنجہ کش دہلوی کے شاگرد ہوئے، پھر

معمولی اوقات میں مرزا عباد اللہ بیگ صاحب سے جو امیر صاحب کے شاگرد تھے اصلاح لیا کئے، فن سپاہ گری کے اصول اور تمام باتیں قلعہ معلیٰ میں رہ کر آپ نے سیکھی ہیں، چنانچہ عند التذکرہ ایک مرتبہ فرماتے تھے کہ مرزا عباد اللہ بیگ سے جن سے مَیں نے لکھنے کی مشق کی تھی انہیں سے بانک سیکھی اور مرزا سنگی بیگ سے جو خاندان میر حامد علی میں مشہور پھیکتی باز تھے، پھیکتی علی مدد سیکھی اور گھوڑے کی سواری کا طریقہ سجن خاں اور بندو خاں چابک سواران شاہی سے حاصل کیا اور بندوق لگانا اور فیتا کاٹنا صاحب عالم فتح الملک سے سیکھا۔"

شاعری کی ابتدا

جلوۂ داغ میں شاعری سے متعلق لکھا ہے،

"قلعہ میں پہنچ کر ابتدائے شعور سے جہاں اور بہت سی باتوں کا چرچا دیکھا وہاں سب سے زیادہ شاعری کی گرم بازاری بھی پائی، آپ کی خداداد اور ہونہار طبیعت کا رجحان اسی طرف زیادہ رہا، اس آتش شوق کو بھڑکانے والے سامان بہت کچھ جمع ہو گئے، خاقانی ہند سلطان الشعراء جناب

لہ جلوۂ داغ صفحہ،

شیخ محمدؐ ابراہیم حضرت ذوقؔ علیہ الرحمۃ کا زمانہ تھا اور بادشاہ ولیعہد کے اُستاد ہونے کی وجہ سے اکثر قلعہ میں تشریف لایا ہی کرتے تھے مرزا صاحب کی ذہانت اور خُداداد تیزئی طبع دیکھ کر صاحب عالم مرزا ولیعہد بہادر نے آپ کو حضرت ذوقؔ کا شاگرد کیا، جب آپ کو خاقانئ ہند کی شاگردی کا شرف حاصل ہُوا اُس وقت آپ کا سن گیارہ بارہ برس کا تھا۔

تخلّص

تخلّص کے متعلق کوئی صحیح روایت نہ مِل سکی کہ تخلّص کِس نے دیا مالک رام صاحب کا بیان ہے کہ ضیاءالدین احمد خاں نیرؔ درخشاں نے داغؔ تخلّص دیا مگر داغؔ کے بعض شاگردوں کا بیان ہے کہ داغؔ نے اپنے تخلّص کے متعلق ہمیشہ یہ بیان کیا ہے کہ یہ تخلّص صاحب عالم مرزا فخرو نے انہیں دیا اور ذوقؔ کا شاگرد کرایا[1]،

پہلے تو قدرت ہی نے داغؔ کو شاعر پیدا کیا تھا پھر قلعہ کی فضا نے ایسی ہوا دی کہ داغؔ نے گُلستاں کا باب پنجم شروع کر دیا، محلات شاہی تمدّنی اور معاشرتی حیثیت سے چاہے کوئی مرتبہ رکھتے ہوں مگر اخلاقی حیثیت سے نہایت ہی گھناونے رہے ہیں، شاہوں اور شاہزادوں کی بیگمات، نکاحتیاں، خواصیں، مدخولہ عورتیں اور پھر مُغلانیاں، دَدائیں،

---

[1] جلوۂ داغ ص۱۳،

انائیں، پیش خدمتیں، اصیلین، مامائیں وغیرہ وغیرہ بھری رہتی تھیں سوا رقص وموسیقی، مذاق دلگی چھیڑ چھاڑ اور اشتعال انگیز مشاغل کے اور کوئی کام نہ تھا، محلّات میں غیر مردوں کا داخلہ قطعاً نہ ہوتا تھا، اگر کوئی بدنصیب داغ کا سا محلّات میں پہنچ جاتا تو "جانِ عالم" بن جاتا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور داغ پر ہر طرف سے ڈورے پڑنے لگے، ان کی والدہ نے یہ تماشا دیکھا تو فوراً ہی ان کی شادی کر دی ؎

شادی

شادی کے وقت داغ کی عمر پندرہ ایک سال تھی[1]، داغ کی بیوی کے متعلق کہیں کوئی تحریر نہیں ملتی ناصر جلیل صاحب جو خاندانِ خواجہ میر درد کی آخری یادگار ہیں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے داغ کے خسر کو اپنے بچپن میں دیکھا ہے، مرزا رحمان شاہ، مرزا سبحان شاہ، مرزا فیروز شاہ اور مرزا ولایت شاہ چار بھائی شہزادگان دہلی میں سے تھے داغ کی بیوی اوّل الذکر مرزا رحمان شاہ کی صاحبزادی تھیں ؎

مجتبیٰ مالک رام صاحب نے سراج الدین احمد خاں سائل سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی بنا پر داغ کی بیوی کا نام فاطمہ بیگم تحریر فرمایا ہے، جن کی دو بہنیں اولیاء بیگم اور عزیز بیگم تھیں اولیاء بیگم غلام قدوس سے بیاہی گئی تھیں جن کو ایک لڑکی کلثوم بیگم اور ایک لڑکا تھا جس کا نام

---

[1] جلوۂ داغ صفحہ ۱۷-۱۸،

معلوم نہ ہو سکا، یہ کلثوم بیگم کسی میر تصدق حسین نامی سے بیاہی گئی تھیں جن کے بطن سے دو لڑکیاں صغرا بیگم اور لاڈلی بیگم تھیں، یہ ہی لاڈلی بیگم تھیں جنہیں داغ کی بیوی نے گود لیا تھا جو ابتداً مرزا ممتاز الدین احمد خاں سے بیاہی گئیں جن سے ایک لڑکا مرزا ناصر الدین احمد خاں تولد ہوا اور ان کے انتقال کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کا عقد ثانی سراج الدین احمد خاں سے کر دیا جو اب بھی حیات ہیں۔

بیگم مولوی ودود احمد خاں (والدۂ منظور جنگ مرحوم) جن کی عمر ایک سو دس سال سے زیادہ ہے اور جو دِلّی کے مشہور برلاس مغل خاندان کی یادگار اور خاندان لوہارو سے قرابت قریبہ رکھتی ہیں اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ داغ کی بیوی قلعہ ہی کی تھیں اور لاڈلی بیگم کے والد سیّد تھے۔

والد مرحوم بھی فرمایا کرتے تھے کہ "اُستانی خاندان مغلیہ سے تھیں" ممکن ہے انہوں نے خود داغ یا مرزا منیر الدین ضیا گورگانی دہلوی سے سُنا ہو مگر تفصیل انہوں نے کبھی نہیں سُنائی البتّہ یہ ضرور فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی لفظی تحقیق زیر بحث ہوتی تو داغ ہمیشہ اپنی بیوی سے پُوچھ لیا کرتے تھے چنانچہ کئی واقعات انہوں نے سُنائے تھے۔

ایک روز ایک حیدر آبادی نوجوان شاگرد ہونے کے لئے آئے اور حسب قاعدہ مٹھائی پیش کی جس پر فاتحہ (نیاز) دلوائی گئی اور سبھوں نے تبرک چکھا اتّفاق سے پُوری چنگیر بالُو شاہی کی تھی جسے کھاتے ہوئے کسی نے تذکر و تانیث کی بحث چھیڑ دی داغ نے پُوچھا دکن میں بالُوشاہی مذکر ہے یا مونث؟ کسی نے کہا مونث تو داغ نے کہا ہم بچپن سے مونث ہی سُنتے آئے ہیں مگر ٹھیرو ذرا تمہاری اُستانی سے پُوچھ لیں،

اب ہماری زبان باہر والوں میں بیٹھنے سے خراب ہو گئی ہے اِس لئے تحقیق کر لینا ہی بہتر ہے چنانچہ داؔغ اندر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آ کر کہنے لگے بیوی کہتی ہیں کہ بالُو شاہی قلعہ میں بھی مونث ہے ؎

اِس واقعہ سے داؔغ کی بیوی کا تعلق قلعہ سے ظاہر تو ہوتا ہے مگر خاندان کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ داؔغ کی بیوی اگر خاندان مُغلیہ سے نہ بھی تھیں تو دس بارہ سال قلعہ میں رہنے کی وجہ سے قلعہ کی زبان سے واقف ضرور ہو گئی تھیں ؎

مشاعروں میں شرکت

جلوۂ داؔغ میں پہلے مشاعرے کی شرکت کا حال یُوں لکھا ہے -

"علاوہ قلعہ کے اکثر شہر میں مختلف مقامات پر مشاعرے ہوا کرتے تھے مرزا صاحب نے پہلے پہل نواب مصطفٰی خاں شیفتہؔ کے مشاعرے میں غزل پڑھی جس کی طرح میں پہلا مطلع یہ فرمایا تھا" ؎

شرر و برق نہیں شعلہ سیماب نہیں کِس لئے پھر یہ ٹھہرتا دِل بیتاب نہیں[1]

اِس کے بعد دوسرے مشاعرے کی کیفیت یُوں لکھی ہے ،

"مرزا صاحب (داؔغ) فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ زینت بارہ دری میں مشاعرہ ہوا گیسوا پنا جادُو اپنا اِسی ردیف و قافیہ میں

---

[1] جلوۂ داغ صـ۱۳ ،

مصرع دیا گیا تھا مولوی امام بخش صہبائی کا زمانہ تھا۔ میں بھی غزل لکھ کر لے گیا تھا جب میں نے یہ مطلع پڑھا ؎

لگ گئی چُپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی — مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا

اِس کو سُنتے ہی صد آفریں کہتے ہوئے صہبائی اُٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔"[1]

ایک اور مشاعرے کا حال اِس طرح بیان کیا ہے،

"ایک مرتبہ نجم الدولہ حضرت غالب مرحوم نے قلم نکلے، ہم نکلے اِس ردیف میں بڑے زور کی غزل کہی مگر چُونکہ میرے پاس مصرع اسی شب پہنچا تھا جِس شب کو مشاعرہ تھا اِس لئے اتنی مُہلت نہ ملی کہ دو ایک روز پہلے اُستاد کے پاس لے جا کر اصلاح لیتا، مشاعرے کا وقت قریب تھا اور بادشاہ برآمد ہونے والے تھے کہ میں نے دیوان خاص میں وُہ غزل اُستاد کو سُنائی اُنھوں نے سُن کر فرمایا خاصے شعر ہیں اِتنے میں بادشاہ تشریف لائے اور مشاعرہ شروع ہو گیا، میں نے بھی اپنے نمبر سے غزل شروع کی جب یہ شعر پڑھا ؎

ہوئے مغرور وُہ جب آہ میری بے اثر دیکھی — کسی کا اِس طرح یا رب نہ دُنیا میں بھرم نکلے

تو شعر سُن کر بادشاہ نے اپنے پاس بُلا لیا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا،"[2]

ایک دُوسرے مشاعرے کی تفصیل یُوں بیان کی ہے،

"ایک مرتبہ نواب اصغر علی خاں نسیم کے ہاں مشاعرہ تھا حضرت ذوق حضرت غالب حضرت مومن وغیرہ اساتذہ شریک تھے

---

[1] جلوۂ داغ ص ۱۵، [2] جلوۂ داغ ص ۱۵-۱۶،

آسماں کے لئے ردیف، و قافیہ میں مصرع طرح دیا گیا تھا مرزا صاحب نے اِس زمین میں سرسری فکر کی تھی بلکہ اُستاد سے اصلاح بھی نہیں لی تھی کہ مشاعرے کا دن آگیا اتفاق سے اُس دِن مشاعرے میں مرزا صاحب کو اُستاد ذوقؔ اور حضرت مومنؔ کے درمیان بیٹھنے کو جگہ ملی، یہ قاعدہ تھا کہ جس مشاعرے میں، خاقانیٔ ہند سلطان الشعراء حضرت ذوقؔ شریک ہوتے اس مشاعرے میں سب کے بعد انہیں کا نمبر ہوتا تھا، جب سارا مشاعرہ غزلیں پڑھ چکا اور مرزا صاحب کا نمبر آیا تو اُستاد ذوقؔ نے ان سے غزل پڑھنے کے لئے کہا مرزا صاحب فرماتے تھے کہ ایسی اچھی غزلیں مَیں سُن چکا تھا ان غزلوں کے بعد میری غزل کا رنگ جمتا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا اس لئے مصلحتاً میں نے طرح کی غزل چھپالی اور اُستاد سے کہا کہ مَیں نے طرح میں غزل نہیں کہی ہے اگر ارشاد ہو تو غیر طرح عرض کروں، اُستاد نے پڑھنے کی اجازت دی اور مَیں نے مطلع پڑھا ؎

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا　　کبھی جاں صدقے ہوتی کبھی دِل نثار ہوتا

یہ مطلع سُنتے ہی تمام مشاعرے میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوگئی اور ہر طرف سے آفرین و مرحبا کی صدائیں آنے لگیں اِس غزل کے پڑھنے سے پیشتر بہت دیر سے مشاعرے میں سکوت تھا اب جبکہ اوّل سے آخر تک مرزا صاحب کی غزل کی واہ واہ ہوئی تو اُستاد ذوقؔ کو اپنی غزل کا رنگ نہ جمنے کا خیال پیدا ہوا چونکہ مرزا صاحب کے برابر ہی بیٹھے ہوئے تھے ان کی ہر ادا کو

دیکھ کر چُپکے چُپکے بار بار فرماتے جاتے تھے لَاحولَ وَلا قُوتَ کیا فروگزاشت ہوئی ہے اِس کا مطلب یہ تھا کہ مَیں نے اِن کو غیر طرح پڑھنے کی اجازت کیوں دے دی[1]"

ذوق کی توجّہ

حقیقت یہ ہے کہ داغ پیدائشی شاعر تھے اِس پر طرّہ قلعہ معلّی کا ماحول اور محلات کا قیام تھا، مگر شاعرانہ خصوصیات اور فنّی باریکیاں انہیں ذوق کی وجہ سے نصیب ہوئیں جو بڑی دلسوزی سے انہیں تیار کرتے رہے، اور ان میں وُسعتِ نظر تحقیق و تجسّس پیدا کیا، ذوق کی توجہ کے قصّے اور اصلاح کے طریقے داغ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو سُنایا کرتے تھے،

۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۴ء تک تقریباً دس سال داغ نے ذوق سے اکتساب فن کیا اور یہی دس سالہ مدّت داغ کی شاعری کی نشو و نما اور فنّی واقفیّت کی رہی ہے، داغ نے بڑی شوخ اور رنگین طبیعت پائی تھی اور بچپن ہی سے حُسن و محبّت کے معاملات ہو رہے تھے قلعہ معلّیٰ میں تو انہوں نے یہی کھیل کھیلا ہے بقول شخصے ؎

بچپن میں کبھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

نتیجہ یہ ہوا کہ جرأت کا رنگ فطرت نے چڑھا دیا اور بے باک قسم کے شعر داغ نے کہنے شروع کئے مگر ذوق کا رنگ اِس سے جُدا تھا اِس لئے

---

[1] جلوۂ داغ ص ۱۷-۱۸

انہوں نے روکنا ٹوکنا شروع کیا اور داغ ذرا سنبھلنے لگے مگر ذوق کا رنگ انہیں پسند نہ تھا ان کے سامنے مومن موجود تھے جو جرأت کی ترقی یافتہ شکل تھے اس لئے داغ نے مومن کی تتبع کرنی شروع کی، خیالات وہی رہے صرف طرزِ ادا ذوق کی اختیار کر لی اس طرح ایک نیا اسلوب داغ کا بننے لگا،

داغ کا ابتدائی کلام اس کا شاہد ہے جس کی شوخی اور چلبلاہٹ جرأت و مومن کی جھلکیاں پیش کرتی ہے مگر اس پر ذوق کی اصلاح ہوتی تو شوخی متانت اور چلبلاہٹ محاورے سے بدل جاتی تھی ؀

غالب سے فیض

مرزا غالب رشتے میں داغ کے پھپا تھے مگر شمس الدین خاں کے دشمن تھے چنانچہ مخبری کر کے شمس الدین خاں کو پھانسی کے تختے پہ پہنچانے والے غالب ہی تھے مگر داغ نے ان سے مراسم پیدا کر لئے تھے اور ان کے پاس آمد و رفت رکھی تھی، چنانچہ جب ذوق کا انتقال ہو گیا تو داغ نے زیادہ وقت غالب کے پاس گزارنا شروع کیا، غالب داغ سے شطرنج کھیلتے اپنی طرح کی ہوئی زمینوں پر غزلیں کہلواتے اور سن کر خوش ہوتے تھے، چنانچہ داغ اپنے شاگردوں کو ایسے قصے سنایا کرتے تھے جن سے غالب کی توجہ ظاہر ہوتی تھی ؀

خواجہ حالی داغ سے کچھ مکدر تھے اسی لئے یادگار غالب میں ان قصوں کو اس مختصر پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ

ایک صحبت میں نواب مرزا داغ کے اس شعر کو بار بار پڑھتے



دائیں سے بائیں، بیٹھے ہوئے : خلیل الرحمان شیفتہ - محی الدین محفوظ - نوح ناروی - مرزا مظفر حسین بارق - نواب حسن علی خان امیر -
فصیح الملک داغ - مرزا خورشید عالم - کریم الدین فضا - مودود احمد تشنہ - امراؤ مرزا نادان - عبد الوالی فروغ

کھڑے ہوئے : بشیر مرزا بشیر - غلام رسول کاتب دیوان - عبد العزیز صولت - عبد الصمد واصفی - سراج الدین احمد خان سائل -
مستجاب خان خلق - حامد حسین بیدل - عبد الغنی ملازم - بالا پرشاد فرحت - عبد الحمید ملازم خاص - رضی الدین حسن کیفی -

تھا اور وجد کرتے تھے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وُہ یہ کہتے ہیں ۔۔۔۔ اُدھر جاتا ہے دیکھو یا اِدھر پروانہ آتا ہے[1]

نثار علی شہرت نے لکھا ہے،

"ایک روز میں غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اُس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے، میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگ ترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجئے، چونکہ رمضان کا مہینہ تھا، اور مجھے روزہ تھا اس لئے میں نے اِس رنگ ترے کو ہاتھ نہیں لگایا، آپ تاڑ گئے فرماتے کیا ہیں، ہاں آپ مولوی ہو گئے ہیں، میں ہنسا تو آپ بھی مُسکرانے لگے، جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا اس میں کچھ بنانے لگے غالباً اصلاح دے رہے تھے میں نے گزارش کی جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں تو فرمایا اِس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دئے گئے ہیں، انہیں نکال رہا ہوں اور شستہ اُردو الفاظ اِس میں ڈال رہا ہوں، میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے، فرمانے لگے، وُہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں، شہرت! شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب اُن کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا، پھر فرمانے لگے دہلی والوں کی جو اردو ہے (جس کو مشک و عنبر کہنا چاہیئے) اِس کو ہی اشعار میں لکھنا

---

[1] یادگارِ غالب ص ۱۰۳ ،

چاہیئے آخر عمر میں تو ہماری یہی رائے قائم ہوئی ہے، مَیں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اُردو کیسی ہے؟ فرمانے لگے ایسی عمدہ کہ کیا کسی کی ہوگی، ذوق نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اِس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ تعلیم دے رہا ہے[1]"

۱۸۵۴ء یعنی ذوق کے انتقال کے بعد سے ۱۸۵۷ء کے وسط تک داغ نے غالب سے بہت استفادہ کیا ہے ذوق کی وفات کے بعد خود شاہ ظفر اور دُوسرے شہزادے غالب کے شاگرد ہو گئے مگر داغ نے باقاعدہ اُن کی شاگردی اختیار نہیں کی اور غالب نے بھی داغ کو باقاعدہ شاگرد بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی غزلوں پر غزلیں کہوا کر اپنے پاس بٹھا کر رموز و غوامض سے واقف کرا دیا اور جو کور کسر ذوق نے باقی رکھ دی تھی اسے غالب نے پُورا کر دیا، تین ساڑھے تین سال کی ہمنشینی نے داغ کو بنا دیا اور ان کا اپنا رنگ نکھرنے لگا، وُہ داغ جو جرأت کے رنگ کو مومن کی طرح اپنا رہا تھا ذوق کی سلاست اور غالب کی لطافت کو قلعۂ معلی کی زبان میں اِس خوبی سے ادا کرنے لگا کہ اساتذۂ دہلی بھی سر دھنّے لگے،

حقیقت یہ ہے کہ اگر داغ کو ابتداً ذوق کا تلمذ اور اس کے بعد غالب کی ہم نشینی نصیب نہ ہوتی تو وُہ داغ نہ بن سکتے تھے،

---

[1] آئینۂ داغ ص ۳۴،

سرسیّد کا اعتراف

مولوی عبدالرزاق کانپوری مولف البرامکہ نے سرسید کا ایک واقعہ نقل کیا ہے:

"ایک مرتبہ مولانا (شبلی) نے داغ کا ایک شعر پڑھا جس میں سلاطین کی جمع الجمع سلاطینوں آئی تھی اس پر میرے ایک دوست نے داغ کا مضحکہ اڑایا، سرسیّد ہنس کر چپ ہو رہے، جب دوبارہ بحث شروع ہوئی تو فرمایا، سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے لیکن اس شعر میں سلاطین سے قلعہ معلی کی اصطلاح کے مطابق دوسرے معنی مراد ہیں، تب مولانا (شبلی) نے عرض کیا تفصیل ارشاد فرمائیے میری سمجھ میں نہیں آیا، سیّد صاحب نے فرمایا کہ ولیعہد کے علاوہ، جس قدر تیموری شہزادے قلعہ معلی میں تھے ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا اور یہ بصیغۂ جمع بمعنی مفرد اردو میں مستعمل ہوتا تھا اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہے داغ نے قلعہ معلی میں عہد طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی ہے لہٰذا اس کا کلام مستند ہے[1]"

مشاہیر دہلی داغ کے معترف تھے چنانچہ احسن اللہ خاں ثاقب نے لکھا ہے کہ آزردہ بھی داغ کے مداح تھے۔

---

[1] یادایام (مجموعۂ مضامین عبدالرزاق) ص ۱۴۷

مُفتی صدرالدین خاں آزردہ کا اعتراف

احسن اللہ خاں ثاقب نے مکتُوباتِ امیر مینائیؔ کے مقدّمے میں لکھا ہے،
"مولانا حالی فرماتے تھے کہ جناب مُفتی صدرالدین خاں صاحب
آزردہ دہلوی صاف شعر پسند کرتے تھے اور اس لئے اشعار
داغؔ کے مداح تھے [1]"

حالیؔ کا اعتراف

معلوم نہیں کیا بات تھی کہ حالیؔ داغؔ سے خوش نہ تھے مگر تھے مُنصف مزاج اور شریف الطبع اس لئے انہوں نے اکثر مقامات پر اعتراف کیا ہے، چُنانچہ دہلی پر ماتم کرتے ہوئے ایک طویل غزل کہی ہے جس میں یہ شعر بھی ہے ؎

داغؔ و مجروحؔ کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی گُل و بُلبُل کا ترانہ ہرگز

پنڈت تربھون ناتھ زارؔ نے ایک لاسلکی تقریر میں یہ واقعہ سُنایا تھا کہ دہلی میں غدر کے بعد ایک مشاعرہ ہوا جس میں نظرؔ، اثرؔ، قافیہ ور کی صورت ردیف مقرّر کی گئی تھی، حالیؔ، داغؔ، مجروحؔ، آزادؔ، مائلؔ، نسّاخؔ وغیرہ موجود تھے حالیؔ نے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صُورت ہے نہ در کی صورت

---

[1] مکتوبات امیر مینائی صفحہ ۵۶۔

مجروح نے حالیؔ کے اس مطلع کی بڑی تعریف کی اور کہا یہ مطلع حاصلِ زمین ہے،
جب شمع داغؔ کے سامنے آئی تو داغؔ نے اِس شعر سے غزل شروع کی ؎

چھُپ کے بیٹھے ہوا گر مجھ سے چلو یوں ہی سہی — مَیں بھی اُٹھنے کا نہیں پردۂ در کی صورت

مشاعرہ واہ وا، کے شور سے گونج اُٹھا کسی نے چلا کر پُوچھا بھائی نواب
مرزا! مطلع سُناؤ، مگر داغؔ نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ شعر پڑھا ؎

اِس کو دیکھے کوئی محفل میں یہ کس کی طاقت — ہر بشر دیکھنے لگتا ہے بشر کی صُورت

اِس شعر کو سُن کر سارے مشاعرے پر وجد طاری ہو گیا، مجروحؔ نے داغؔ کے
مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ اب مَیں شعر نہ پڑھنے دوں گا، جب تک مطلع نہ سُن لوں،
داغؔ نے کہا جناب! آپ نے ارشاد فرمادیا ہے کہ خواجہ حالیؔ کا مطلع حاصل
زمین ہے اِس لئے مَیں نے مطلع چھوڑ دیا ہے، جب ساری محفل اصرار کرنے
لگی تو داغؔ نے مطلع سُنایا ؎

بزمِ دشمن میں نہ کِھلنا گُلِ تر کی صورت — جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صُورت

مشاعرے میں وُہ شورِ تحسین و آفریں بلند ہوا کہ کان پڑے آواز سُنائی نہ دیتی تھی،
خود حالیؔ نے بار بار پڑھوایا اور کہا "حاصل مشاعرہ یہ مطلع ہے داغؔ داغ ہے
بلکہ روشن چراغ ہے۔"

اِس مطلع کے بعد سامعین نے تقاضا کیا کہ پُورے مطلعے سُناؤ داغؔ نے
اور چار مطلعے کہے تھے جو سُنائے ؎

نہ مٹائے سے مٹی فتنہ و شر کی صورت — نظر آتی نہیں اب کوئی گزر کی صورت
سوچ لے پہلے ہی تُو نفع و ضرر کی صُورت — نامہ بر مجھ کو بھلا دینگے وُہ گھر کی صورت
کیا خبر کیا ہوئی فریاد و اثر کی صُورت — کہ اِدھر کب نظر آتی ہے اُدھر کی صورت
بگڑی شوریدہ سری سے مری گھر کی صُورت — وہی دیوار کی صُورت ہے جو در کی صورت

داغ کی سنجیدگی اور ان کے کردار کی بلندی اور عالی حوصلگی اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے محض حالی کے احترام اور مجروح کے الفاظ کی عزت رکھنے کے لئے داغ نے اپنا مطلع ہی نہیں سُنایا، اگر سامعین اور مجروح مجبور نہ کرتے تو وہ کبھی نہ سُناتے،

ایک مرتبہ بیخود دہلوی نے داغ کو لکھا کہ "پانی پت میں کسی صاحب نے مولوی صاحب قبلہ (حالی) سے فرمائش کی ہے کہ آپ کے تینوں دیوانوں کا انتخاب فرمائیں چنانچہ مولوی صاحب موصوف انتخاب کی انجام دہی میں کسی قدر آمادہ نظر آتے ہیں" تو اس کے جواب میں داغ نے بیخود کو لکھا ہے "جناب مولوی حالی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام کہہ دینا ان کو میں اپنا قدر دان سمجھتا ہوں" بیخود اور داغ کے یہ دونوں خطوط (بصورت عکس) ماہنامہ آجکل دہلی بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں طبع ہو چکے ہیں۔

مرزا فخرو کی وفات

داغ کی زندگی کا سنہری زمانہ یا تو وہ تھا جو قلعہ معلیٰ میں گزرا یا وہ رہا ہے جو فصیح الملک بننے کے بعد کا تھا، یہ ابتدائی زمانہ بارہ ۱۲ سال کا رہا ہے جس میں داغ کی پوری صلاحیتیں اُبھریں اور وہ مکمل شاعر بن گئے یہ زمانہ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۵۶ء تک رہا ہے،

فتح الملک بہادر غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو المتخلص بہ رمز، شاہ ظفر کے گیارہ بیٹوں میں تیسرے فرزند تھے ۱۸۱۶ء میں تولد ہوئے ۱۸۴۹ء

ہیں ولیعہد سلطنت دارا بخت کا انتقال ہوا تو اصولاً مرزا شاہ رُخ کو جو دُوسرے بیٹے تھے ولیعہد ہونا چاہیئے تھا مگر لارڈ ڈلہوزی نے بہ حیثیت گورنر جنرل ۱۸۵۲ء میں ایک نیا معاہدہ کر کے مرزا فخرو کو ولیعہد بنا دیا، اس ولیعہدی سے مرزا جواں بخت کی والدہ ملکہ زینت محل کو سخت اختلاف تھا چنانچہ انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور شاہ ظفر سے بھی ملکہ وکٹوریہ کو لکھوایا کہ مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کا اعلان کرا دیا جائے مگر کوئی بات نہ بنی، مشہور ہے کہ زینت محل ہی نے انگریز رزیڈنٹ سر ٹامس مٹکاف کو زہر کھلوا دیا تھا جس کی وجہ سے وُہ ۳ ر نومبر ۱۸۵۳ء کو فوت ہو گیا اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہی مرزا فخرو کو زہر دلوا دیا اور ۱۰ ر جولائی ۱۸۵۶ء کو یہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور عام طور پر مشہور ہو گیا کہ ہیضہ ہو گیا تھا،

مرزا فخرو کی پہلی بیوی مرزا جہانگیر کی صاحبزادی تھیں جن کے بطن سے مرزا ابو بکر تھے اور دُوسری بیوی مرزا الٰہی بخش کی بیٹی اور تیسری بیوی زبیدہ بیگم عُرف چھوٹی بیگم تھیں جن کا خطاب قلعہ میں شوکت محل بیان کیا جاتا ہے جن سے مرزا محمد خورشید عالم تھے،

مرزا فخرو شاعر بھی تھے ذوق سے تلمذ تھا ذوق کے بعد غالب سے مشورہ کرنے لگے تھے مشہور ہے کہ صاحب دیوان تھے مگر دیوان غدر میں ضائع ہو گیا چند شعر نمونتاً نقل کئے جاتے ہیں ؎

آنکھیں تو اس کو دیکھ کے ہوتی ہیں بیقرار
بن دیکھے دِل تڑپنے لگا اس کو کیا کروں

سب کچھ آساں ہے تجھے گردشِ دوراں کرنا
ایک مُشکل مری مُشکل کا ہے آساں کرنا

مانا کہ نہ دِل لے کر تُو مُجھ سے وفا کرتا
پر دل کی تسلّی کو وعدہ تو کیا کرتا

غم وُہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا
درد وُہ کیا جو لا دوا نہ ہُوا

وہ تو ملتا پرائے دلِ کم ظرف تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہُوا
جا پڑے ہم کوچۂ جاناں میں رمزؔ یار سے اپنا بھی ٹھکانا ہو گیا[1]

داغ کو اپنے والد کے آغوش محبت سے بہرہ اندوز ہونا تو نصیب نہ ہوا تھا مرزا فخرو کی پدرانہ شفقتیں ان کے شامل حال تھیں ظاہر ہے کہ داغ کو یہی محسوس ہوا ہوگا کہ اب ان کے والد نے انتقال کیا ہے، چنانچہ اس حادثے کی تاریخ انہوں نے کہی ہے [1]

غم فتح ملک سلطان چہ بلائے جان و دل شد دہد شش مقام جنت زکرم کریم غفار
چو زداغ سال رحلت دلِ دردمند پرسید بکشید آہِ حسرت دو صد دوازدہ بار
۱۲

قلعہ سے نکلنا

مرزا فخرو کے بعد داغ کو قلعہ سے نکلنا پڑا، گو کوئی مادی شہادت اس امر کی نہ مل سکی کہ داغ مرزا فخرو کی وفات کے بعد کہاں رہے مگر قیاس یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی خالہ ہی کے گھر پر رہے ہوں گے یا پھر اپنے سسرال میں قیام کیا ہوگا، یا خود اپنے ذاتی مکان میں قیام پذیر ہوئے ہوں گے، بہرحال یہ ثابت ہے کہ داغ کا قیام غدر تک دہلی ہی میں رہا، کیونکہ غدر کے چشم دید حالات وہ سنایا کرتے تھے اور یہ بھی بیان کرتے تھے کہ ان کا گھر لٹا اور دیوان بھی تلف ہوا۔

---

[1] مجلہ اردو ادب (انجمن ترقی اردو ہند) علیگڈھ جولائی ۱۹۵۱ء مقالہ مالک رام،

داغ کی تنخواہ

والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ داغ نے ایک دفعہ بیان کیا تھا کہ قلعہ معلیٰ میں ان کی تنخواہ مقرر تھی، جو غدر تک ملتی رہی ہے

اے داغ اہل قلعہ کا لُٹنا تو درکنار　　تنخواہ تک خزانۂ شاہی میں رہ گئی

اپنی ہی تنخواہ کے متعلق کہا ہے، مگر والد نے اس تنخواہ کی کوئی مقدار نہیں بتائی تھی معلوم نہیں خود داغ نے بھی تنخواہ کی مقدار بیان کی تھی یا صرف تنخواہ کا ذکر کیا تھا، بہرحال یہ ضرور ہے کہ داغ کو قلعہ سے تنخواہ مقرر تھی اور ان کی والدہ کی تنخواہ بھی یقیناً ہوگی ۔

غدر ۱۸۵۷ء

داغ کو قلعہ سے نکلے آٹھ نو مہینے ہی ہوئے تھے کہ غدر شروع ہو گیا، داغ دہلی کا نکھار دیکھ چکے تھے اس کی بربادی بھی دیکھنی پڑی، اس منظر نے جو روحانی اذیت دی وہ ایک شہر آشوب کی صورت میں نظم ہوئی ہے۔

شہر آشوب

فلک زمین و ملائک جناب تھی دِلّی　　بہشت و خُلد سے بھی اِنتخاب تھی دِلّی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دِلّی　　مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دِلّی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا | یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا | یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا

رہی نہ آدھی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی | یہاں کے ذرّے سے تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تھا تیرہ لعل رمانی | یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی

یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشک تجلیٔ طور تھا اس کا

فلک تھا خوبی و حسن و جمال کا دشمن | صباح عشرت و شام وصال کا دشمن
عدو ہے اہلِ کمال اور کمال کا دشمن | غضب ہے اب تو ہوا جان و مال کا دشمن

یہ مفت بر جو تلاشی ہے نقد جاں کے لئے
خضرؑ بھی روئینگے اب عمر جاوداں کے لئے

خدا پرستوں کا شیوہ جفا پرستی ہے | جو مال مست تھے ان کو فاقہ مستی ہے
بجائے ابر کرم مفلسی برستی ہے | تڑنگ جیتے ہیں ایسی تنگ دستی ہے

غضب میں آئی رعیّت بلا میں شہر آیا
یہ پر بھٹے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین | جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین
وہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ مبین | کئے ہیں قتل زن و بچے کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا

غرض وہ کام کیا کام ہی تمام کیا

عجیب شکل گل گلستاں نظر آئی — پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اٹھ کے تا مژہ خونچکاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں میں جو پتیاں گلاب کی تھیں

کھلایا زہر ستمگر نے پان کے بدلے — پلایا خونِ جگر نوجوان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے — ملا نہ گور گڑھا بھی مکان کے بدلے
یہ دعوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
پھر اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

زمین کے حال پہ اب آسمان روتا ہے — ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
گدا و شاہ ضعیف و جواں روتا ہے — غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے
بہو کہئے جوششِ طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

لہو کے چشمے ہیں چشم پر آب کی صورت — شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت — کہاں یہ حشر میں توبہ عذاب کی صورت
زبانِ تیغ سے پرسش ہے داد خواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بے گناہوں کی

یہ وُہ جگہ ہے کہ عبرت پہ عبرت آتی ہے　　یہ وُہ جگہ ہے کہ حسرت پہ حسرت آتی ہے
یہ وُہ جگہ ہے کہ آفت پہ آفت آتی ہے　　یہ وُہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے
یہ وُہ جگہ ہے جہاں بے کسی بھی ڈر جائے
یہ وُہ جگہ ہے اجل خوف کھا کے مر جائے

بہ رنگِ بُوئے گُل اہلِ چمن چمن سے چلے　　غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پُوچھ زندوں کو بیچارے جس چلن سے چلے　　قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے
مقامِ امن جو ڈھونڈھا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خُدا کی پناہ بھی نہ ملی

جو تھی تو افعیٔ کاکل کے زہر کی گرمی　　جو تھی تو شعلہ عذارانِ شہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہ خشم و قہر کی گرمی　　اُٹھائیں ہائے وُہ جلتی دوپہر کی گرمی
تپش سے ریگِ بیاباں بھی آفتاب ہوئی
زمین مگر کرۂ نار کا جواب ہوئی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت　　چڑھے بھی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر اک گنوار کی صورت　　چھُپی نہ اُن سے پر اہلِ دیار کی صورت
کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہلِ قریہ پکارے کہ لو شکار آیا

زباں جو بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی　　ملیں جو خاک بھی مُنہ پر تو مَل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی　　پُکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی
جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پڑے سرکتے ہیں
جو کوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھٹکتے ہیں

پیادہ پا ہوں وہاں شہسوار صد افسوس　　لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس

ذلیل و خوار ہُوں اہلِ وقار صد افسوس   ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس
جُھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے
بنا ہے خالِ سیہ رنگ مہ جمالوں کا   دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو روز آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا   عجیب حال دگرگوں ہے دُنّی والوں کا
کوئی مُراد جو چاہی حصول ہی نہ ہوئی
دُعائے مرگ جو مانگی قبول ہی نہ ہوئی
غضب ہے بخت بد اسے ہمارے ہو جائیں   کرِ لیں، جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانہ چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں   جو مانگیں پانی تو دریا کنارے ہو جائیں
پئیں جو آب بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمت باری تو قہر ہو جائے
جہاز ایسا تباہی میں آ گیا اپنا   ملا نہ تختہ تڑی تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا   بجز خُدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا
کسی سے ڈوبے ہوئے اِسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرتِ الیاس بچ کے چلتے ہیں
شہ محاسبہ پُرسش ہے نکتہ دانوں کی   تلاش بہرِ سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی   کہ حُکمِ عام ہے بھرتی ہے قیدخانوں کی
یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ
کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی   کہاں تک آہ کہوں آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہے آزادی   کہ داغ داغ ہے دِل ہر کوئی ہے فریادی

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر اسے حسب مُراد دیکھیں ہم

اصولاً سوانح عمری میں اِتنی لمبی نظم نقل نہ ہونی چاہیئے مگر ہم نے دو وجوہ سے اسے نقل کیا ہے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ داغ کے دیوان نایاب ہوگئے ہیں خصوصاً گلزار داغ جس میں یہ شہر آشوب درج ہے نایاب ہے دُوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ یہ اندازہ کرلیں کہ داغ کتنے حساس اور دِلّی کی بربادی سے کس قدر متاثر تھے اور لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ باوجود تاثر کے انہوں نے شیوۂ احتیاط کو بھی ترک نہیں کیا اور دُور اندیشی کو ملحوظ رکھا ہے"

غدر میں اس میں شک نہیں کہ دیسی فوجوں اور گنواروں نے بھی دہلی کو لُوٹا اور ظلم کیا مگر وُہ وقتی اور عارضی بات تھی دہلی کی اصلی بربادی تو ہنگامۂ غدر فرو ہونے کے بعد انگریزوں کے مکمّل قبضے سے شروع ہوئی چنانچہ اس کی تفصیل غالب نے اپنے اکثر خطوط میں لکھی ہے، داغ کا یہ شہر آشوب ابنِ بدرون کے مرثیۂ اندلس اور سعدی کے مرثیۂ بغداد کی ٹکر کا ہے، غالب، شیفتہ، آزردہ، نیر درخشاں، اور حالی سبھوں نے یہ بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی بلکہ شیفتہ اور آزردہ تو براہِ راست متاثر ہوئے تھے مگر ان بزرگوں نے دہلی کا مرثیہ کہنے کی ہمّت نہیں کی البتّہ چند شعر آزردہ نے ضرور کہے ہیں، یہ داغ ہی کی ہمّت تھی کہ انہوں نے بائیس بند کا شہر آشوب کہا ہے جس کے چھیاسٹھ شعر ہیں، یہی نہیں بلکہ ایک غزل بھی داغ نے مرثیۂ دہلی کے طور پر کہی ہے مگر یہ غدر کے بہت بعد کی چیز ہے مدّتوں تک لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے جس کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے مگر داغ نے بعض باتیں آنکھوں دیکھی بیان کی ہیں ؎

یُوں مٹا، دہلی سے جیسے کہ نشانِ دہلی — تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
لے گئے لُوٹ کے اب شوکتِ شانِ دہلی — پُوربی پہلے اُڑاتے تھے زبانِ دہلی
دِلّی والوں کے لئے تازہ بنے گی جنّت — لے گئے سر پہ ملک تحفۂ مکانِ دہلی
رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش رفتار — سروِ آزاد تھا ہر ایک جوانِ دہلی
عارضِ صاف تھا ہر ایک مصفّا بازار — چشمِ پُر جلوہ تھی ہر ایک دُکانِ دہلی
گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب — گُل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی
اِس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہیں ہول حساب — بس یہی ہو گا کہ ہم اور بیانِ دہلی
دے دیا فوج کو انعام میں حُکّام نے سب — گنجِ قاروں سے فزوں گنجِ تہانِ دہلی
یا خُدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند — کعبے والے کہیں وُہ آئی اذانِ دہلی
آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے — کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

نیّرِ غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

جس طرح کہ غالب نے بڑی ہی احتیاط سے غدر کی تفصیل اپنے خطوط میں لکھی ہے اور انگریزی فوج اور حُکّام کی ظُلم و زیادتی بہت ہی دبی زبان سے بیان کی ہے اسی طرح داغ نے بھی یہ دونوں نظمیں کہی ہیں، البتہ کہیں کہیں اشارے ضرور کر دئے ہیں مثلاً ؎

پئے محاسبہ پُرسش ہے نکتہ دانوں کی — تلاش بہرِ سیاست ہے خوش بیانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی — کہ حُکم عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جبکہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

اور غزل کا یہ شعر ؎

نے دیا فوج کو حکام نے انعام ہیں سب　　　گنج قاروں سے فزوں گنج نہاں دہلی

یہ احتیاط لازمی اور ضروری تھی چنانچہ غدر کا حال لکھنے والوں نے بڑی احتیاط سے لکھا ہے، خود غالب نے ایسا ہی کیا ہے اور داغ نے بھی غالب کے قدم پر قدم رکھا ہے، داغ کو ایک اور ڈر بھی لگا ہوا تھا وہ یہ کہ داغ ایک ایسے رئیس کے بیٹے تھے جو انگریز کا قاتل اور باغی تھا اس لئے وہ زیادہ احتیاط کرنے پر مجبور تھے،

ظہیر دہلوی وغیرہ نے بھی غدر کے حالات اتنی ہی احتیاط سے لکھے ہیں کیونکہ یہ لوگ بھی مجبور تھے اور اُن دنوں پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی اور بقول داغ ؎

کہ حکم عام تھا بھرتی ہی قید خانوں کی

مگر غدر کے پچھتّر سال کے بعد خواجہ حسن نظامی نے بھی غدر کے حالات و واقعات شائع کئے تو بھی اتنی ہی احتیاط کی جتنی کہ غالب، داغ اور ظہیر نے کی تھی واقعہ یہ ہے کہ اگر آج بھی انگریزوں کی حکومت ہوتی تو شاید ہمیں بھی ایسا ہی کرنا پڑتا،

ان دونوں نظموں سے داغ کی وطن پرستی اور وطن دوستی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف معاملہ بندی اور گل و بلبل ہی کے شاعر نہ تھے بلکہ جذبات نگار بھی تھے،

آزادئ ہند (غدر ۱۸۵۷ء) کی سو سالہ یادگار مناتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان میں جگہ جگہ جلسے ہوئے اور خاص نمبر نکلے تو وشومبر ناتھ پانڈے نے رسالہ نیا ہند الہ آباد کے جولائی ۱۹۵۷ء کے پرچے میں "نظموں اور چھندوں میں سن اٹھارہ سو ستاون" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے

جس میں داغ کا یہی شہر آشوب نقل کیا ہے اور داغ کو "مہاکوی" کے خطاب سے مخاطب کیا ہے ٭

واقعہ یہ ہے کہ غدر پر کسی اور شاعر کی اتنی لمبی نظم نہیں ملتی سوا داغ کے داغ نے یہ شہر آشوب کہہ کر اُردو شعراء کی عزت رکھلی ہے ورنہ مورخ یہ لکھنے پر مجبور ہوتا کہ کسی شاعر نے ہندوستان کے اتنے بڑے حادثے پر کوئی نظم نہیں کہی اور یہ داغ اُردو شاعری کی پیشانی پر قیامت تک رہتا ٭

داغ رامپور میں

داغ کے ایک سوانح نگار نثار علی شہرت نے داغ کی رامپور کی روانگی کو قیاسات کی بنا پر آنولے کے پھیر میں پھنسا دیا ہے، وہ داغ کے ان تعلقات سے بے خبر تھے جو رامپور سے تھے، دہلی سے نکل کر داغ اگر کہیں جا سکتے تھے تو وہ رامپور اور فقط رامپور ہی تھا، اس لئے رامپور کا رُخ غدر کے بعد داغ نے کیا اور دہلی سے رامپور پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ گئے چنانچہ ۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو جب ظہیر دہلوی رامپور پہنچے تو داغ نے ان سے مُلاقات کی اور انہیں نواب رام پور کے داماد صاحبزادہ رضا محمد خاں کی سرکار میں نوکر رکھا دیا[1]، اس طرح داغ رامپور میں غریب الوطن مُسافر نہ تھے بلکہ اتنے صاحب اقتدار تھے کہ مُسافروں کے لئے روزگار فراہم کر سکتے تھے ٭

---

[1] نگار، داغ نمبر صـ ۱۷۱ ٭

رامپور کا پہلا مشاعرہ

غدر کے بعد مستقل طور پر رامپور منتقل ہو کر سب سے پہلے جس مشاعرے میں داغ نے شرکت کی وہ صاحبزادہ رضا محمد خاں کا مشاعرہ تھا جس میں داغ نے یہ غزل پڑھی ؎

بھولے بھٹکے جو ترے گھر میں چلے آتے ہیں — اپنی تقدیر کے چکر میں چلے آتے ہیں
داغ جا کر نہ پھرے سوئے عدم اپنے رفیق — ہم یہ سمجھے تھے کہ دم بھر میں چلے آتے ہیں[1]

داغ کے رامپور پہنچنے کے بعد نواب صاحب نے انہیں کوئی خدمت نہیں دی مگر اپنے دربار میں جگہ دی اور ان سے کام لیتے رہے اس لئے وہ کبھی رامپور اور کبھی دہلی میں رہے چنانچہ مجتبیٰ عرشی رامپوری نے بڑی خوبی سے اس کی تفصیل اپنے مقالے "کچھ داغ سے متعلق" میں غالب اور داغ کے خطوط اور بعض دوسرے تاریخی حوالوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے[2]،

تقرر

داغ نے اسی طرح آٹھ نو سال رامپور میں نہایت ہی عمدگی سے گزارے اور ۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو ان کا مستقلانہ تقرر ہوا، ابتداً اصطبل اور دوسرے کارخانہ جات ان کے تفویض ہوئے چنانچہ اصطبل کا جائزہ داغ نے لیا تو دوسرے ہی روز اصطبل کے دروازے پر شعر لکھا ہوا نظر آیا ؎

---

[1] جلوۂ داغ ص ۲۳ ؛ [2] نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۵۳ء ص ۳۶ - ۳۸ ،

شہرِ دہلی سے آیا مُشکی خر - آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

جب داغ کی نظر اس شعر پر پڑی تو انھوں نے بے ساختہ داد دی اور اعلان کر دیا کہ مَیں اِس شاعر سے ملاقات کا آرزومند ہوں وُہ بے خوف مجھ سے ملے مگر شاعر نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا۔

مجتبیٰ جناب اثر رامپوری نے لکھا ہے کہ "میر احمد علی رسا رامپوری شاگرد علی بخش بیمار نے یہ شعر لکھا تھا اور کسی شاگرد کے ذریعہ اصطبل کے دروازے پر چسپاں کرا دیا تھا"[1]

سرکاری مشاعروں کا اِنتظام

داغ کے تقرر کے بعد سے سرکاری مشاعروں کا انتظام داغ ہی کے تفویض رہتا تھا، اِن مشاعروں کی تفصیلات داغ بہت سُنایا کرتے تھے جن سے سُن کر شاگردوں نے اکثر واقعات نقل کئے ہیں مگر مَیں نے یہ تفصیلات مولوی عبدالجبار خاں آصفی رامپوری سے سُنی ہیں جو رامپور کے ایک قدیم اور خاندانی بزرگ تھے اور حیدرآباد میں بس گئے تھے وُہ رامپور میں داغ کو دیکھ اور سُن چکے تھے چونکہ محلّہ مُغل پورہ ہی میں ان کا قیام تھا اور میرے خاندان کے بیشتر افراد سے ان کے دوستانہ مراسم تھے اِس لئے مَیں بھی نیازمندانہ طریقے سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

آصفی داغ کے قائل نہ تھے اپنے عِلم و فضل کے زعم میں داغ کو جاہل

[1] نگار، داغ نمبر ص۲۶

تصوّر فرماتے تھے مگر داغ کی شاعری کے معترف اور ان کی خدا داد صلاحیت اور مقبولیت کے قائل تھے، انھوں نے ایک سرکاری مشاعرے کا قصّہ سُنایا تھا کہ جس ہال میں مشاعرہ ہوتا تھا اس کے پیچھے ایک اور ہال تھا جس کے دروازے پر چلمن پڑی رہتی تھی اور اندر نواب صاحب بیٹھے مشاعرہ سُنا کرتے تھے ایک دفعہ ایسا ہُوا کہ داغ نے غزل شروع کی تو ایک شعر پر نواب صاحب نے پھڑک کر چلمن اُٹھادی اور داغ کو داد دی، آصفی نے وُہ شعر بھی سُنایا تھا مگر میرے حافظہ سے اُتر گیا ؎

اِن مشاعروں کا انتظام داغ ہی کو تفویض ہوتا تھا اور وہ انتظام کرتے ہوئے چلتے پھرتے غزل کہہ لیتے اور مشاعرے میں سُنا کر داد لیا کرتے تھے ان مشاعروں کی تفصیل آگے آئے گی ؎

کلکتہ کا سفر

دسمبر ۱۸۶۶ء میں نواب رامپور نے کلکتہ کا سفر کیا تو داغ بھی ہمرکاب تھے، نواب صاحب نے کئی کوٹھیاں کرایہ پر لیں، ایک کوٹھی اپنے لئے مخصوص رکھی اور اسی میں داغ کو اپنے ساتھ رکھا فرماتے تھے کہ "میرا محافظ سوا تمہارے کون ہے"[1]

---

[1] جلوۂ داغ ص۲۲

حج بیت اللہ

۱۸۷۷ء میں نواب صاحب رامپور نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تو داغ کو بھی ہمراہ رہنے کی سعادت نصیب ہوئی، اور داغ نے "عزم سفر" کے ساتھ ہی خوشی منانی شروع کر دی ؎

یہ سُنا جو حضرت داغ نے کہ حضور کعبہ کو جائینگے | یہی ذکر ہے یہی فکر ہے شب و روز عزم سفر سے خوش

رامپور سے روانہ ہونے کے بعد جو غزل بھی کہی اُس میں حج اور بیت اللہ کا ذکر ضرور کیا ہے چنانچہ راستہ ہی کی کہی ہوئی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

دیر سے کعبے کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں | دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

داغ ہمیشہ اپنے شاگردوں کے سامنے یہ کہا تھا کہ یہ غزل میں نے کعبۃ اللہ میں بیٹھ کر کہی ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تُو نے | دِل سے سب کچھ بُھلا دیا تُو نے
ہم نکمّے ہوئے زمانے کے | کام ایسا سکھا دیا تُو نے
کچھ تعلق رہا نہ دُنیا سے | شغل ایسا بتا دیا تُو نے
کِس خوشی کی خبر سُنا کے مجھے | غم کا پُتلا بنا دیا تُو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے | دِل بے مُدّعا دیا تُو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا مَیں نے | کیا کہوں مَیں کہ کیا دیا تُو نے
بے طلب جو مِلا مِلا مجھ کو | بے غرض جو دیا دیا تُو نے
عُمر جاوید خضرؑ کو بخشی | آبِ حیواں پلا دیا تُو نے
نارِ نمرود کو کیا گلزار | دوست کو یُوں بچا دیا تُو نے
دستِ موسیٰؑ میں فیض بخشش سے | نور و لوح و عصا دیا تُو نے

صبح موجِ نسیم گُلشن کو | نفسِ جاں فزا دیا تُو نے
شبِ تیرہ میں شمع روشن کو | نُورِ خورشید کا دیا تُو نے
نغمہ بُلبل کو رنگ و بو گُل کو | دِلکش و خوشنما دیا تُو نے
کہیں مُشتاق سے حجاب ہُوا | کہیں پردہ اُٹھا دیا تُو نے
تھا مرا مُنّہ نہ قابلِ لبّیک | کعبہ مجھُ کو دِکھا دیا تُو نے
جس قدر مَیں نے تجھ سے خواہش کی | اس سے مجھ کو سِوا دیا تُو نے
رہبرِ خضرؑ و ہادیٔ الیاس | مجھ کو وُہ رہنما دیا تُو نے
مٹ گئے دِل سے نقشِ باطل کے | نقشہ ایسا جما دیا تُو نے
ہے یہی راہ منزلِ مقصود | خوب رستے لگا دیا تُو نے
مجھ گُنہگار کو جو بخش دیا | تو جہنّم کو کیا دیا تُو نے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خُدا دیا تُو نے

حج کے بعد زیارتِ حرم نبویؐ کا شوق بیتاب کرتا رہا تو کہا ؎
یہ آرزو ہے آنکھیں سُرمہ لگائیں گے | اے داغ خاکِ پائے رسولؐ خدا سے ہم

جب زیارت روضۂ منوّرہ نصیب ہوئی تو کہا ؎
اے داغ شُکر کر کہ شرف یاب تُو ہُوا | دِل کی مُراد حج و زیارت میں مِل گئی

اِسی سفر کے دَوران میں کہا تھا ؎
گئے ہیں داغ تلاشِ صنم میں کعبے کو | خُدا نے مُفت کیا ہے ثواب میں داخل

جب بمبئی پر استقبال دیکھا تو کہا ؎
ساتھ نواب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغ | ہِند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

رامپور پہنچنے کے بعد یہ غزل کہی ؎

مدینہ چھوڑ کے پھر رامپور رہم آئے
یہ کس بلا میں دلِ ناصبور رہم آئے
ہزار شکر ہمیں داغ حج نصیب ہوا
قصور وار گئے بے قصور رہم آئے

داغ کی مقبولیت

رامپور میں بیسیوں شاعر موجود تھے خصوصاً اسیر، امیر، منیر، جلال چاروں لکھنؤ سکول کے اُستاد تھے جو داغ کے حریف اور مدمقابل تھے مگر داغ سب پر چھائے ہوئے رہے، لُطفِ خاص یہ ہے کہ دربار رامپور میں کوئی نمائندہ دہلی کا نہ تھا داغ ہی یکہ و تنہا سب سے مقابلہ کرتے رہتے تھے اور پلّہ ہمیشہ انہی کا بھاری رہتا تھا، اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کسی کا چراغ داغ کے آگے نہ جل سکتا تھا۔

جناب اثر رامپوری نے لکھا ہے،

"مولانا عبدالرزاق خاں صاحب طالب، رامپوری مرحوم پروفیسر مدرسۂ عالیہ رامپور میرے اُستاد تھے انہوں نے ایک دن ایک مشاعرے کا ذکر فرمایا کہ میں شیخ احمد علی صاحب رامپوری فارسی کے مسلم الثبوت اُستاد سے فارسی پڑھا کرتا تھا اسی طالب علمی کے زمانے میں ایک طرحی مشاعرہ کی شرکت کا اتفاق ہوا قامت کے قیامت کے قافیہ و ردیف تھا میری غزل اُس وقت ہوئی جب کہ مشاعرہ سرد پڑ چکا تھا اور مرزا داغ ۲ بجے شب کے تکان کی وجہ سے اندرونی ہال میں

گاؤتکیہ کا سہارا لے کر نیم دراز ہو چکے تھے جب میں نے یہ شعر پڑھا۔

ہاتھ میں جام لئے میکش منتظر ہیں خدا کی رحمت کے

شعر سُن کر داغ باہر آ گئے اور فرمایا مولانا تم نے مشاعرہ ختم کر دیا، پھر کیا تھا واہ وا، آفرین کے ہر طرف نعرے لگنے لگے اور مشاعرہ جاگ اُٹھا۔"

"احمد علی خاں عرف امن خاں بنجھو مرحوم رامپوری نے داغ کے کلام کی داد کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ جب داغ مشاعرے میں اپنی غزل سناتے تو رامپور کے پٹھان انہیں سینکڑوں گالیاں دیتے تھے دریافت کیا گیا گالیوں کا کیا موقع تھا؟ جواب دیا کہ کلام کی تاثیر اور حسن قبول کا یہ عالم تھا کہ پٹھان بے ساختہ چیخیں مار مار کر کہتے تھے، اُف ظالم مار ڈالا، افوہ گلا حلال کر دیا اُف کم بخت نے دل کا کام تمام کر دیا اُف اُف غضب ڈہا دیا۔"

"پڑھنے کا عجب انداز تھا جس طرف ہاتھ اُٹھا دیتے پورے مشاعرے کی نظریں اسی طرف اُٹھ جاتیں ایک بار عربی مدرسے کے طلبہ کا ایک گروہ بھی داغ کے کلام کی شہرت سُن کر ایک مشاعرے میں شریک ہوا اور سب کے سب ایک ہی گوشے میں جا کر بیٹھ گئے، داغ دُور ہی سے تاڑ گئے، جب انہوں نے غزل پڑھی تو لمبی لمبی ڈاڑھیوں کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اس شعر کے مصرعِ ثانی کی بار بار تکرار کی ؂

کسی کی نرگس مخمور کچھ کہے اشاروں میں مزہ ہے رات دن چلتی رہے پرہیزگاروں میں

پھر کیا تھا مشاعرہ دیوار قہقہہ بن گیا اور پورے مشاعرے کی نظریں

طلبا کی طرف پھر گئیں آخر بیچارے خفت کے ساتھ اُٹھ کر اپنے حال پر خود ہنستے ہوئے گھروں کو چلے گئے"۔

"یہ مشہور ہے کہ داغ کی غزل کے بعد مشاعرہ اُکھڑ جاتا تھا اور مشاعرے سے باہر سوائے داغ کے اشعار کے کسی کا شعر وِردِ زبان نہ ہوتا تھا، اسیر کا قول ہے کہ وہ کلام پسندیدہ ہے جو مشاعرے سے باہر جائے فرماتے تھے کہ میں نے باہر جانے والوں میں داغ کا شعر اکثر باہر نکلتے دیکھا ہے"۔

جناب عرشی رامپوری نے اپنے مضمون میں حیات تسلیم مولفہ عرش گیاوی کے حوالہ سے لکھا ہے،

"ایک صاحب فرماتے تھے کہ نواب کلب علی خاں کا عہد تھا، بحر، قلق، امیر، آمیر، منیر وغیرہ موجود تھے جب داغ کے پڑھنے کی نوبت آئی تو مشاعرہ گونج اُٹھا اس مشاعرے میں منیر اپنی بے مثل غزل پڑھ چکے تھے مگر وہ عام فہم شعر یہاں کہاں تھے داد دلخواہ نہ ملی، داغ کی واہ واہ منیر مرحوم پر گراں گزری مشاعرے سے باہر آکر داغ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیوں میاں داغ! کیا تمہاری غزل مجھ سے زیادہ پُر زور تھی؟ داغ نے کہا ہرگز نہیں میری کیا طاقت ہے کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں مگر حضرت! قبول خاطر و لطف سُخن خدا داد است"!

"درمیان میں چند صاحب یہ گفتگو کرتے ہوئے نظر آئے کہ بھائی غزلیں تو سب نے پڑھیں مگر جب بلبل داغ بیاں نے اپنا مُنہ کھولا تو پھر سارے عندلیب اپنا نغمہ بھول گئے داغ کو وہ داد ملی کہ

اللہ اللہ خود نواب صاحب بہادر لوٹ لوٹ گئے، داغ نے منشی اسمٰعیل منیر یادگار ناسخ سے کہا حضرت اِس مقبولیت کو کیا کہئے منیر مرحوم چپ ہو گئے؎۱

نواب صاحب رامپور نے ہندوستان کے چوٹی کے شعراء کو جمع کیا تھا، منیر شکوہ آبادی (۱۲۲۳ھ – ۱۲۹۷ھ) تسلیم لکھنوی (۱۲۳۵ھ – ۱۳۲۹ھ) امیر مینائی (۱۲۴۴ھ – ۱۳۱۸ھ) جلال لکھنوی (۱۲۵۰ھ – ۱۳۲۴ھ) لکھنؤ کے مایۂ ناز اساتذہ تھے ان لوگوں نے نواب صاحب پر اتنا اثر قائم کر لیا تھا کہ وہ لکھنؤ ہی کے متبع ہو گئے تھے اور یہ لوگ اپنے آگے کسی کی چلنے نہ دیتے تھے یوں کہنے کو داغ کے علاوہ راسخ دہلوی اور ظہیر دہلوی مرزا حیا دہلوی بھی رامپور میں تھے مگر یہ لوگ کسی شمار و قطار میں نہ تھے فقط ایک داغ ہی تھے جو ان تمام کا مقابلہ کرتے رہتے اور سب پر غالب آتے تھے اسی مسابقت اور مقابلے نے داغ کی طبیعت کو نکھار دیا اور وہ اکھاڑے کے پہلوان بن گئے ؎

تلف شدہ دیوان

داغ نے دس بارہ سال قلعہ معلیٰ میں بیٹھ کر جو شاعری کی تھی وہ ذخیرہ بڑا ہی نفیس اور اہم تھا جس کے متعلق انہوں نے جلوۂ داغ میں لکھوایا ہے،

"ابتدائے مشق سے حضرت ذوق مرحوم کی حیات تک آپ کا کلام اتنا

۱؎ داغ نمبر نگار لکھنؤ ص ۴۶-۴۷،

جمع ہوگیا تھا جو ساٹھ جزو میں لکھا گیا تھا اور جس میں غزل، قصیدہ، قطعہ، واسوخت، رُباعی، مخمس، مسدس، خطوط، نظم، عرائض وغیرہ ہر صنف کا کلام موجود تھا وہ دیوان کا دیوان غدر میں ایسا تباہ و برباد ہوا کہ پھر اس کا پتہ نہ چلا ایک ایک دو دو شعر جو یاد آتے گئے وہ لکھ لئے اور پھر ان میں کچھ اور شعر بڑھا کر اس طرح پر چند پُرانی غزلیں پُوری کر لی گئیں اس مبسوط دیوان کے ضائع ہو جانے کے بعد رامپور کے زمانۂ قیام میں گلزار، داغ، آفتاب، داغ اور مثنوی فریاد داغ کی اشاعت ہوئی ہے[1]

اُوپر کا اقتباس داغ کی اپنی لکھوائی ہوئی سوانح حیات جلوۂ داغ سے لیا گیا ہے جسے داغ نے کہہ کہہ کر لکھوایا اور کئی بار اسے پڑھوا کر سُنا اور شائع کرایا تھا اس کی ترتیب احسن مارہروی نے دی تھی جو ۱۹۰۲ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی ؎

یہ واقعہ بالکل صحیح ہے داغ نے غدر میں لُٹنے اور دیوان کے برباد ہونے کی تفصیلات حیدر آباد کے بیسیوں شاگردوں کو سُنائی تھیں جن سے میں نے بھی سُنی ہیں مگر ۱۹۵۶ء میں احسن مارہروی کے لائق فرزند رفیق مارہروی نے احسن اور افتخار عالم کا مرتب کیا ہوا روزنامچہ فراہم کر کے "بزم داغ" کے نام سے شائع کیا اس سے بڑی بڑی باتیں معلوم ہوئیں چنانچہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۱ء کے روزنامچہ میں لکھا ہے ؎

"مرزا صاحب نے برسر تذکرہ فرمایا کہ میں نے خاقانی ہند جناب ذوق سے کامل ۱۴ سال اصلاح لی تھی میرا پہلا دیوان جب مکمل

---

[1] جلوۂ داغ ص ۱۱۱ ؎

ہو گیا تو میں نے اُستاد کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا کہ گو آپ
اِس دیوان کی تمام غزلیں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور ان غزلوں کی
اصلاح ہو چکی ہے لیکن اگر مضائقہ نہ ہو تو ایک بار اس مجلہ کو اور
مُلاحظہ فرما لیا جائے، اُستاد نے وہ مجلہ مجھ سے لے لیا اور ایک ہفتہ
کے بعد یہ کہتے ہوئے واپس کیا کہ میں نے کُل غزلوں پر نظر ثانی
کر لی ہے اور جہاں جہاں مزید اصلاح کی ضرورت محسوس کی ہے
وہ بھی کر دی ہے تم اتنا کرو کہ اس مجلہ کے حاشیوں پر وہ تمام
اصلاحیں بھی درج کر لو جو اس سے پہلے میں دے چکا ہوں بارہ
برس کے بعد اس اصلاح کو دیکھنا اس وقت اس کا صحیح لُطف
آئے گا، چنانچہ وہ مجلہ نیز دُوسرے تمام اصلاحی مسودات مرزا
صاحب کے پاس محفوظ ہیں اور وقتاً فوقتاً ایک عجیب شوق
اور ولولے کے ساتھ ان اصلاحوں کو ملاحظہ کرتے ہیں"[1]

داغ کی والدہ ۱۸۴۴ء میں قلعہ معلیٰ میں پہنچیں اگر یہ مان بھی لیا جائے
کہ ان کے ساتھ ہی ساتھ داغ بھی قلعہ میں پہنچ گئے اور پہنچتے ہی ذوق کے شاگرد
ہو گئے اور اصلاح لینی شروع کی تو بھی ذوق نے ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا ہے
یہ مدت شاگردی و اصلاح بمشکل دس سال ہوتی ہے ۱۴ سال کسی طرح بھی
نہیں ہو سکتی معلوم نہیں یہ حصہ واقعی احسن یا افتخار عالم کا گھڑا ہوا ہے یا رفیق
مارہروی نے جدت طرازی کی ہے بہرحال یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ سراسر غلط
اور صریح جھوٹ ہے، اور یہ دروغ بانی مارہرہ شریف ہی سے متعلق ہے۔

---

[1] بزم داغ ص ۱۲۹ +

گلزار داغ

۱۸۷۸ء میں داغ نے اپنا پہلا دیوان گلزار داغ چھپوایا جو مطبع انوار محمدی لکھنؤ میں منشی تیغ بہادر کے اہتمام سے چھپا ہے، اس میں ۳۹۱ غزلیں ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۴۹۶۸ ہے، رباعیات ۶، مخمسات (۵، بند) ایک مسدس (۲۳ بند) ۲ قصائد (۱۲۰ شعر) ۲ قطعات تاریخی (۲۰ شعر) جملہ ۵۲۹۳ شعر ہیں جو ۱۹ اسطری مسطر کے ۳۱۳ صفحات پر طبع ہوئے ہیں، آخر میں بارہ صفحات پر تاریخی قطعات اور تقاریظ ہیں۔

جناب عرشی رامپوری کا بیان ہے کہ گلزار داغ رامپور کے تاج المطابع میں پہلی بار چھپا ہے[۱]، اس دیوان میں سب سے عجیب و غریب چیز نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کا قطعہ ہے جس سے نہ صرف بوئے اتحاد بلکہ بوئے تفاخر بھی آتی ہے اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

نازم آں نخلبند معنی را — کہ بیاراست از سخن صد باغ
گل رنگین باغ دل افروز — در و خوشبوئی عطر بیز دماغ
اوج نازک خیالی او را — باید آں سوئے عرش جست سراغ
معنی نغز از دلش ریزاں — چوں مئی ناب از کنارا باغ
کردہ مشکیں غزال مضموں جیب — صفحۂ خاطرش ختن را زاغ
جمع کردہ کلام روشن خویش — کہ شبستانِ فکر راست چراغ
ہر کہ از طبع تازہ اش دلخواہ — للہ الحمد دست داد فراغ

۱۔ اردو ادب (سہ ماہی) علیگڑھ ستمبر ۱۹۵۶ء

سال ختمش بخواں کہ ایں دیواں — زد بدلہا جریدہ سکۂ داغ
ساخت ایں قطعہ نیراز دہلی — نزدِ نواب میرزا ابلاغ

دُنیا جانتی ہے کہ ضیاء الدین احمد خاں شمس الدین خاں کے علاقی بھائی تھے جنہیں شمس الدین خاں نے لوہارو سے محروم کر دینا چاہا تھا اور انہوں نے مرافعہ کیا اور انہیں کامیابی ہوئی تو اسی کوفت میں شمس الدین خاں نے ان کے حامی اور فریزر کو قتل کرا دیا، فریزر کے قتل کا پتہ ہی نہ چلتا اگر فتح اللہ بیگ اور مرزا غالب مُخبری نہ کرتے یہ دونوں مُخبر لوہارو ہی کے تھے فتح اللہ بیگ تو اسی خاندان سے تھے اور مرزا غالب بھی اسی خاندان کے داماد تھے اس طرح ان لوگوں نے شمس الدین خاں کو پھانسی کے تختے پر پُہنچا کر انتقام لیا تھا اور پھر انہیں لوگوں نے چھوٹی بیگم کو ان کی بیوی اور داغ کو ان کا بیٹا ماننے سے بھی انکار کر دیا اس طرح یہ ماں بیٹے اپنی جائداد سے محروم ہو گئے ،

ایسے دُشمنوں کا اتنے گہرے دوست بن جانا تعجب انگیز ہے مگر یہاں بھی داغ کا حُسن اخلاق کار فرما نظر آتا ہے ؞

چھوٹی بیگم کی وفات

ریاست رامپور کے ریکارڈ سے جناب عرشی نے داغ کی ایک عرضی برآمد کی ہے جس میں انہوں نے اپنی والدہ کے انتقال کی خبر دی ہے اور نواب صاحب نے مصارف تجہیز و تکفین کے لئے رقم منظور کی ہے یہ عرضی ۱۷ شعبان ۱۲۹۶ھ کی مشرحہ ہے جو مطابق ہے ۷ اگست ۱۸۷۹ء کے

اِس سے پتہ چلتا ہے کہ اواخر جولائی یا اوائل اگست ۱۸۷۹ء میں چھوٹی بیگم نے رامپور میں داؔغ ہی کے گھر میں انتقال کیا ہے۔

نوابان رامپور کا سلوک

داؔغ کے تعلقات نوابان رامپور سے بچپن ہی سے تھے اور ان سے برادرانہ سلوک ہوتا تھا چنانچہ داؔغ نے جو کیفیت احسن مارہروی سے بیان کی تھی اسے انہوں نے جلوۂ داغ میں اس طرح لکھا ہے ،

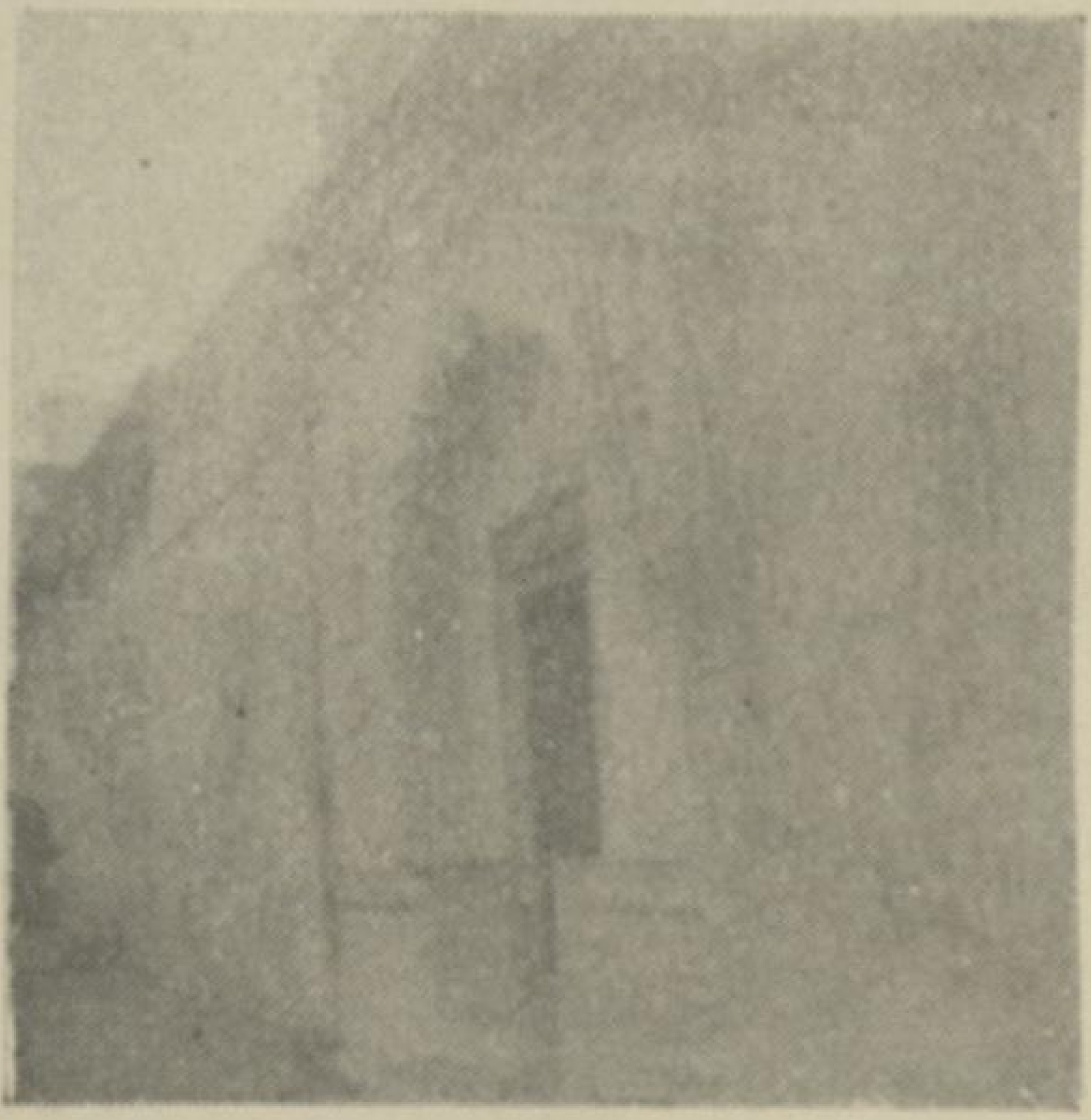
"نواب صاحب رامپور اپنی حیات تک ہمیشہ بطور مہمان نوازی سلوک کرتے رہے نواب فردوس مکان کے بعد خُلد آشیاں نواب کلب علی خاں نے اپنی قدر دانی اور لُطف خسروانی سے مرزا صاحب کو ریاست میں باقاعدہ مُلازم فرما کر اپنی مصاحبت میں رکھا اور بطور معتمد خاص کارخانہ جات، اصطبل و گاڑی خانہ و کنول خانہ و شُتر خانہ سپرد کیا، مرزا صاحب نے ۲۴ برس تک مصاحبت کے ساتھ ساتھ ان سب کاموں کو نہایت خوبی اور عمدگی و دیانت سے سرانجام دیا، اور بڑے نیک نام اور بے لوث رہے، نواب خلد آشیاں کو آپ پر بڑا بھروسہ و اطمینان تھا اور بہت زیادہ آپ کی عزت اور قدر فرماتے تھے، ہمیشہ کلام کرتے وقت بھائی نواب مرزا کہہ کر خطاب کرتے

تھے، ہم عصر رؤسا و راجگان سے آپ کی تعریف کیا کرتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ یہ میرے بھائی ہیں، جب کبھی کسی ریاست سے کوئی نواب یا راجہ یا ولایت سے کوئی لارڈ یا لفٹنٹ گورنر وغیرہ آتے تو اکثر ان کی فرودگاہ اور ان کے استقبال کے انتظام و اہتمام کے لئے نواب صاحب مرزا صاحب کو ہی منتخب کر کے بھیجا کرتے، نواب صاحب اپنی عادت کے موافق مراحم خسروانہ سے ہمیشہ علاوہ ماہوار جیب خاص سے بہت کچھ سلوک کیا کرتے تھے، جس قدر نواب خُلد آشیاں کو مرزا صاحب سے محبّت تھی اسی قدر آپ بھی اُن پہ فریفتہ تھے، واقعات اور حالات معلوم کرنے کے بعد یہ کہنا ذرا مبالغہ نہیں کہ دونوں طرف گویا تعشق تھا، ہز اکسی لنسی لارڈ لارنس صاحب بہادر وائسرائے ہند کے زمانے میں نواب خُلد آشیاں کلکتے تشریف لے گئے اور کسی کونسل کے ممبر مقرّر ہوئے تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ کلکتہ میں بھاگا رتی کا پُل بنا تھا اور نہ واٹر ورکس کا وجود تھا نواب صاحب بہادر نے اپنے قیام کے لئے کوٹھیاں کرایہ پر لی تھیں حسب قاعدہ ایک کوٹھی اپنے لئے تجویز کی اور دوسری کوٹھی میں دیگر معزّز رؤسا وغیرہ کو رہنے کی اجازت دی مگر مرزا صاحب کو خاص اپنے پاس رکھا اور فرمایا کہ میرا محافظ سوا تمہارے کون ہے،،[1]

یہ باتیں جو داغ نے جلوۂ داغ میں لکھوائی ہیں تقریباً بالکل

---

[1] جلوۂ داغ ص ۱۹-۲۲



داغ کی قیام گاہ رام پور



بازار شیدی عنبر حیدر آباد دکن میں داغ کی اولیں قیام گاہ



داغ کی قیام گاہ، افضل گنج، حیدر آباد دکن



داغ کی کوٹھی ترپ بازار۔ حیدر آباد دکن
جو اب تک صحیح و سلامت ہے

صحیح ہیں ان کی تصدیق جناب عرشی رامپوری اور جناب اثر رامپوری اور کلب علی خاں فائق صاحب کے مضامین سے بھی ہوتی ہے جو نگار میں طبع ہوئے ہیں[1]

داغ نے ایک خط میں جو انہوں نے ۹ اگست ۱۸۸۷ء کو ملکہ جان (کلکتہ) کو لکھا تھا اِس تفصیل کو نہایت مختصر طور پر لکھا ہے،

" رامپور میں نوکر ہوں رطب و یابس اللہ تعالیٰ گزار دیتا ہے، چالیس پچاس آدمی کا رزق خداوند کریم دیتا ہے رئیس میرا قدرداں ہے اور ہم عمر و ہم وطن"[2]

رام پور کا مکان

" داغ نے کوچہ پھنسری داس میں جو جامع مسجد سے مغرب کی طرف ہے ایک دو منزلہ مکان کرایہ پر لیا تھا، اور جب تک رامپور میں رہے اِسی مکان میں قیام رہا، یہ مکان اصطبل سرکاری سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر اور قلعہ کے سامنے ہی تھا"

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکان کسی سردار مرزا کا تھا، داغ کے رامپور سے واپس ہونے کے بعد سردار مرزا نے انہیں نوٹس دیا تھا چنانچہ داغ نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ جون (بلا سنہ) میں کنور اعتماد علی خاں کو لکھا ہے،

" سردار مرزا نے بابت مکان رامپور کے مجھ کو نوٹس دیا ہے مفت کا روپیہ ان کے پاس ہے جھگڑا کرتے ہیں"[3]

---

[1] اردو ادب (سہ ماہی) علیگڈھ ۱۹۵۶ء ص ۴۳ [2] نگار داغ نمبر ص ۴۶

[3] انشائے داغ ص ۵۷

بے نظیر کا میلا

خلد آشیاں نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور نہایت ہی جدّت پسند اور صاحب دماغ رئیس تھے رامپور کو انھوں نے ہر طریقے سے سنوارا تھا نہ صرف عُلماء فضلاء شعراء اور اہلِ کمال کو جمع کیا تھا بلکہ شہر کی آرایش و زیبائش صنعت و حرفت اور تجارت بڑھانے کی بھی کوشش کی، اپنی مسند نشینی ۱۸۶۵ء ۱۲۸۲ھ کے بعد ہی مارچ ۱۸۶۶ء سے بے نظیر کا میلا شروع کرا دیا، یہ میلا مارچ کے آخری ہفتے میں شروع ہو کر مہینے کے ختم پر ختم ہو جاتا اور کبھی کبھی اپریل کے پہلے ہفتے تک بھی جاری رہتا تھا۔

جس باغ میں یہ میلا ہوتا تھا اس کا نام "باغ بے نظیر" تھا جس کی وجہ سے میلے کا نام ہی بے نظیر ہو گیا شہر رامپور سے تین میل کے فاصلے پر ایک کوٹھی نواب احمد علی خاں نے ۱۲۳۲ھ میں بنوائی تھی جب یہ کوٹھی بن گئی تو اس کے اطراف میں ایک پُر فضا باغ لگوایا گیا اور بے نظیر نام رکھا گیا، میلا جب شروع ہوا تو رامپور تک ریل نہ تھی بلکہ مُراد آباد اسٹیشن سے اُتر کر رامپور جانا پڑتا تھا مگر اس دقت کے باوجود میلے میں کلکتہ، دہلی، لکھنؤ اور دوسرے شہروں سے بیوپاری مال اسباب لاتے تھے اور خود نواب صاحب ذاتی طور پر دعوت دے کر ہندوستان بھر کے مشاہیر کو بُلوایا کرتے تھے اِس طرح میلا بڑا ہی بارونق ہوتا تھا۔

نواب نے اپنی ساری جدّت پسندی، ذہانت اور حاضر دماغی میلے پر صرف کر دی تھی تفریح اور دلچسپی کے سارے سامان فراہم کئے جاتے تھے دکانیں لگائی جاتیں، اکھاڑے بنوائے جاتے، کُشتی، بنوٹ، سیف، بانک، پٹے،

کے مظاہرے ہوتے چار بیت کہنے والوں کی ٹولیاں ہوتیں، داستان گو بیٹھے داستانیں سُناتے، مہمانوں کے لئے نفیس خیمے اور ڈیرے دئے جاتے فوج اور پولس کا معقول انتظام ہوتا اور میلا دیکھنے والوں کو ہر قسم کی سہولتیں مہیا کی جاتیں۔

باغ کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف دو مہتابیاں تھیں ایک نماز کے لئے مخصوص تھی اور دوسری رقص و سرود کے لئے مختص تھی، اوقات نماز میں سرود و رقص موقوف رہتا تھا، کلکتہ، دہلی، بنارس، لکھنؤ وغیرہ سے مشہور طوائفیں اور فن کار آتے اور اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے،

باغ کے درمیانی حصے میں ایک عمارت "قدم شریف" کے لئے بنائی گئی تھی جس کی زیارت بڑی عقیدت اور دھوم دھام سے کی جاتی تھی، کوٹھی بدرِ منیر سے پنکھے کا جلوس بڑے تزک و احتشام سے لایا جاتا تھا۔ اس میلے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا جوا ہوتا تھا اور نہ شراب کی دکان ہی تھی، میلے کی آخری رات چراغاں ہوتے، نہر میں بجرے پڑے ہوتے جن میں نواب صاحب بھی بیٹھتے اور رقص و سرود بھی ہوتا تھا۔

پنکھے کا جلوس آخری دن بڑی دھوم سے نکلتا فوجی ٹھاٹھ سے شتر سوار، گھوڑے سوار، پیدل فوج، نوبت نقارہ اور دوسرے فوجی لوازمات کے ساتھ ہاتھی پر چڑھا کر پنکھا نعت و صلوٰۃ کی گونج میں نکالا جاتا، ریاست کی ساری فوج اپنے اپنے اعزاز اور لوازمے کے ساتھ گزرتی اراکین و اعیان سلطنت جلوس کے ساتھ پیدل چلتے اور تماشائی دونوں طرف صف باندھے مودّب کھڑے ہوتے، میلے کی آخری رات شب جشن ہوتی باغ کی روش روش پر روشنی کی ٹٹیاں لگائی جاتیں ان پر رنگ برنگی کاغذ اور ابرک لگایا جاتا اور پھر قمقمے اور کنول روشن کئے جاتے جن کا عکس پانی پر پڑتا اور نہر میں

آگ لگی ہوئی نظر آتی، شاہی بجرے کی شہ نشین پر مخملی کارچوبی شامیانہ تانا جاتا اس کے نیچے کارچوبی مسند بچھی ہوتی اور رنگا رنگی قمقموں سے بجرا بقعۂ نور بنا ہوا نظر آتا، نواب صاحب رات کو بجرے پر سوار ہوتے اور ان کے بیٹھتے ہی رقص و غنا شروع ہو جاتا اور بارہ بجے رات تک بجرا اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر گھومتا رہتا اور دونوں کناروں پر بھی رقص و سرود ہوتا رہتا، یہ جنّت نگاہ اور فردوسِ گوش منظر بارہ بجے رات کو ختم ہوتا تو آتشبازی جلائی جاتی، ٹٹّیاں، چکر، قلعے، کوٹھیاں، نہر کے کنارے دونوں طرف لگائے جاتے اور یہ روشن کئے جاتے تو آب و آتش بہم دست و گریباں نظر آتے۔

بے نظیر کے میلے کی تفصیل ریختی کے مشہور شاعر جان صاحب نے مسدّس کی صورت میں قلمبند کی ہے جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے، اس مسدّس کو نہایت عمدگی سے ایڈٹ کر کے میرے عنایت فرما مولنا محمد علی خاں اثر رامپوری نے شائع فرما دیا ہے جو اِس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔

حجاب سے مُلاقات

نوابان رامپور کو موسیقی کا صحیح ذوق تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے دربار میں بڑے بڑے فن کاروں کو جمع کیا تھا مگر ان کے سوا سینکڑوں فن کار اور طوائفیں میلے میں باہر سے آتی تھیں چنانچہ ۱۸۷۹ء میں میلا ہوا تو کلکتہ کی ایک ڈیرہ دار طوائف مُنّی بائی جو حجاب تخلّص کرتی تھی اور حُسن و موسیقی میں

بھی کامل تھی رامپور پہنچی، داغ کو اس سے دلچسپی ہو گئی اور انہوں نے دل دے ہی دیا، اس کی تفصیل خود داغ ہی کی زبان سے سُنئے ؎

آ گیا بے نظیر کا میلا — دِل پابندِ وضع کھُل کھیلا
آفتِ جاں ناتواں دیکھی — یک بیک مرگِ ناگہاں دیکھی
جلوہ دیکھا جو حُورِ طلعت کا — سامنا ہو گیا قیامت کا
دیکھ کر اُس پری شمائل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو
دِل کو میں ڈھونڈھتا رہا نہ مِلا — آنکھ مَلتے ہی پھر پتہ نہ مِلا

اِس طرح مُنّی بائی حجاب نے داغ کا متاعِ صبر و سکوں لُوٹ لیا مگر داغ بھی آخر داغ ہی تھے چند ہی روز میں حجاب کو بے حجاب بنا لیا اور راز و نیاز ہونے لگے ؎

رات کٹتی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھلی دلی کیا کیا
جاں نوازی پہ ان کو ناز بھی تھا — بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا
خانۂ دوست عیش خانہ تھا — ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا

مگر عین وقت پر فلکِ تفرقہ پرواز نے جُدائی کا سامان پیدا کر دیا اور حجاب نے واپسی کا قصد کیا، داغ کا یہ پہلا معاشقہ تھا اور عُمر بھر میں یہ پہلی جُدائی، ہجر و فراق کے خیال سے نہایت بادلتے والا داغ بھی فراق میں مبتلا ہو گیا ؎

آ گئی ہجر کی گھڑی سر پر — یہ بَلا جھیلنی پڑی سر پر
قصد ٹھیرا دلہن کے جانے کا — رنگ بدلا نیا زمانے کا
اس کے لب پر پیام رخصت کا — میرے دل میں مقام حیرت کا
اُدھر اس میہمان کی رخصت — تھی اِدھر میری جان کی رخصت
ساتھ اُس کے مری نگاہ گئی — جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی

اِس طرح حجاب داغ کو جُدائی کا داغ دے کر کلکتہ چلی گئی اور داغ حقیقی فراق میں مُبتلا ہو گئے، مگر اس ہجر و فراق کی سختی کو انہوں نے مکاتبت اور مراسلت کا سلسلہ قائم کر کے گزارنا شروع کر دیا اور بڑی منت خوشامد کے بعد دوسرے سال ۱۸۸۰ء کے میلے میں بُلا ہی لیا ؎

جا کے عہدِ شباب کا آنا ۔۔۔ تھا دوبارہ حجاب کا آنا
پھر وہی ساعت سعید آئی ۔۔۔ کہ برس دن کے بعد عید آئی

داغ کی ولادت ایک رئیس اور امیر کے گھر میں ہوئی تھی گو چار پانچ برس کی عُمر میں یہ گھر چھُٹا مگر آنکھیں وہیں کھُلی تھیں، اس کے بعد عمدہ خانم کے آغوش میں پرورش ہوئی تو وہاں بھی راگ رنگ رقص و موسیقی کا چرچا تھا اِس طرح چار چھ سال اسی ماحول میں گزرے ؎

طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

کے مصداق عشق و عاشقی راگ و رنگ ہی میں بچپن بیتا، پھر قلعہ معلیٰ میں پہنچے تو سلطنت مُغلیہ کا زوال تھا شمشیر و سناں نمائب، طاؤس و رباب حاضر تھا قلعہ میں رنگ رلیاں ہوتی تھیں یہی وجہ تھی جو چھوٹی بیگم نے بارہ[12] تیرہ[13] برس کی عُمر میں ان کی شادی کر دی تھی، قلعہ چھُوٹا اور اس کے بعد ہی غدر ہُوا تو داغ رامپور پہنچے، رامپور اُس [illegible] موسیقی [illegible] بنا ہوا تھا، نواب صاحبان رامپور نے اپنی راجدھانی کو راگ مالا بنا رکھا تھا، ہز ہائی نس نواب سر رضا علی خاں (نواب رامپور) لکھتے ہیں

"سولہ یا باختلاف رائے بیند رہ متقدمین نائکوں کے بعد باکمال متاخرین سب کے سب رامپور سے آ بسے یہ عہد میرے جدّ امجد نواب یُوسف علی خاں بہادر مرحوم کا تھا مثلاً آخری

"ڈاگروں" میں روشن خاں ڈاگر (جن کی قبر اب تک رامپور میں موجود ہے) اسی طرح پیار خاں، باسط خاں رباب یے جعفر خاں۔ صادق علی گویئے موجود تھے اور نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کے عہد میں بہادر حسین۔ پیار خاں کے شاگرد امیر خاں، عنایت خاں، رحیم اللہ خاں، عظیم اللہ خاں، گویئے قطب الدولہ گویئے (جن کو دربار اودھ سے قطب الدولہ کا خطاب حاصل تھا) میاں حیدر شاہ الغوزہ نواز اس طرح اور بہت سے ماہرینِ فن حاضر دربار تھے لیکن یہ دو امیر خود اپنے فن میں بے نظیر اور ان اساتذۂ فن کے نزدیک مسلم الثبوت اُستاد تھے[1]۔

رامپور پہنچ کر داغ بھی اس کان نمک میں گھل مل گئے، اور جو کسر ایک آدھ آنچ کی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی، اُس زمانے میں طوائف معیوب نہ تھی سوسائٹی کا جزو تھی، واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانے کی طوائف آج کل کی رنڈی کی قسم کی نہ ہوتی تھی وہ ایک خاص طبقہ تھا جو گانے ناچنے کے فن کا ماہر اور علم مجلسی سے واقف ہوتا تھا اس کی زندگی تہذیب تمدن کا نمونہ ہوتی تھی اس کا رہن سہن رکھ رکھاؤ اور معاشرت بڑی خاص تھی شُرفا اُس سے میل جول پیدا کرنا معیوب نہ سمجھتے تھے ہر امیر ہر رئیس بلکہ ہر شریف آدمی کے پاس ایک طوائف نوکر رہا کرتی تھی جو روزانہ ایک وقت خاص میں آتی گانا سُناتی یا اپنی بذلہ سنجی سے دل بہلایا کرتی تھی بڑے بڑے ثقہ لوگ بھی طوائف سے ملنے میں عار نہ کہتے تھے یہ خصوصیت ڈیرہ دار طوائفین کی تھی،

[1] ماہنامۂ آجکل دہلی موسیقی نمبر اگست ۱۹۵۶ء ص۴۹

ایسی ہی ایک ڈیرہ دار طوائف منی بائی حجاب تھی جو خاصی تعلیم یافتہ اور موزوں طبع تھی شعر بھی خوب کہتی تھی حجاب تخلص تھا اور کلکتہ میں بہت مقبول تھی ؛

حجاب جوان تھی اور داغ پچاس منزلیں عمر کی طے کر چکے تھے مگر نغمہ پرستی اور حسن دوستی نے قید سن سالی سے آزاد کر دیا تھا اِس لئے وہ حجاب پر فریفتہ ہو گئے، داغ کی عمر ہی متجاوز نہ تھی بلکہ اعصاب بھی متاثر تھے، صحت مدت سے خراب تھی مگر جذبات قوی تھے لیکن اس میں ہوس پرستی یا بوالہوسی کا شائبہ نہ تھا دِل لگی اور تفریح سے غرض تھی چنانچہ جب حجاب دوبارہ رامپور آئی تو داغ نے چاہا کہ اسے اپنا مہمان بنائیں مگر اس نے کسی اور جگہ قیام کیا، چونکہ نواب خلد آشیاں کے چھوٹے بھائی نواب حیدر علی خاں سے بھی اس کے مراسم تھے اِس لئے وہ اُن سے ملنے گئی تو انہوں نے روک لیا اور چند روز اُن کے پاس رہی، یہ داغ کے لئے غیر برداشت کُن تھا، اب کی بار حجاب کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن حمیدن بائی بھی تھی جو نقاب تخلص کرتی تھی اور حجاب سے زیادہ شوخ و طرار تھی، جب حجاب حیدر علی خاں کے گھر پر ٹھہر گئی تو داغ نے بڑی بے چینی سے حجاب کو چھٹیاں لکھیں گو نقاب نے انہیں مطمئن کرنا چاہا مگر وہ مطمئن نہ ہو سکے اور جان پر کھیل کر اپنے ایک دوست کو جو حیدر علی خاں کے مصاحب تھے ایک چٹھی لکھی،

"محبِ داغ! اگر آپ مجھے یہ لکھیں کہ نواب صاحب کی بلائی ہوئی حجاب گئی ہیں یا خود انہوں نے ڈورے ڈالے ہیں تو بڑی بندہ نوازی ہوگی، میرا دل و دماغ بہک چکا ہے دِل میں زخموں کی حد نہیں رہی اور پھر یہ شب و روز کی نمک پاشی

تلملا جاتا ہوں، آپ طرفین کے حالات سے خوب واقف ہیں، خوب معلوم ہے آپ کو کہ نواب صاحب کے مقابلہ میں اس کے سوا کہ...... اپنے عشق کی آگ میں جل بھن کر کباب ہو جاؤں کچھ نہیں کر سکتا، شاید آپ نواب صاحب سے کہہ سکیں کہ داغ حجاب کے تیر نظر کا بے طرح گھائل ہے آپ کی دل لگی کے لئے اور بھی سامان ہیں لیکن داغ بیچارہ حجاب کو نہ پائے تو کہاں جائے اور اگر کہیں جائے تو وہ پھانس جو دل میں پیوست ہے کیسے دور ہو؟ جواب کے انتظار میں بے چین ہوں"۔

داغ بڑے نفسیات دان تھے قدرت نے انہیں عجیب و غریب دل و دماغ دیا تھا فطرت انسانی کا مطالعہ انہوں نے خوب کیا تھا اور ایسے نفسیاتی حربے استعمال کرتے تھے جن کا توڑ نہ ہو سکے ایسا خط یا تو کوئی بیوقوف ہی لکھ سکتا ہے یا ماہر نفسیات ہی وہ ہمیشہ سر اور دھڑ کی بازی لگا دینے کے عادی تھے چنانچہ یہ شعر اُن کی اِس ذہنیت کا آئینہ دار ہے ؎

یا رحم آ گیا اسے یا قتل ہو گئے
ہم سر جھکائے بیٹھے ہیں قاتل کے سامنے

چنانچہ داغ کا وار بھرپور پڑا مکتوب الیہ نے داغ کا پیام حیدر علی خاں کو پہنچا دیا اور اُن پر وہی اثر ہو جو ہونا چاہیئے تھا داغ کی بیچینی سے متاثر ہو کر نواب نے حجاب کو رخصت کر دیا اور حجاب داغ کے پاس پہنچ گئی اور پھر ؎

گزری اوقات عیش و عشرت سے
دو مہینے تک ایک صورت سے

کہہ کر اس "وقفۂ نشاط" کی تفصیل بیان کر دی ہے،

حجاب ایک طائر آزاد تھی وہ بھلا قید بند میں کیا رہ سکتی تھی کلکتہ

جانے کی تیاری کرنے لگی

بولے میری بلا قفس میں رہے — آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے رامپور مجھے — جلد رخصت کریں حضور مجھے
ایک انداز سے ہوئے رخصت — بڑے اعزاز سے ہوئے رخصت
کیا کہوں میں کہ کس چلن سے رہے — رہے جب تک وہ بانکپن سے رہے
پھر وہ سمجھے یہ مر ہی جائے گا — ڈوب جائے گا زہر کھائے گا
آ کے اس کی تسلیاں کر دیں — جی میں جو کچھ ہے وہ بیاں کر دیں
مجھ سے کہنے لگے سنو صاحب — اس قدر مضطرب نہ ہو صاحب
صبر کا پھل ضرور پاؤ گے — اس کی راحت بہت اٹھاؤ گے

اس طرح سمجھا منا کر حجاب تو چلی گئی مگر داغ آتش فراق میں جلنے لگے اور پھر سلسلۂ خط و کتابت شروع ہو گیا، چند ماہ کے بعد پھر میلے کی دھوم دھام شروع ہوئی اور ۱۸۸۱ء کے میلے میں داغ نے بڑی کوشش کی کہ حجاب رامپور آئے مگر وہ نہ آئی اس کے بعد ۱۸۸۲ء کے میلے میں بلانے کی داغ نے بہت کوشش کی مگر وہ نہ آئی بلکہ الٹا داغ ہی کو کلکتہ بلانے لگی اور داغ رخصت لے کر رامپور سے کلکتہ کے لئے رخصت ہوئے ؎

مل گئی جب حضور سے رخصت — میں ہوا رامپور سے رخصت
کہہ کے اٹھا اخیر یا قسمت — راہ رو میں تو رہنما قسمت
جا کر اپنے وطن میں جی نہ لگا — اس بنائے کہن میں جی نہ لگا
چل کے دلی سے لکھنؤ پہنچا — ہمہ تن شوق و آرزو پہنچا
بہت اجڑے ہوئے مکاں دیکھے — مٹنے والوں کے کچھ نشاں دیکھے
جو کچھ ارمان تھا نکال لیا — شہر کو خوب دیکھ بھال لیا

خوب انجم نے مہمانی کی　　اور بھی سب نے مہربانی کی
راہ میں کانپور الہ آباد　　میں نے دیکھے مگر نہ حسب مراد
اتنے میں آ گیا عظیم آباد　　تھا مجھے اس کا شوق حد سے زیاد

داغ پٹنے میں

اس وقت تک داغ کی شہرت خاصی ہو چکی تھی اور عظیم آباد کے لوگ ان سے واقف تھے علاوہ ازیں ان کے اخیافی بھائی آغا مرزا شاغل دہلوی اُن دنوں پٹنے ہی میں تھے اور چونکہ انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع دیدی تھی اس لئے انہوں نے خوب تشہیر کی تھی اور سارا عظیم آباد داغ کا منتظر تھا اسی وجہ سے ان کا استقبال نہایت شاندار ہوا ؎

پیشوائی کے واسطے احباب　　آئے تھے شوق دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے　　اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لئے ہی جاتا تھا　　کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا تھا مرے گھر چلئے　　آئیے اِس طرف اُدھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا　　رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے　　میرزا شاغل آئے تب وہ ہٹے

مرزا شاغل محلہ گروہٹہ میں رہتے تھے پاس ہی میر باقر عظیم آبادی کا مکان تھا جو عظیم آباد کے شرفا سے اور خاندانی بزرگ تھے، وحید الہ آبادی کے شاگرد نہایت خوش فکر شاعر اور خوشنویس تھے شاغل نے میر باقر

ہی کے مکان پر داغ کو ٹھہرایا۔

داغ کے عظیم آباد پہنچنے سے پہلے محلہ مُغل پورہ کے ایک رئیس نے مشاعرہ مقرّر کر دیا تھا اور طرح دی تھی

آباد کہیں خانۂ ویراں نہیں دیکھا

جس روز داغ وہاں پہنچے ہیں اُسی رات مشاعرہ تھا صاحب مشاعرہ خود سواری لے کر داغ کے پاس پہنچے یا تو اتفاق تھا یا پھر داغ کا امتحان مقصود تھا، بہرحال ان لوگوں نے اصرار کیا اور داغ نے انہیں لوگوں کے سامنے پچیس ۲۵ تیس ۳۰ شعر کہہ لئے اور مشاعرے کے لئے روانہ ہوئے پھر راستہ چلتے ہوئے بھی دس ۱۰ بارہ ۱۲ شعر اور کہہ لئے! در مشاعرے میں بڑی سیر غزل پڑھی جس کا مطلع اور مقطع تھا ؎

اِس خانۂ دِل کو کبھی ویراں نہیں دیکھا ۔۔۔ اِس بُت کو کبھی اللہ کا مہماں نہیں دیکھا
کیا پُوچھتے ہو کون ہے کس کی ہے یہ شُہرت ۔۔۔ کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

داغ کے خیر مقدم میں پہلا مشاعرہ میر باقر نے کیا اور اپنے اُستاد کی غزل کا مصرع طرح کر دیا اِس مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے داغ نے غیر طرحی غزل پڑھی جس کے دو ۲ مطلعے یہ تھے ؎

فُرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے ۔۔۔ ڈھونڈھا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ نے
کھاتے ہیں داغ دوست مرے دل کے داغ سے ۔۔۔ سچ ہے چراغ جلتا ہے دشمن چراغ سے

طرحی غزل میں تو داغ نے دھوم مچا دی خصوصاً جب یہ شعر پڑھا تو مشاعرہ تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اُٹھا اور لوگوں نے دس دس بار یہ شعر پڑھوایا ؎

بہت رو یا ہُوں مَیں جب سے یہ مَیں نے خواب دیکھا ہے

کہ اب آنسو بہلتے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

ایک اور مشاعرہ عظیم آباد والوں نے داغ کے خیر مقدم میں کیا جس میں طرحی غزل داغ نے پڑھی ہے

طور کے پہلو میں اک بت خانہ ایسا چاہئے ۔۔۔ شور اٹھے جلوۂ جانانہ ایسا چاہیئے

داغ کے پہنچتے ہی سارا عظیم آباد اُمڈ آیا ہر شخص آکر ملتا کوئی غزل سناتا کوئی غزل سنتا کوئی شاگرد ہوتا تو کوئی فقط دوستی کا دم بھرتا، اس طرح داغ عظیم آباد میں نہایت ہی مقبول اور مصروف رہے بیشتر بزرگوں کی بازدید کے لئے بھی جانا پڑا چنانچہ بازدید کے سلسلہ میں داغ نے خانقاہ ابوالعلائیہ محلہ شاہ املی کے سجادہ نشین شاہ یحییٰ کی خدمت میں بھی حاضری دی تو انہوں نے تاریخیں کہیں ہے

جناب داغ در شہر من آمد ۔۔۔ رسید ندا آرزومنداں زہر سو

بہ لوح دہر تاریخ قدومش ۔۔۔ رقم کردم قدوم داغ حق کو

عظیم آباد والوں نے جس گرمجوشی سے داغ کا استقبال کیا اور جس خلوص و محبت سے ہاتھوں ہاتھ لیا اس سے داغ بہت متاثر ہوئے کیونکہ اس وقت تک اتنی ہر دلعزیزی انہیں کہیں نظر نہیں آئی تھی، یہ دراصل مرزا شاغل اور ان کی پارٹی کی محنت کا نتیجہ تھا جو داغ اتنے مقبول ہوئے اس کا ذکر مثنوی میں انہوں نے اس طرح کیا ہے ہے

مجھ کو فرصت ملی نہ یاروں سے ۔۔۔ روز ملتا تھا میں ہزاروں سے

ایسی خلقت کہیں نہیں دیکھی ۔۔۔ یہ مروت کہیں نہیں دیکھی

کیسی مہماں نوازیاں دیکھیں ۔۔۔ کس قدر جاں نوازیاں دیکھیں

ان کے اخلاق یاد ہیں مجھ کو ۔۔۔ ان کے اشفاق یاد ہیں مجھ کو

داغ اوائل ماہ اپریل میں رامپور سے نکل کر دہلی، لکھنؤ وغیرہ گھومتے ہوئے اواخر اپریل ۱۸۸۲ء میں عظیم آباد پہنچے تھے کیونکہ انہوں نے ۲ر مئی ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد سے نواب بہادر علی انجم نیشاپوری کو ایک خط لکھا ہے۔

"میں بخیر و خوبی واردِ عظیم آباد ہوا، محلہ گرہٹا مکان سید باقر صاحب میں مقیم ہوں چار روز ہو گئے کہ وہ کلکتہ روانہ ہو گئے سید قطب الدین کو اپنے ساتھ لے گئے...... اہل عظیم آباد نے میری اس قدر خاطر و عزت کی ہے جس کی حد نہیں کلکتے جانے نہیں دیتے میری طبیعت علیل ہوئی جاتی ہے سرکار میں خط بھیجا ہے اس کے جواب کا منتظر ہوں"۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ ۲ر مئی سے پہلے داغ پٹنہ پہنچتے ہیں اور "وہ" ۲ر مئی کو پٹنہ سے کلکتہ گئے ہیں، یکم جون کو ایک عرضی داغ نے نواب صاحب کی خدمت میں بھجوائی ہے،

"فدوی بضرورت چند در چند از ہفتہ واردِ عظیم آباد پٹنہ گشتہ است و از انجا قصدِ کلکتہ نیز دارد لہٰذا امیدوارم کہ از راہ غریب نوازی رخصت ۲ دو ماہ دیگر مرحمت شود"۔

اس خط کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جون کا نہیں بلکہ مئی کا لکھا ہوا ہے نقل کرتے ہوئے مہینہ غلط لکھا گیا ہے یا پھر جون صحیح ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ "بضرورت چند در چند از ہفتہ" والی عبارت کی نقل میں نقل نویس نے غلطی کی ہے کیونکہ داغ کا قیام ایک مہینے کا ہو چکا تھا پھر داغ نے یہ مدت کیوں گھٹا دی؟ ممکن ہے کہ "بضرورت چند از چند ہفتہ" کو نقل نویس نے چند در چند لکھ دیا ہو مگر اس کی تصدیق مثنوی کے اس شعر سے بھی ہوتی

ہے ؎

آٹھ دن سیر دیکھی پٹنے کی ۔۔۔ یہ ہوئی وجہ جی اچٹنے کی

۷ رمئی کو داغ نے جو خط انجم کو لکھا ہے اس کا آخری فقرہ ہے "سرکار میں خط بھیجا ہے جواب کا منتظر ہوں"۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داغ نے مئی ہی میں نواب صاحب کو خط لکھا ہے علاوہ ازیں جلوۂ داغ میں بھی انہوں نے

"اثنائے سفر میں آٹھ دن عظیم آباد میں بھی مقیم رہے"

لکھوایا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ داغ مئی میں عظیم آباد پہنچتے ہیں اور وہیں رہ کر ساون کا انتظار کرتے ہیں چنانچہ وہیں کے ایک مشاعرے میں انہوں نے یہ مقطع پڑھا تھا ؎

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلا جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

صوبۂ بہار میں ماہ جون کے وسط میں مانسون شروع ہوتا ہے اِس طرح ۱۴ رجون کے بعد مانسون شروع ہوا اور چھینٹا پڑا یعنے ساون رُت آئی تو داغ نے کلکتہ کا قصد کیا اِس لئے یقین ہے کہ پورا ماہ مئی اور آدھا ماہ جون عظیم آباد میں گزرا ہے اور وسط ماہ جون میں وُہ کلکتہ روانہ ہوئے ہیں ؛

چنانچہ اِس روانگی کا حال یوں نظم کیا ہے ؎

سوئے کلکتہ میں روانہ ہُوا ۔۔۔ دور تک ساتھ اک زمانہ ہُوا
شوق بے اختیار لے ہی گیا ۔۔۔ یہ دِل بیقرار لے ہی گیا
ایسی آئی ہوائے کلکتہ ۔۔۔ دِل پکارا کہ ہائے کلکتہ

داغ کے شاگردِ رشید سیّد قطب الدین اشک جلیسری نے داغ سے

پہلے کلکتہ پہنچ کر ان کی آمد کی پبلسٹی کی تھی مگر قطب الدین مرزا شیاغل کی طرح نہ پروپیگنڈسٹ تھے اور نہ کلکتہ عظیم آباد کی طرح چھوٹا سا قدیم شہر تھا اس لئے داغ کی دھوم دھام اتنی نہ ہوسکی جتنی عظیم آباد میں ہوئی تھی مگر پھر بھی استقبال شایانِ شان ہوا ؎

رئیں پروستانِ نیک خصال   آئے اکثر برائے استقبال
شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا   داغ آیا تو باغ باغ آیا

داغ کلکتے میں

داغ کا یہ سفر کلکتہ پہلا نہ تھا اس سے پہلے ۱۸۶۶ء میں نواب صاحب رامپور کے ساتھ وہ کلکتہ جا چکے تھے مگر وہ سفر سولہ سال پہلے ہوا تھا، اس اثناء میں کلکتہ بہت ترقی کر چکا تھا علاوہ ازیں وہ سفر بالکل مخصوص تھا اب داغ ایک عوامی شاعر اور آزاد مسافر کی طرح کلکتہ دیکھ رہے تھے ؎

دیکھ کر شہر کھل گئیں آنکھیں   ماہ رویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں
سر بازار وہ مکان بلند   جس کو کہئے اک آسمان بلند
چرخ کو رتبہ اس مکان سے کہاں   دور بھاگا ہے یہ کہاں سے کہاں
شرم و غیرت سے چھپ گئی جنّت   ورنہ یہ قصر دیکھی جنّت

اپنی قیام گاہ کی یوں تعریف کی ہے ؎

ہم جو بالائے بام رہتے تھے   لوگ عالی مقام کہتے تھے
سامنے ناخدا کی مسجد تھی   ناخدا کیا خدا کی مسجد تھی

داغ کے سفر کلکتہ سے متعلق سوا مثنوی فریادِ داغ اور جلوۂ داغ کے کہیں ایک لفظ بھی نہیں ملتا، بزمِ داغ میں جو داغ کا فرضی روزنامچہ ہے دو ایک واقعات نظر آتے ہیں مگر میرے نزدیک وہ چونکہ فرضی ہیں ان لئے میں نے انہیں قابلِ استناد نہیں سمجھا ہے، جلوۂ داغ میں داغ نے اپنی مصروفیات یوں ظاہر کی ہیں،

"کلکتہ میں ناخدا کی مسجد کے سامنے آپ (داغ) ٹھہرے تھے اور جب تک وہاں رہے برابر مشاعرے ہوتے رہے، ایک مشاعرہ تو لوگوں نے آپ ہی کے مکان پر کیا تھا، جس میں مٹیابرج کا خاندان شاہی اور بہت سے ملازمین اور عمائدین خاندانِ شاہی محض آپ کی خاطر شریک تھے اسی طرح مختلف مقامات شہر میں مشاعرے ہوا کئے اور برابر آپ کے قیام تک یہی کیفیت رہی کہ روزانہ صبح و شام سینکڑوں مشتاق عمائدین و رؤساء آپ سے ملنے کے لئے آتے تھے۔"

داغ نے جلوۂ داغ میں ایک لطیفہ بھی لکھوایا ہے کہ عبدالرزاق شاد نے مشاعرہ مقرر کیا مگر نہ تو پہلے سے داغ کو دعوت دی اور نہ مصرع طرح ہی بھیجا بلکہ عین مشاعرے کی رات داغ کے پاس پہنچ کر مشاعرے میں چلنے کے لئے مجبور کیا اور داغ بھی ساتھ ہو گئے چونکہ طرح میں غزل کہنی تھی اس لئے داغ نے ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ کر غزل کہنی شروع کی، اتفاق سے پٹنے کے دو عدالتی عہدہ دار جو بزرگ صورت اور سفید پوش تھے مشاعرے میں پہنچے اور داغ کو ڈھونڈھنے لگے تو شاد نے انہیں اسی کمرے میں پہنچا دیا جہاں بیٹھے داغ غزل کہہ رہے تھے اور اتنے محو تھے کہ انہیں کسی کے آنے

جانے کی خبر تک نہ تھی یہ دونوں بزرگ داغ کے قریب پہنچ کر ان کی محویت کا تماشا دیکھ رہے تھے کہ داغ یکایک چونکے اور ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا "ایں، ابھی تو میں زندہ ہوں یہ منکر نکیر کہاں سے آ گئے"، داغ کی اس بذلہ سنجی سے لطف اندوز ہو کر دونوں بزرگ مسکراتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

کلکتہ میں داغ کے خیر مقدم میں کئی مشاعرے ہوئے ایک مشاعرے میں داغ نے یہ غزل پڑھی ؎

جو بل ہے تری زلف گرہ گیر سے باہر — وہ پیچ نہیں ہے مری تقدیر سے باہر
دلی سے تو کلکتہ کو پہنچے مگر اے داغ — کیوں کر ہوں حصار فلک پیر سے باہر

اور ایک مشاعرے میں داغ نے یہ غزل پڑھی تھی ؎

روکنا دل کو کہ شوق زلف لے کر لے چلا — تھامنا مجھ کو کہ یہ سودا مرا سر لے چلا
یہ حسیں یہ مہ جبیں یہ شہر ایسی لہر بہر — داغ کلکتے سے لاکھوں داغ دل پر لے چلا

داغ نے کلکتہ میں ہزاروں آدمیوں سے ملاقات کی اور سینکڑوں سے دوستی کی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی قیام کلکتہ کے زمانے میں انہوں نے عبدالغفور خاں نساخ سے دوستی کر لی جو ان دنوں میدنی پور کے ڈپٹی کلکٹر تھے یہ وہی نساخ تھے جنہوں نے اپنے تذکرے میں داغ کو نہایت ہی حقارت سے "ولد چھوٹی بیگم" لکھ کر ذلیل کرنا چاہا تھا اور کوئی ہوتا تو ان سے بات بھی نہ کرتا مگر داغ کی وسیع القلبی دیکھئے کہ انہوں نے نساخ سے نہ صرف دوستی کر لی بلکہ اتنے گہرے مراسم پیدا کر لئے کہ مدتوں دونوں کی مراسلت رہی نساخ کے بیٹے بھی شاگرد ہو گئے اور داغ نے انہیں اپنا اور حجاب کے درمیان حکم بنا کر اپنے جھگڑے بھی طے کرائے،

غالب نے بھی کلکتہ کا سفر کیا مگر وہاں جا کر جھگڑے کھڑے کر دئے اور دوستوں کو دشمن بنا لیا۔ بخلاف ان کے داغ نے کلکتہ پہنچ کر دشمنوں کو بھی دوست بنا لیا بقول داغ ؎

غیر کو اپنا بنا لیتے ہیں ہم تو وقت پر
دوست کو دشمن بنانا کوئی تم سے سیکھ جائے

فریاد داغ میں کلکتہ والوں کی تعریف یوں کی ہے ؎

لوگ سب خوش قماش خوش ترکیب
اہل تمیز و صاحب تہذیب

ہم سے سرگرم اتحاد رہے
عبدرزاق شاد شاد رہے

دوست با وضع ہے کہاں پیدا
داغ اس وضع دار کا شیدا

یہ شیخ عبدالرزاق شاد دہلوی شیخ الہ دیا کے بیٹے تھے اور شیخ جیون تاجر کلکتہ نے انہیں متبنیٰ لیا تھا دہلی میں پیدا ہوئے لاہور کے مشہور تاجر شیخ رحیم بخش کی لڑکی سے شادی ہوئی شعر بھی کہتے تھے داغ کے کلکتہ جانے سے پہلے حکیم سید محمد سجاد سے مشورہ کرتے تھے مگر داغ سے ملنے کے بعد انہیں کے شاگرد ہو گئے بڑے فراخ دل لیکن سخت مسرف تھے اسی وجہ سے دیوالیہ ہو گئے دو دفعہ حیدرآباد آ کر داغ کے مہمان بھی رہے، مولوی عبدالصمد واصفی کا بیان تھا کہ قیام کلکتہ کے دوران میں انہوں نے داغ کی مالی امداد بھی کی تھی جس کی وجہ سے داغ ان کا بہت لحاظ کرتے تھے چنانچہ جب کبھی یہ حیدرآباد آتے تھے تو داغ ان کی خاطر مدارات بہت کرتے اور مالی امداد کرتے تھے۔

یہ سب ضمنی باتیں تھیں کیونکہ داغ کا سفر کلکتہ حجاب کے لئے ہوا تھا اور داغ نے حجاب سے جو لطف اُٹھائے وہ ان کی زندگی کا حاصل تھا، ساون رُت کے مزے داغ نے خوب اُڑائے ؎

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں
آتشِ حسنِ یار کی گرمی بزم میں اک بہار کی گرمی
گرچہ اکثر ہوا جنوبی تھی پر وُہ عطرِ حنا میں ڈوبی تھی
چاندنی کے تمام شب جلسے دلکشا سقف پر عجب جلوے
یاد ہے ایک رشکِ گُل کی سیر چودھویں رات کو وُہ پُل کی سیر

اِس طرح شعبان کی چودھویں کے چاند کی سیر داغ نے کلکتہ میں اپنی رشکِ گُل کے ساتھ کی اور یہ رنگ رلیاں جاری ہی تھیں کہ رامپور سے طلبی ہوئی ؎

میری رخصت کے دن تمام ہوئے عیش و عشرت کے دن تمام ہوئے
جلد حاضر ہو یہ پیام آیا اور سر پر مہ صیام آیا
پھر تو مَیں ایک دم ٹھہر نہ سکا دل کی حسرت قدم ٹھہر نہ سکا
اِس طرح کس طرح سے رہ جاتے ہوئے باون برس نمک کھاتے

اِن دنوں داغ کی عُمر باون سال ہوئی تھی غلبۂ نمک خواری میں لپنے آپ کو باون سالہ نمک خوار ظاہر کیا ہے یہ بھی اندازِ شاعرانہ ہے۔ پیدائش سے پانچویں سال تک داغ اپنے والد شمس الدین خاں ہی کے پاس رہے اور پھر بارہ[۱۲] سالہ عمر سے چوبیس[۲۴] سالہ عمر تک قلعۂ معلیٰ میں مرزا فخرو کے زیر پرورش رہے اِس طرح سترہ سال تو انہوں نے رامپور سے باہر اور اپنے اعزا و اقربا کے پاس زندگی بسر کی البتہ بچپن میں چھ[۶] سالہ عمر سے بارہ[۱۲] سالہ عمر تک اور پھر غدر کے بعد سے اس وقت تک ضرور نواب رامپور کے نمک خوار تھے، یہ بھی بظاہر ویسا ہی شاعرانہ اندازہ ہے جیسا کہ انہوں نے پٹنہ کے قیام کے متعلق کیا ہے،

قیاس یہ ہے کہ داغ نے ۶ راپریل ۱۸۸۲ء سے دو مہینے کی رخصت لی ہوگی جو ۵ر جون کو ختم ہوتی تھی اس لئے انہوں نے عظیم آباد سے "رخصت دو ماہ دیگر" کی درخواست بھجوائی مگر معلوم ہوتا ہے کہ مزید رخصت منظور نہیں ہوئی یا ہوئی بھی تو صرف ایک مہینے کی ہوئی جو ۵ رجولائی کو ختم ہوتی تھی اس لئے اس کی اطلاع رامپور سے آئی تو داغ نے واپسی کی فکر کی ۔

میری رخصت سے ان کو حیرت تھی — کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی
فکر تشویش رنج تھا غم تھا — عوض نغمہ شور ماتم تھا
اشک آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے — پاس بیٹھے تو منہ بنائے ہوئے

انتہا یہ کہ حجاب نے یہاں تک کہا کہ ۔

چند وابستہ ہیں ہمارے ساتھ — ورنہ ہو لیتے ہم تمہارے ساتھ
ہم عزیزوں کو چھوڑ دیں کیونکر — سلسلہ اُن سے توڑ دیں کیونکر
جو مرے پاس ہے تمہارا ہے — تم کو لیکن یہ کب گوارا ہے
تم بھی تنہا نہیں ستم یہ ہے — چھوٹتا ہے یہ ساتھ غم یہ ہے

بہر حال داغ نے بصد حسرت و یاس ۳ر جولائی کو کلکتہ چھوڑا ۔

اہل صحبت کو داغ دے کے چلے — اپنے دل کا جنازہ لے کے چلے
کیا کہیں کس طرح سے ہم آئے — ہمہ تن حسرت و الم آئے
میرے ہمراہ میر قطب الدین — اشک ریزاں بحالت غمگین
میری غمخواریوں سے کام انہیں — میری دلداریوں سے کام انہیں
میرے دل کو وہ اس طرح لائے — کوئی گھائل کو جس طرح لائے
کچھ نہ تھی مجھ کو جسم و جاں کی خبر — نہ زمین کی نہ آسماں کی خبر
ریل نے دو ہی دن میں پہنچایا — رمضاں ایک دن کے بعد آیا

تقویم (کلینڈر) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۷ رجولائی ۱۸۸۲ء کو غرۂ رمضان ۱۲۹۹ء تھا اس لئے ہم نے یہ تعین کیا ہے کہ داغ ۳ رجولائی کو کلکتہ سے چلے ۲ دو دن ریل میں رہے ۶ رجولائی کو تین مہینے کے بعد بخیر خوبی رام پور واپس ہوئے،

رامپور پہنچ کر داغ کو قرار نہ آیا یا آتش فراق میں جلتے رہے چنانچہ اسی حال میں مثنوی فریادِ داغ کہی ×

مثنوی فریادِ داغ

یہ مثنوی ۸۳۸ شعر کی ہے جو کلکتہ سے واپسی کے بعد جولائی ۱۸۸۲ء میں کہی گئی ہے اس میں ابتدائے معاشقہ سے کلکتہ سے واپسی تک کی داستانِ لطیف بڑے مزے سے بیان کی گئی ہے اور اسے یوں ختم کیا ہے ؎

یا الہٰی نجات غم سے ملے ۔۔۔ وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے ۔۔۔ اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے

لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ یہ مثنوی دو دن کی کوشش کا نتیجہ ہے چنانچہ جلوۂ داغ میں لکھوایا گیا ہے،

"زود گوئی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فریادِ داغ جیسی بے مثل مثنوی ۲ دو دن کی معمولی فکر کا نتیجہ ہے۔"

داغ نے یہ مثنوی یقیناً دو دن میں کہی ہو گی کیونکہ وہ بہت زود گو تھے، حیدرآباد میں باتیں کرتے کرتے دو دو تین تین غزلیں لکھوا دیا کرتے تھے

ان کے لئے ایک دن میں چار سو شعر کہہ لینا وُہ بھی مثنوی کی بحر میں کوئی مشکل کام نہ تھا،

فریادِ داغ رمضان یا شوال ۱۲۹۹ھ میں کہی گئی ہے یعنے جولائی یا اگست ۱۸۸۲ء میں مگر اس کا نام داغ نے دو تین مہینے کے بعد ماہ محرم ۱۳۰۰ھ میں رکھا ہے جو تاریخی نام ہے اور اسی سال اس کی طباعت بھی ہوئی ہے مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد نے اس کا پہلا اڈیشن شائع کیا اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد اڈیشن چھاپے ہیں چونکہ مدت سے یہ مثنوی نایاب تھی اِس لئے مَیں نے ایک تفصیلی مقدمہ لکھ کر محبی عبدالسلام صاحب کے حوالہ کر دیا تھا جسے انہوں نے "آئینۂ ادب" (چوک مینار، انارکلی لاہور) سے بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ شائع کی ہے، چونکہ اس مقدمے میں داغ اور حجاب کے معاشقے کے تفصیلی حالات آ گئے ہیں اس لئے مَیں نے اِس کتاب میں ان کا سرسری ذِکر کر دیا ہے، جن حضرات کو اس قصّے کی تفصیلات سے دلچسپی ہو وُہ مقدمۂ فریادِ داغ ملاحظہ فرمائیں ؂

دوبارہ کلکتہ جانے کا ارادہ

داغ کے کلکتہ سے واپس ہونے کے بعد کے حالات کہیں نہیں ملتے البتہ صدیق مکرم عرشی رامپوری نے داغ کے تین ۳ غیر مطبوعہ خطوط کے مسودے جن کی نقل فیروز شاہ خاں فیروز رامپوری نے کی تھی رضا لائبریری رامپور کے لئے حاصل کر لئے ہیں جنہیں موصوف نے از راہِ نوازش مجھے عنایت فرمایا،

یہ خطوط میں نے جناب رفیق مارہروی کو دئے تھے جنہیں انہوں نے مطبوعہ مکاتیب داغ "زبانِ داغ" میں شائع کر دیا ہے ،

ان مسودات سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے حجاب کو بلانے کی مسلسل کوشش کی، خطوط لکھے، بیماری کا بہانہ کیا، دوستوں سے لکھوایا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی بالآخر مجبور ہو کر خود داغ نے کلکتہ کا قصد کیا نواب صاحب سے اجازت اور رخصت بھی مل گئی اور ۱۴ محرم ۱۳۰۵ھ کو روانگی مقرر بھی ہو گئی مگر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ وہ کلکتہ نہ جا سکے ۔

آفتابِ داغ

گلزارِ داغ کے بعد کا کلام ۱۸۸۲ء تک کا داغ نے اکٹھا کر کے مطبع کے حوالہ کر دیا، جو بڑی دیر سے یعنی ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا، اس دیوان کا نام آفتابِ داغ ہے جو داغ کا دوسرا دیوان ہے، اس میں ۱۱۹ غزلیں ۲۵۷۱ اشعر اور صرف ۸ رباعیات ہیں، یہ دیوان مطبع انوار الاخبار لکھنؤ میں منشی تیغ بہادر کے اہتمام سے ۱۳ سطری مسطر کے ۲۵۹ صفحات پر چھپا ہے ،

آفتابِ داغ میں عبد الغفور خاں نساخ کا قطعۂ تاریخ بھی ہے جن کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے یہ قطعہ بڑا نستعلیق ہے ؎

نساخ مثلِ عقدِ ثریا شد است جمع — بار دگر نتائجِ طبعِ خیالِ داغ
می زیبد ار ز رشک شود بلبلِ ارم — داغ از لطافتِ سخنِ بے مثالِ داغ
از آب خویش در عرقِ شرم غرق شد — دُر در صدف ز خجلتِ عقدِ لآلِ داغ

پیوستہ جائے خویش کند گرم در جہاں	مانند داغِ عشق بدلہا مقال داغ
از بہر سال فکر چو شد آسماں نورد	گفتا دبیر چرخ کہ "بدر کمال داغ"

جس شخص میں یہ کمال ہو کہ وہ دشمن کو دوست اور معمولی ملاقاتی کو مخلص بنالے وہ ہر مقام پر اپنے لئے جگہ پیدا کر سکتا ہے، چنانچہ داغ نے اسی طرح زندگی بسر کی، سوا حاسدین کے سب لوگ ان سے خوش رہے انتہا یہ کہ اسیر، امیر، جلالؔ اور منیر باوجود ہم فن و ہم پیشہ ہونے کے داغ کے دوست تھے، نوابانِ رامپور تو داغ پر فریفتہ تھے اور عمائدین و امراء بھی گرویدہ رہے اور عوام تو ان کے شیدائی تھے اسی وجہ سے داغ کو رامپور سے محبت تھی، رامپور اور نوابان رامپور کے وہ حاضر و غائب مداح رہتے تھے چنانچہ یہ شعر گواہ ہیں ؎

رئیس مصطفیٰ آباد کے نوکر ہوئے جب سے	بتائیں داغ کیا آرام ہم نے کسقدر پایا

ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغ	کس طرح جائے کلب علی خاں کو چھوڑ کر

ہے عجب شہر مصطفیٰ آباد	اس کو رکھنا مرے خدا آباد
سب اسے رام پور کہتے ہیں	ہم تو آرام پور کہتے ہیں
خیر نواب کی مناتے ہیں	جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب کلب علی خاں بہادر اللہ کو پیارے ہو گئے اور رامپور کی بہار بھی اپنے ساتھ لیتے گئے ان کے بعد داغ نے بڑی تکلیف اُٹھائی اور خلد آشیاں کو یاد کر کے روتے رہے ؎

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ	مزے سارے تھے وہ خلد آشیاں تک

رُباعی

نواب نے کی جو قدر دانی میری
اے داغ گزر گئی جوانی میری
لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وقتِ پیری
مر مر کے کٹے گی زندگانی مری

قیام حیدر آباد کے زمانے میں بھی داغ کے شاگردوں نے انہیں خلد آشیاں کو یاد کر کے روتے دیکھا ہے۔ انتہا یہ کہ موت کے بعد خلد آشیاں سے ملنے کی آرزو تک تھی ؎

رسائی کی اگر قسمت نے اپنی
ملیں گے خلد میں خلد آشیاں سے

رام پور سے واپسی

کلب علی خاں کے بعد نو مہینے سے زیادہ داغ رامپور میں رہ نہ سکے مجبوراً ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو رامپور سے نکلنا پڑا، دہلی پہنچ کر متعلقین کو وہاں چھوڑا اور لاہور، اجمیر، کشن کوٹ (امرت سر) آگرہ، علیگڈھ، متھرا، جے پور، منگرول وغیرہ سب جگہ پھرے مگر کہیں بھی کوئی صورت نہ نکل سکی مجبوراً دِلّی لوٹ آئے مگر دِلّی میں کیا تھا جو وہاں رہتے اِسی لئے کہنے لگے ؎

جہاں آباد ہر منزل ہے اے داغ
قدم باہر نکالا جب مکاں سے

پھر تنگ دستی اور بے زری نے ستانا شروع کیا ؎

میں طب کو دیکھوں تو وہ یابس ہو جائے
پرکھوں زرِ خالص کو اگر مس ہو جائے
ہاتوں میں مرے آکے درم داغ بنے
قاروں بھی مرے سامنے مفلس ہو جائے

عظیم آباد اور کلکتہ کے پُر جوش استقبال نے شاید کچھ غلط فہمی داغ کو اپنے متعلق پیدا کر دی ہو مگر اب گھوم پھر کر جو حالت دیکھی تو بڑی تکلیف ہونے لگی اور بے اختیار کہہ اُٹھے ؎

پہلے تو پوچھتا تھا زمانہ ہماری بات　　　اب ہے یہ حال کوئی ہمیں پوچھتا نہیں

داغ کے قیام رامپور کی مدت سے متعلق بڑی غلط فہمیاں ہیں، داغ کا حافظہ بہت اچھا تھا مگر وہ مدت یا سال مہینے یا دِن یاد ہی نہیں رکھ سکتے تھے چنانچہ انہوں نے جب کوئی مدت بتائی غلطی کی ہے، عظیم آباد کا قیام ایک ہفتہ بتایا فریاد داغ میں اپنی نمکخواری باون برس بتائی اسی طرح مدت قیام رام پور بھی زیادہ بتا دی اور اُن کی بتائی ہوئی مدت جلوۂ داغ میں لکھی گئی جس سے افسون، شہرت، سیماب اور سری رام وغیرہ نے نقل کی چنانچہ اکثر لوگوں کو اعتراض ہے جس کا اظہار داغ نمبر میں بعض حضرات نے کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ داغ غدر کے بعد سے مستقل طور پر رامپور کے متوسل رہے اور اگر دہلی یا کسی اور مقام پر گئے بھی تو نواب صاحب ہی کے کام پر جاتے رہے اس طرح انہوں نے ۱۸۶۶ء تک زندگی بسر کی، ۱۴ اپریل ۱۸۶۶ء کو ان کا مستقلانہ تقرر ہو گیا اور وہ دسمبر ۱۸۸۷ء تک رامپور ہی میں رہے، اِس طرح اکیس سال آٹھ ماہ تو انہوں نے رام پور میں مستقل ملازمت کی ہے جس سے کسی کو انکار نہیں صرف ابتدائی آٹھ سال کے متعلق بعض حضرات نے بحث کی ہے جو فضول ہے کیونکہ غدر کے بعد سے داغ کا رامپور سے متعلق ہونا ثابت ہے صرف اِس ادعا پر کہ ان کا مستقلانہ تقرر کسی جائداد (اسامی) پر نہیں ہوا تھا انہیں ریاست کا متوسل نہ ماننا

تو ظلم ہے اس لئے میری دانست میں داغ کا ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۷ء تک رامپور سے تعلق رہا اور وہ ریاست کے متوسل رہے، اُن کا تیس۳۰ سال تک مُلازم رہنا ثابت ہے ؀

حیدرآباد دکن کا سفر

جب ہر طرف سے نا امیدی ہونے لگی اور دلّی میں رہنے کی بھی کوئی صُورت نہ بنی تو داغ نے دکن کا رُخ کیا ؎

دلّی سے چلو داغ کرو سیرِ دکن کی	گوہر کی ہوئی قدر سمندر سے نکل کر

راستے ہی میں قصیدہ کہنا شروع کر دیا تھا جس کا مطلع تھا ؎

میں ہوا بادیہ پیما طرف مُلکِ دکن	سُرمۂ چشمِ غزالاں ہوئی گردِ دامن

۷ ر اپریل ۱۸۸۸ء (۲۴ ر رجب ۱۳۰۵ھ) کو حیدرآباد پہنچے اور سدّی عنبر کے بازار میں سیف الحق ادیب کے مہمان ہوئے، سیف الحق ان دنوں اس مکان میں رہتے تھے جس میں پولس ایکشن سے پہلے مجوبیہ کارخانہ جلد سازی تھا اور سڑک پر جو دو منزلہ بنگلہ تھا جس میں مدّت تک مقبول رسٹورنٹ رہ چکا ہے وہ بھی انہی کے قبضے میں تھا اور اسی دو منزلہ پر داغ نے قیام کیا تھا یہ مکان حال میں ڈھا دیا گیا اور اسی جگہ دو منزلہ عمارت بنائی گئی ہے جس میں بعض دکانات ہیں اور اس سے ملا ہوا آج کمل بار اور ہوٹل ہے ؀

سیف الحق داغ کے پُرانے دوست تھے، حیدرآباد میں ایک

(دیکھو حاشیہ صفحہ ۹۹)

اخبار نویس اور نامہ نگار کی حیثیت سے ان کی خاصی شہرت تھی اور اپنی علمی ادبی مصروفیات کی وجہ سے بھی مقبول تھے انہوں نے داغ کا تعارف حیدر آباد کے معزز طبقے سے کرایا اور چند ہی روز میں داغ خاصے مقبول ہو گئے ۔

ابوالحمید آزاد بھی داغ کے ایک قدیم دوست اور شاگرد تھے جو اُن دنوں حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے[1] انہوں نے بھی داغ کے تعارف و تشہیر میں بڑی کوشش کی، دِلّی کے سینکڑوں شرفا حیدر آباد میں تھے ان لوگوں نے بھی ہاتوں ہاتھ لیا ۔

حاجی محمد ابراہیم خانساماں شاہی بھی صاحب ذوق شعر و سخن کے دلدادہ تھے داغ سے ان کی خط و کتابت پہلے سے تھی بلکہ انہوں نے ہی درحقیقت داغ کو حیدر آباد آنے کی ترغیب دی تھی، راجہ گردھاری پرشاد باقی بنسی راجہ حیدر آباد کے ایک قدیم بزرگ عالم فاضل اور صاحب ذوق امیر تھے انہیں کے ذریعہ داغ نے اپنا قصیدہ بارگاہ سُلطانی میں پیش کرایا، اعلیٰ حضرت حضور نظام نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکان نے قصیدہ پڑھوا کر سُنا پھر خود مُلاحظہ فرمایا اور پسند فرما کر داغ کو سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا، نواب سر آسمان جاہ بہادر امیر اکبر مدارالمہام کی خدمت میں باریاب ہو کر بھی داغ نے رُباعیات، قطعات اور قصائد پیش کئے اور انہوں نے بھی اعلیٰ حضرت

---

[1] بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸ - سیف الحق، شاہ عبدالحق کے خاندان سے تھے ۱۸۴۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت ہوئی غالب کے شاگرد تھے حیدر آباد میں اخبار کے نامہ نگار کی حیثیت سے ملازم تھے علمی ادبی مذاق بڑا اچھا تھا ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا ۔

[1] آزاد مدتوں وکالت کرنے کے بعد ملازم ہو گئے اور عرصے تک ناظم عدالت رہے اور شاید حیدر آباد ہی میں انتقال کیا ۱۲

حضور نظام سے سفارش فرمائی کہ داغ کو کلام دکھایا جائے تو مناسب ہے اس طرح داغ نے بہت جلد حیدرآباد میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی ؛

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف جاہ نظام ششم کو شاعری کا شوق تھا اکثر فکرِ سخن فرمایا کرتے تھے چونکہ مصاحبین میں کوئی ایسا نہ تھا جو فن شعر پر حاوی ہو اور شاعری کے حُسن و قبح سے واقف ہو اس لیئے حضور کو ایک اُستاد کی ضرورت تھی مگر حضور عجیب و غریب طبیعت کے بادشاہ تھے، نہایت مخیّر، بڑے ہی فیّاض اور دریادل، بات کے پکّے قول کے دھنی بے انتہا متین اور بہت ہی بُردبار، بڑے ہی ضابط و متحمّل بہت کم اپنا منشا صاف صاف ظاہر فرمایا کرتے تھے ہر کام آہستگی سے کرتے کوئی نیا شخص باریاب ہوتا تو اُسے تپا کر دیکھتے کہ کتنے پانی میں ہے اور دربار میں آنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں ؛

سوا سال حیدرآباد میں

عام طور پر کوئی معمولی شخص بھی کسی کو اُستاد بنانے سے پہلے اس کے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہے یہاں تو اُستادِ شاہ بنانا تھا اپنا اُستاد گویا دکن کا اُستاد اور ملک الشعراء بنانا تھا، اِس لئے اُستاد کی صلاحیت پرکھی جانے لگی، قصیدہ رکھا رہا، اِدھر داغ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے تھے، نئے فقیر کو بھیک کی جلدی تھی اور جلدی کیسے نہ ہوتی؟ نہ تو کچھ نقدی ہی پاس تھی اور نہ گھر پر سرمایہ تھا، بڑی پریشانی کا زمانہ تھا، نواب سر آسمان جاہ بہادر اور راجہ

گردھاری پرشاد نے اطمینان دلایا مگر داغ کو اطمینان نہ ہو سکا اسی سراسیمگی میں مُبتلا تھے کہ حضور نے یاد فرمایا، داغ نے باریاب ہو کر منذروی رُباعیاں سُنائیں، مجھ سے والد مرحوم نے کئی بار فرمایا تھا کہ داغ کا قصیدہ راجہ گردہاری پرشاد باقی نے حضور میں پیش کیا تھا اور داغ جب باریاب ہوئے تو انہوں نے چند رباعیات سُنائیں مگر یہ رباعیاں داغ نے پھر کسی اور کو نہ سُنائیں اور نہ دیوان ہی میں رکھا، حضور نے اِن رباعیوں کو پسند فرمایا تھوڑی دیر گفتگو فرمائی اور داغ کو رُخصت فرما دیا اس کی تاریخ داغ نے کہی ہے

قدمبوس حضرت کا حاصِل ہُوا   بڑے شوق سے اور ارمان سے
حضوری کی تاریخ پُوچھیں اگر   یہ کہہ دو "ملے داغ سلطان سے"
۱۳ ۰۵

راجہ گردہاری پرشاد کے ذریعہ یہ قطعہ حضور میں پیش کرایا گیا ؎

داغ کی پہلی بار آمد اور حیدرآباد سے روانگی اور دُوسری مرتبہ آنے کے سلسلہ میں بڑی غلط فہمیاں تھیں چنانچہ میں بھی مدت تک غلط فہمی میں مُبتلا رہا مگر خوش قسمتی سے مجھے داغ کی تنخواہ کی اجرائی کی مسل (فائل) مل گئی جس سے غلط فہمی دُور ہو گئی اِس مسل میں داغ کے ہاتھ کا لِکھا ہوا ایک فرد ہے جس میں داغ نے پہلی بار حیدرآباد آنے پھر واپس جانے اور دوبارہ آنے کی تفصیل لکھی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ پہلی بار حیدرآباد آئے تو اسی زمانے میں حضور میں باریاب ہوئے اور ان کا قیام حیدرآباد میں ۷؍ اپریل ۱۸۸۸ء سے ۱۲؍ جولائی ۱۸۸۹ء تک رہا، اِس سوا سال کے عرصے میں داغ نے جو جد و جہد کی وُہ قابلِ داد ہے ؎

اُن دنوں حیدرآباد سیاسی اکھاڑا بنا ہوا تھا ہر شخص کسی پارٹی سے متعلق تھا ایسی فضا میں رہ کر کامیاب ہونا مُشکل تھا مگر داغ بڑے دل

گر دے کے آدمی تھے ان میں عملی قوت بے انتہا تھی ان کی خوش نصیبی سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا چنانچہ اس کا احساس بھی انہیں تھا کہا ہے سہ

اس کے معنی تو یہی ہیں کہ ہنر مند نہیں　　کیوں مجھے دیکھ کے کہتے ہیں نصیب اچھا ہے

ان کی خوش نصیبی کے ساتھ ساتھ ان کی جد و جہد، سیاست دانی، نفسیات دانی، خوش خلقی، منکسر مزاجی، ملنساری اور تجربہ کاری بھی ان کی کامیابی میں ممد و معاون ہوئی ۔

حیدر آباد میں اس وقت بعض ملکی امراء آپس میں دست و گریباں تھے شمالی ہند سے آئے ہوئے بعض حضرات نے اپنی ریشہ دوانیوں سے ایک ہنگامہ بپا کر رکھا تھا، حضور کے مصاحبین تک آپس میں متحد و متفق نہ تھے ایک دوسرے کے درپئے تھا ایسے وقت میں حیدر آباد میں ٹکنا اور پھر کامیاب ہونا

معجزہ گر نیست کرامات ہست !

اس سیاسی چپقلش اور ان ریشہ دوانیوں اور پارٹی بازیوں کی تفصیل بڑی لمبی ہے جو لوگ اس سے واقف ہونا چاہیں، کارنامۂ سروری، حیات مسیح، حیاتِ جاوِدانی، وقارِ حیات، مکاتیب محسن الملک اور حیات النذیر کا مطالعہ کریں، ان حالات میں حیدر آباد میں رہ کر کسی پارٹی سے وابستہ نہ ہونا قعر دریا میں پھنس کر دامن تر نہ ہونے دیتا تھا، مختلف اور متضاد مکتب خیال والوں سے نباہنا اور کسی کو بھی مخالف نہ ہونے دینا ناممکن تھا مگر واہ رے داغ باوجود قعر دریا میں تختہ بند ہونے کے دامن تر کئے بغیر پار نکل جاتا ہے ۔

داغ بقول خود آشنائی پیشہ تھے سہ

اور تو ہم کو کچھ نہیں آتا ۔۔۔ کام کرتے ہیں آشنائی کا

حقیقت یہ ہے کہ داغ اس فن میں باکمال تھے ناممکن تھا کہ کسی سے ملیں اور اسے مسخر نہ کر لیں ؎

مثل سنی ہے کہ ملنے سے کوئی ملتا ہے ۔۔۔ ملے تو آنکھ ملے دل ملے نگاہ ملے

اور اس طرح ملنے کے بعد جب بات چیت ہوتی تو وہ "پرچا" ہی لیتے تھے

داغ میں پرچا بھی لوگوں کا باتوں باتوں میں نہیں ۔۔۔ شرط یہ ہے میرا ان کا سامنا ہونے لگے

چنانچہ سب سے پہلے شاہی تقاریب میں داغ نے قصائد، قطعات، در تاریخات پیش کرنے شروع کر دئیے چنانچہ شہزادۂ بلند اقبال کی سالگرہ ہوئی تو تاریخ کہی ؎

ہوئی ہے سالگرہ آج شاہزادے کی ۔۔۔ رہے ہمیشہ الٰہی بہار سال گرہ

برائے نذر شہنشاہ داغ لکھ تاریخ ۔۔۔ زیادہ تا بہ ابد ہو شمار سال گرہ
۱۳۰۵

داغ حیدر آباد میں نو وارد تھے انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ رئیس دکن کو شہنشاہ نہیں کہا جاتا چونکہ وہ قلعہ میں رہ کر وہ شاہ و شہنشاہ کہنے کے عادی ہو گئے تھے اس لئے اِس قطعۂ تاریخ میں بھی شہنشاہ کہہ گئے مگر جب انہیں اس غلطی کا احساس ہوا تو پھر انہوں نے ایسی بے اعتدالی نہیں کی،

اسی زمانے میں صاحبزادئ فرخندہ فال کی ولادت ہوئی تو داغ نے تاریخ پیش کی،

اے خسروِ جم حشم فلک قدر ۔۔۔ ہے عہد ترا بسا مبارک

اللہ رکھے تجھے سلامت ۔۔۔ ہو عشرت جاں فزا مبارک

اللہ نے دی ہے شہزادی ۔۔۔ اللہ کی یہ عطا مبارک

چلّہ ہے سکندرالنساء کا ۔۔۔ یہ رسم کرے خدا مبارک

اِس دِن کی دُعائیں مانگتے تھے یہ دِن ہے بہت بڑا مُبارک
ہوتی ہے ولادت اس میں مسعود ہے ماہ صیام کا مُبارک
آئی رمضاں میں عید گویا سب عیدوں سے ہے سوا مُبارک
دیکھے چھٹی چھلے شادیاں سب جلسوں کا ہو دیکھنا مُبارک
تاریخ کہی ہے داغ نے آج نورس تجھے بادشاہ مُبارک

سر آسمان جاہ بہادر کو وزارت سرفراز ہوئی تو تاریخ کہی سے

پہلے سلطان ابن سلطان خسرو ملک دکن پھر بشیر الدولہ، عادل امیر ابن امیر
یہ دلاور ہے سکندر وہ بہادر تہمتن بادشاہت بے بدل ہے تو وزارت بے نظیر
قابل مدح و دعا ہیں لائق وصف و ثنا شاہِ عالمگیر دستور معظم شیر گیر
جنذا خاقان دوراں مرحبا نواب عہد اس سے جاں آرام نہیں ہے اس سے دل راحت پذیر
یہ ہے شمع سلطنت تو وہ چراغ ابہت مالک اقبال روشن صاحب رائے منیر
یہ اگر ابر کرم ہے وہ ہے دریائے نوال کیوں رہے ملک دکن میں نام کو بھی اب فقیر
داغ تاریخ وزارت اتفاق شہ سے لکھ مہر و ماہ آسمان نورس شاہ و وزیر

افسر جنگ کا ان دنوں طوطی بول رہا تھا ان سے مُنہ موڑنا عقلمندی نہ تھی اس لئے
اس لئے انہیں بھی ہموار کر لیا سے

قدرداں ہے قیصر ہندوستاں کر دیا میجر زراہِ معدلت
ہو مُبارک یہ خطاب میجری تجھ کو اے نواب والا مرتبت
اے بہادر پاک دل پاکیزہ خو مدح کے قابل ہے تیری ہر صفت
قدرداں تیرا ہے شاہ دکن شاہ کیسا شاہ فخر سلطنت
مصرع تاریخ لکھا داغ نے میجر افسر جنگ عالی منزلت

افسر جنگ کوئی قابل اور تعلیم یافتہ شخص نہ تھے جو اس تاریخ کو سمجھتے ان میں بس

اتنی ہی خصوصیت تھی کہ حرفوں سے بنے ہوئے آدمی تھے، حد درجہ ہوشیار، بے انتہا دُنیا ساز، اِس لئے داغ نے ایک رباعی کہی جس میں ان کی شجاعت اور حوصلہ مندی کو سراہا گیا تھا جس کا انہیں زعم تھا یہ حربہ کارگر ہوا اور افسر جنگ ہموار ہو گئے ؎

ہے باغ شجاعت کا شجر افسر جنگ ہے بحر سخاوت کا گہر افسر جنگ
ذی مرتبہ ذی حوصلہ ذی شاں ذی عقل اے داغ نہیں کوئی مگر افسر جنگ

نواب سر وقار الامراء اقبال الدولہ بہادر باہر گئے ہوئے تھے وہ واپس آئے تو داغ نے خیر مقدم کیا ؎

شہرت ہے بڑی شان سے آئے نواب اقبال کے سامان سے آئے نواب
جان آ گئی اے داغ ہمارے تن میں جب ہم نے سُنا کان سے آئے نواب

اِس طرح اُن سے رُوشناسی ہو گئی تو پھر یُوں مدح و ثنا ہونے لگی ؎

گنجینۂ دولت سے سخاوت بڑھ کر ایثار و سخاوت سے شجاعت بڑھ کر
نواب وقار الامراء کے اوصاف بڑھ کر ہیں زمانے سے نہایت بڑھ کر

اور جب ان سے مراسم ہو گئے تو پھر ان سے توقعات وابستہ کر دیں ؎

ہے صاحب اقبال وقار الامراء ہے مظہر اجلال وقار الامراء
اے داغ عجب کیا ہے پھریں اپنے دن ماضی کو کرے حال وقار الامراء

اس کے بعد تو اپنی پریشانیاں بھی سُنانے لگے ؎

دریائے سخا کانِ عطا کون کہ آپ مُشکل کے مرے عُقدہ کشا کون کہ آپ
داغ اپنی پریشانیٔ دِل کس سے کہے نواب وقار الامراء کون کہ آپ

نواب خانخاناں ایک عالم اور علم دوست امیر تھے بساط ریاست کے یہ بھی مُہرے تھے انہیں بھی ہموار کرنا ضروری تھا اِس لئے ایک رباعی کہہ کر

انہیں پر چالیا ؎

ذی مرتبہ ذی شاں ہے خان خاناں
ہر حشم میں انسان ہے خان خاناں
ہر سینے میں دل ہے اور ہر دل میں امید
قالب میں مری جان ہے خان خاناں

نواب منیر الملک بہادر سے داغ کے مراسم پہلے ہی سے تھے یہاں پہنچ کر ان کی تجدید بھی کر لی ؎

خورشید سے انور ہے تری رائے منیر
امید سے بڑھ کر ہے ترا فیض کثیر
نواب منیر ملک یکتائے زماں
آپ اپنا جواب اپنی مثال اپنی نظیر

محسن الملک بہادر سے بھی قدیم روابط تھے یہاں آنے کے بعد اور مراسم بڑھ گئے تھے ؎

مہدی کو اگر خیر زماں کہتے ہیں
یا محسن ملک اس کو یہاں کہتے ہیں
زیبا ہے کہیں محسن عالم اے داغ
جو چاہئے کہنا وہ کہاں کہتے ہیں

اس خیر کا انسان کوئی ہو تو سہی
ذی مرتبہ ذی شان کوئی ہو تو سہی
ہر شخص کی ملحوظ ہے خاطر داری
یوں دل کا نگہبان کوئی ہو تو سہی

نواب وقار الملک بہادر سے داغ کے بڑے پُرخلوص مراسم تھے مگر ان کے دیوان میں کوئی رُباعی قطعہ وغیرہ ان کی تعریف میں نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں اتنے گہرے اور پُرخلوص مراسم تھے کہ اس قسم کی مدح سرائی کی ضرورت نہیں پڑی ؛

راجہ گردھاری پرشاد باقی شروع ہی سے ان کے ممد و معاون تھے اس لئے ان کی مدح و ثنا بھی ضروری تھی ؎

جب تک ہے جہاں میں دورِ ساقی باقی
جب تک رہے لذت تلافی باقی

باقی کی نہ کیوں ہو عمر و دولت کو بقا — فانی فانی ہے اور باقی باقی

نواب ناظم الملک محبوب یار جنگ بہادر حضور کے مصاحب اور بہت پیش پیش تھے انہیں بھی داغ نے بہا لیا تھا ؎

اے داغ آج دیدۂ عبرت شناس بین — جو آبرو ہے پیش بہادر کے واسطے

اس سے زیادہ ہو سر و سامان و آب و تاب — محبوب یار جنگ بہادر کے واسطے

نواب قوت یاور الدولہ قدیر جنگ بہادر بھی ان دنوں مصاحبت اور بعض اہم خدمات سے سرفراز تھے اس لئے انہیں بھی ٹھیک بنا لیا ؎

جب تک ہے ضیا بخش مہ و مہر منیر — جب تک ہے کواکب سے فلک پُر تنویر

دلشاد رہے خوش رہے آباد رہے — نواب قدیر جنگ یا رب قدیر

آصف نواز الملک معتمد صرفخاص کی خاص شخصیت تھی اس لئے داغ نے اُن سے بھی دوستی کر لی تھی، اُن دنوں حیدر آباد میں فقیروں، مجذوبوں اور مشائخوں کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی بادشاہ سے خقیر تک سبھی ان کے گرویدہ تھے چنانچہ ہنمکنڈہ میں ایک مجذوب عبدالنبی شاہ تھے جن کے معتقد عبدالرزاق یعنے آصف نواز الملک تھے جب عبدالنبی کا وصال ہوا تو انہوں نے مقبرہ بنوا دیا اور داغ نے تاریخ کہی ؎

مزار اشرف عبدالنبی شاہ

نواب قادر الدولہ بہادر حیدر آباد کے ایک عالم خاندان کے امیر تھے باوجود امارت طلباء کو درس بھی دیا کرتے تھے ان کے فرزند نورالحسین بھی باپ ہی کی طرح علم دوست اور نیک تھے داغ کے پاس ان کی آمد و رفت تھی انہوں نے مکان اور باغ بنایا تو داغ نے تاریخ کہی ؎

میر نورالحسین خان ذی جاہ — کرد قصر رفیع و باغ بنا

داغ یک مصرع و دو تاریخ است — خوش چھا قصر، باغ روح افزا

اس طرح داغ نے تقریباً سارے امراء[۵] کو اپنا[۱۳] ممد و معاون[۵] بنا[۱۳] لیا تھا۔

والد مرحوم داغ کی آمد سے متعلق بیان کرتے تھے کہ ان دنوں حیدرآباد کا سب سے بارونق بازار پتھر گھٹی تھا شام کے وقت حیدرآباد کے شرفا اسی بازار میں خرید و فروخت اور سیر و تفریح کے لئے آیا کرتے تھے، چار مینار کے اطراف بالاخانے (کوٹھے) تھے جن میں طوائفیں رہتی تھیں جو شام کو بن سنور کر اپنے اپنے کوٹھے پر بیٹھ جاتیں اور حیدرآباد کے بانکے ترچھے بے فکرے چار مینار کے چکر کاٹتے تھے، پتھر گھٹی پر صرف دو کانیں تھیں پارچہ فروش، گھڑی ساز، سادہ کار، کفش فروش، منہیاری سامان کی اچھی دکانیں تھیں شرفا یہیں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔

نوجوانانِ دکن کی ایک پارٹی ابھر رہی تھی جس کے اراکین قطب الدین تسلی، محی الدین محفوظ، رضی الدین حسن کیفی، غلام محمد زعم تھے، والد ماجد تجلی بھی اسی پارٹی کے رکن تھے یہ لوگ اکثر شام کے وقت پتھر گھٹی پر گھوما کرتے تھے، اتفاق سے ایک شام یہ لوگ گھوم رہے تھے کہ ایک بگھی کھلے ہوئے ٹاپ کی نظر آئی جس میں ایک لحیم شحیم شخص جو چہرے سے بارعب اور مردِ متین تھا مگر نہایت ہی سیاہ رنگ، بیٹھا ہوا تھا، اس کی ٹوپی خصوصیت سے مضحکہ خیز تھی مخمل کی چوگوشیہ سیاہ ٹوپی پر ایک پٹی سنہری چار انگل کی ٹنکی ہوئی تھی کالے مخمل کی ٹوپی پہننے والا بھی کالا بیچ میں سنہری پٹی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسوٹی پر سونے کی تحریر ہے، یہی فقرہ بے ساختہ ان لوگوں کے منہ سے نکل گیا چونکہ یہ شخص اجنبی نظر آرہا تھا اس لئے ان لوگوں نے غور سے دیکھا اور بگھی راستے سے گزر گئی۔

یہ واقعہ عظیم خاں کی دُکان کے سامنے ہوا تھا، عظیم خاں دہلی کے رہنے والے پہلوان منش آدمی تھے پتھر گھٹی پر انہوں نے جُوتوں کی دُکان لگائی تھی اور دلی ہی کے جُوتے فروخت کرتے تھے خود بھی پہلوان تھے اور پہلوانوں کو بُلا کر کشتی لڑایا کرتے تھے انہوں نے اس شخص کو دیکھتے ہی کہا "دِلّی پیاری کا ڈھب ہے" آدھے گھنٹے کے بعد جب یہ بگھی واپس ہونے لگی تو عظیم خان اپنی دُکان پر سے اُتر کر سڑک پر ٹھہر گئے اور راستہ روک کر پُوچھ ہی لیا "حضور! کیسے تشریف لانا ہُوا، قیام کہاں ہے"؟ چونکہ عظیم خاں دِلّی والوں کا لباس پہنتے اور کرخنداروں کی زبان بولتے تھے اِس لئے اس شخص نے انہیں دِلّی والا جان کر علیک سلیک کی اور قیام گاہ کا پتہ بتادیا، عظیم خاں نے مغرب کے بعد ہی اس کی قیام گاہ پر جاکر دریافت کیا کہ اس حُلیے کا دِلّی والا کون آیا ہے تو معلوم ہوا کہ نواب مرزا داغ ہیں، عظیم خاں نے مُلاقات کی اور کہا "حضور! مزا آ گیا آپ نے جو زری کی چوگوشہ ٹوپی پہن کر پتھر گھٹی کی سَیر کی تو حیدرآباد کے نوجوانوں نے کسوٹی پر سونے کی پھبتی اُڑائی ہے" داغ یہ سُن کر بہت محظوظ ہوئے کہنے لگے، بھائی! نوجوانانِ دکن نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے یہ پھبتی تو میری خوش قسمتی کی پیش گوئی ہے، میری پیشانی پر انہیں سونے کی تحریر نظر آئی یہ میری کامیابی کی علامت ہے اب یقیناً میری قسمت پلٹے گی ان نوجوانوں سے میری طرف سے کہو کہ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں انہیں میرے پاس لے آؤ میں ان کا ممنون ہوں۔

والد فرماتے تھے کہ دُوسرے روز جو ہم عظیم خاں کی دوکان پر سے گزرے تو عظیم خاں نے کہا کل آپ لوگوں نے کسوٹی پر سونے کی پھبتی جن پر چست کی تھی وُہ داغ دہلوی ہیں، دلّی سے آئے ہوئے ہیں، مَیں نے

کل کا واقعہ سُنایا تو بہت خوش ہوئے اور آپ لوگوں سے ملنے کی خواہش کی ہے ان سے ضرور ملئے ۔

داغ کی شہرت حیدر آباد میں خاصی تھی نوجوانانِ دکن پہلے سے ان کے مداح تھے اب جو معلوم ہوا کہ داغ آئے ہوئے ہیں تو یہ باغ باغ ہوگئے اور سیدھے داغ کے پاس پہنچ گئے ، سیف الحق نے داغ سے تعارف کرایا ، داغ نے بڑی خندہ پیشانی سے مُلاقات کی اور ان لوگوں نے ہر دُوسرے تیسرے دن داغ سے ملنا شروع کر دیا ۔

مَیں نے سُنا ہے کہ حیدر آباد آنے کے بعد داغ کے پہلے شاگرد رنج ہوئے پھر الم اور ان کے بعد بارق شاگرد ہوئے ان کے بعد شاگردوں کا تانتا بندھ گیا روزانہ کوئی نہ کوئی شاگرد ہوتا تھا اس طرح داغ کے ابتدائی سوا سال کے قیام میں سو ڈیڑھ سو شاگرد ہو گئے ۔

داغ کی آمد سے چند سال پہلے حیدر آباد میں ایک پارسی تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی جس کے ناٹک بہت پسند کئے گئے تھے اِس کمپنی کے جانے کے بعد بعض بے فکروں نے ایک ناٹک بنا ڈالی ، چند کاروباری ، چند شوقین اور چند ماہرین اس ناٹک کے بانی تھے چونکہ دال منڈی کے محلّہ میں یہ ناٹک قائم ہوئی تھی اِس لئے اس کا نام ہی "دال منڈی کی ناٹک" مشہور ہو گیا ۔

اِس ناٹک میں تین چار رنڈیاں بھی کام کرتی تھیں ، مالی سرپرستی شمشیر نواز جنگ کرتے تھے ، نادر علی برتر ، غلام حسین داد ، تجلی ، زعم ، کیفی ، امیر حمزہ وغیرہ ڈراما نویسی اور مکالمہ نگاری کرتے تھے ۔

ان دنوں ناٹک دیکھنا بے انتہا معیوب سمجھا جاتا تھا اور اس سے

کسی قسم کا تعلق رکھنا تو بہت ہی بُری بات سمجھی جاتی تھی، اِس لئے لوگ چُھپ چُھپ کر آتے جاتے تھے۔

ایک روز کوئی خاص کھیل بڑی رانی تھا چھوٹی رانی کو جو اس ناٹک کی رُوح رواں تھیں داغ کی غزلیں یاد کرائی گئی تھیں اور مدن (جو ایک خوبصورت لڑکا تھا اور زنانی کردار ادا کرتا تھا) کو بھی داغ ہی کی غزلیں دی گئی تھیں، اِس لئے داغ کو بھی دعوت دی گئی، داغ نے ایک سادہ شیروانی پہنی رامپوری نُکہ دار شملہ باندھا مُنہ پر ڈھاٹا لپیٹ کر ایک لٹھ ہاتھ میں لئے نوجوانانِ دکن کے ساتھ ڈال منڈی کی راہ لی، تھیٹر میں اسٹیج کے سامنے چبوترہ پر خصوصی مہمانوں کے لئے صوفے رکھے گئے تھے اسی پر داغ براجماں ہوئے، معلوم نہیں بڑی رانی کو کسی نے داغ کی آمد کی اطلاع دیدی تھی یا اُس نے یوُں ہی ان کی طرف بتانا شروع کر دیا بہرحال داغ ہی کی غزل شروع کر دی ؎

ترے وعدے کو بُت حیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے کبھی صُبح ہے کبھی صُبح ہے کبھی شام ہے

چونکہ اداکاری اور ترت دونوں میں اسے خاصی مہارت تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی اِس لئے سماں بندھ گیا خصوصاً ؎

کبھی دیکھ تُو سرہ گزر کہ تڑپتے رکتنے ہیں خاک پر
نہ چل ایسی چال تُو فتنہ گر کوئی یہ بھی طرزِ خرام ہے

کہ اس نے بتانا شروع کیا اور چال چل کر حاضرین کو پامال کرنے لگی تو عجیب حال ہوگیا داغ تو بس جھُومتے رہے غالباً داغ کے اسی تاثر کو دیکھ کر اس نے مقطع جو گایا تو نہ صرف داغ ہی کو مخاطب کیا بلکہ ہاتھ اُٹھا کر انہیں کی طرف

بتائی بھی گئی ؎

دِل وہ دیں کا جس کو نہ پاس ہو یہی نامُراد ہے دیکھ لو
جسے داغ کہتے ہیں اے بُتو اسی رُو سیاہ کا نام ہے

داغ کالے تھے ہی اس پر رنگین ڈنڈا اسی رنگ کا رامپوری صافہ بہت ہی اُونچا اور قد بھی ماشاءاللہ خاصا لمبا اور پھر اس خیال سے کہ عوام پہچان نہ لیں آپ نے مُنہ پر ڈھاٹا بھی باندھ رکھا تھا اِس لئے سارے تھیٹر کی نظریں انہیں پر پڑنے لگیں اور انہیں وہاں سے فرار ہونا پڑا مگر اس کے باوجود داغ نے بڑی رانی کو بہت پسند کیا، دُوسرے روز داغ کی دعوت شمشیر نواز جنگ نے اپنے باغ میں کی اور بڑی رانی چھوٹی رانی اور مدن کا گانا خوب سُنایا، اِس طرح داغ حیدر آباد سے واقف ہوئے اور سوسائٹی میں گھُل مِل گئے

داغ حیدر آباد کے مشاعرے میں

حیدر آباد میں مشاعروں کی ابتدا راجہ چندو لال شاداں (۱۲۴۸ھ ۱۲۶۱ھ) نے کی تھی شاہ نصیر اور شیخ حفیظ دہلوی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اسی زمانے سے مشاعروں کا سلسلہ جاری تھا، بعض مشاعرے سالانہ ہوتے تھے اور بعض ہنگامی، بہر حال ہر مہینے دو مہینے میں ایک آدھ مشاعرہ میں انہیں بھی دعوت دی اور داغ بڑی خوشی سے مشاعرے میں شریک ہوئے ٭

نواب محمد علی خاں مرحوم فرماتے تھے کہ انہوں نے داغ کو پہلی دفعہ اسی

مشاعرے میں دیکھا اور سُنا تھا، داغ نے جو غزل سُنائی اس کا مطلع تھا ؎

لے چلا جان مری رُوٹھ کے جانا تیرا ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

یہ شعر داغ نے اِس انداز سے سُنایا کہ ساری محفل متاثر ہو گئی ؎

آرزو ہی نہ رہی صبح وطن کی مجھ کو شام غُربت ہے عجب وقت سہانا تیرا

اِسی مشاعرے میں ایک اور غزل داغ نے سُنائی جس کے قافیہ میں ہ حرف روی ہے اِس غزل کی حیدر آباد میں دھوم مچ گئی اور بچہ بچّہ گانے لگا یہ پہلی غزل تھی جو حیدر آباد میں عام ہوئی یہ گویا داغ کا اشتہار تھا ؎

داغ ہر ایک زباں پر ہو فسانہ تیرا وُہ دِن آتے ہیں وُہ آتا ہے زمانہ تیرا

میرزا داغ ہو یا شاہِ دکن ہو وُ لطف اور دن رات رہے جشن شہانہ تیرا

واپسی

ایک سال تین مہینے داغ نے بڑے مصروف گزارے، چند روز تو ادیب کے مہمان رہے مگر پھر انہوں نے ادیب سے یہ کہہ کر میرا ارادہ مستقل طور پر حیدر آباد میں رہنے کا ہے اپنا انتظام الگ کر لیا اور سوا سال اسی طرح گزُرا، ایک مُلازم جو ساتھ آیا تھا، ان کا باورچی اور خدمتگار تھا جو غالباً حمید تھا،،

حضور نے اِس سوا سال کے عرصے میں پُوچھا تک نہیں مگر جو لوگ حضور کے مزاج شناس تھے وُہ اطمینان دلاتے رہے کہ آپ کا تقرر ہو چکا ہے آپ مطمئن رہیں مگر داغ کو اطمینان نہ ہوا اور ہوتا بھی کیسے جبکہ کلام ہی

اصلاح کے لئے آیا اور نہ حضور نے یاد فرمایا، اسی لئے داغ پریشان تھے، جو کچھ ساتھ لائے تھے خرچ ہو چکا تھا اور پھر یہاں بعض لوگوں سے قرض دام بھی کرنا پڑا تھا اسی لئے بڑی سراسیمگی میں ۱۲ر جولائی ۱۸۸۹ء کو حیدرآباد سے نکل کھڑے ہوئے اور بنگلور بمبئی وغیرہ گھومتے ہوئے دہلی پہنچ گئے ۔

کنور اعتماد علی خاں رئیس متھرا داغ کے شاگرد اور دوست تھے انہوں نے داغ کی مالی امداد بہت کی تھی چنانچہ حیدرآباد سے دہلی پہنچ کر جو خطوط انہوں نے لکھے ہیں اُن میں سے چند انشائے داغ میں طبع ہو گئے ہیں پہلا خط ۶ر جولائی کا ہے اس کی تاریخ غلط چھپی ہے کیونکہ داغ ۱۲ر جولائی کو حیدرآباد سے چلے ہیں اِس لئے یہ خط یقیناً ۲۶ر جولائی کا ہے ۔

جناب والا سلامت!

"پرسوں چہار شنبہ کو خط مفصّل لکھ چکا ہوں یہاں سب طرح خیریت ہے مگر مَیں علیل ہوں ٹخنے سے نیچے تک بائیں پاؤں میں ورم ہو گیا ہے نہایت تکلیف ہے آپ کا خط ۲۳ر کا لکھا ہوا ۲۶ر کو پہنچا، طبیعت کی صفائی نہ ہونے سے تردد ہے پرہیز معالجہ شرط ہے، مَیں اپنی زندگی سے زیادہ آپ کی دُعا مانگتا ہوں کہ آپ ہی پیٹ کی خبر لے رہے ہیں، معاملۂ معلومہ کا خیال رہے جس کا وعدہ مہینا بھر کا ہے ورنہ زہر کھانا پڑے گا، مَیں باہر نہیں نکلتا قرضخواہ تکلیف دیتے ہیں، اشعار سب اچھے ہیں، آفرین ہے جلد جلد خیریت لکھئے بچّوں کو دُعا احباب کو سلام پہنچے" (انشائے داغ صہ ۵۴)

دُوسرا خط ۱۲ر اگست کا لکھا ہوا ہے،

بندہ پرور!

"میں ان دنوں سخت پریشان ہوں خدا رحم کرے دُعا کیجئے، ایک لفافہ کا جواب تو حیدرآباد سے آیا حضور کلام دیکھ کر بہت خوش ہوئے بہت تعریف فرمائی کشیدہ خاطر نہیں ہیں، دُوسرا لفافہ بھی پہنچ گیا ہے جواب ابھی نہیں آیا، میرے چلے آنے کا ان کو جو ملال تھا وُہ رفع ہو گیا، کلدار کی بوچھار ہو تو کام چلے، بچوں کو دُعا، احباب کو سلام پہلی غزل بیچھے بھیجوں گا کہ طبیعت حاضر نہیں ہے"۔

(داغ دہلوی، ۱۲ر اگست ۱۸۹۰ء رانشائے داغ ص ۵۴)

خطوط سوانح عمری کی ترتیب کے لئے بڑا معتبر مواد ہوتے ہیں مگر مُشکل یہ ہے کہ داغ کے خطوط مسلسل نہیں ہیں اور جو بھی ہیں ان میں تاریخوں کی اُلٹ پھیر ہے کیونکہ یہ بڑی ہی بے دردی سے شائع کئے گئے ہیں، داغ کے نام جس وقت تنخواہ جاری ہوئی تو ان سے حیدرآباد آنے اور قیام کرنے کی تفصیل پُوچھی گئی اور انہوں نے ایک فرد اپنے ہاتھ سے لکھ کر مدار المہام کے مُلاحظہ میں پیش کیا، جس میں حیدرآباد آنے اور ساڑھے تین سال تک قیام کرنے کی تفصیل ہے اِس فرد کے آخر میں داغ نے لکھا ہے،

"اِس ساڑھے تین سال کی مدّت میں ایک مرتبہ ہندوستان جانے کا اتفاق اِس طرح ہوا کہ ۳ر شہریور ۱۲۹۹ف رمطابق ۱۲ر جولائی ۱۸۹۰ء) کو بلدہ سے گیا اور خورداد ۱۲۹۹ف (مطابق اپریل ۱۸۹۰ء) کو بلدہ واپس آگیا جس کی مدّت کُل

دس۱۰ مہینے ہے"۔

اِس فرد میں ۷ اپریل ۱۸۸۸ء سے ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء تک ساڑھے تین سال کا حساب خود داؔغ نے بتایا ہے اور خود داؔغ ہی نے جلوۂ داؔغ میں لکھوایا ہے کہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ء مطابق ۶ فروری ۱۸۹۱ء روز یکشنبہ شب کے ۹ بجے لفافہ غزلوں کا حضور کے پاس سے آیا اور اصلاح کا کام شروع ہوا۔

اِس طرح یہ ثابت ہے کہ جمادی الاوّل ۱۳۰۶ھ میں شاہی غزلیں اصلاح کے لئے نہیں آئی تھیں مگر اس کا کیا علاج کہ انشائے داؔغ میں صفحہ ۵۹ سے ۶۱ تک ایک لمبا چوڑا خط نقل ہوا ہے جس کی تاریخ تحریر ۱۸ جمادی الاوّل ۱۳۰۶ھ ہے، اِس میں دو۲ باتیں خصوصیّت سے غور طلب ہیں ایک تو یہ کہ تنخواہ سات سَو روپیہ ہونے کی خبر ہے دُوسری یہ کہ

"یہاں جو کچھ بکتا ہوں وُہ فی البدیہہ ہوتا ہے، یہ دو۲ دو۲ گھنٹے کی فکر ہے جو ملفوف بھیجتا ہوں، حضوری فرمائشات ایسی ہی ہوتی ہیں زبان کا لُطف ہے اور فی الفور اس کی تعمیل کی جاتی ہے، حضورِ پُر نُور کا راضی کرنا مُشکل ہے"۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ اِس خط کی جو تاریخ انشائے داؔغ میں چھپی ہے صحیح ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ داؔغ نے تنخواہ اور حضوری فرمائشات کے متعلق جھُوٹ لکھا ہے لیکن داؔغ کو جھُوٹ لکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور نہ وُہ جھوٹے تھے، تنخواہ سے متعلّق سات سَو روپے کی شُہرت بھی بعد ہوئی۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ خط ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ (۶ فروری ۱۸۹۱ء) کے بعد کی کسی تاریخ کا لِکھا ہوا ہے یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ

ہمارے مولفین اور مصنفین تصنیف و تالیف میں پوری احتیاط کرتے ہیں اور نہ محنت ہی گوارا کرتے ہیں، اِن دونوں خرابیوں کے علاوہ دیانت کا احساس بھی نہیں مَن مانے واقعات لکھ مارتے اور نقل و اقتباس میں بھی خاموشی سے کمی زیادتی کر دیتے ہیں، یہ بے اعتدالی جناب احسن مارہروی کی تھی ان کے لائق فرزند رفیق مارہروی نے تو غضب کر دیا کہ فرضی روزنامچہ گھڑ کر مَن مانے واقعات غلط سلط لکھ کر بنام داغ کے نام سے چھپوا دیا اور اگر پدر نتواند پسر تمام کند کے مصداق باپ کی بے اعتدالیوں کو اپنی بددیانتی سے معراج کمال پر پہنچا دیا، یہ ہے ہمارا تصنیفی معیار!

داغ نے فردِ قیام حیدر آباد میں جو مہینہ حیدر آباد سے جانے کے بعد دوبارہ واپسی کا بتایا ہے وہ اپریل ۱۸۹۰ء ہے اِس کی تصدیق داغ کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو ۲۳ مارچ کو کنور اعتماد علی خاں کو لکھا گیا ہے،

بندہ نواز!

۱۹ کو غزلیں اصلاح شدہ واپس کی گئیں، مَیں لکھ چکا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہفتے کے دن، ۷ شعبان کو حیدر آباد روانہ ہوں گا، حضور پُر نُور کو لکھ بھیجا ہے آج تار آیا ہے کہ تمہارا وہاں ٹھہرنا مناسب اور اچھا نہیں، پھر خط بھی کل آیا، مَیں روپے کے انتظار میں تھا کہ کنور صاحب آدمی کے ہاتھ روپیہ بھیجیں گے آج خط سے معلوم ہوا کہ میرا خط نہیں پہنچا، ہوش جاتے رہے شاید بعد کو پہنچا ہو،

پہنچنا زبان پورب کی ہے، خدا جانے کیا معنی ہیں،

جس قدر جلد ہو سکے بلکہ تار پر یا آدمی کے ہاتھ روپیہ بھیجئے ضرور بالضرور

بنا ہیں میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مارف ۲۵ وہاں کے دینے ہیں اور دو سو میں پہنچ جائیں گا انشاء اللہ یہ سب روپیہ آپ کو پہنچے گا،

مجھ کو جعفر علی خاں نے شادی میں پنڈراول خط بھیج کر آدمی بھیج کر بلایا تھا میں نے صاف انکار کیا،

کرا دماغ کہ از کوئے یار بہ خیزد!

میں چاہتا ہوں کہ وہاں آرام سے پہنچ جاؤں، گرمی کی طرف سے نہایت پریشان ہوں"

داغ دہلوی، ۲۳ر مارچ ۱۸۹۰ء
(انشائے داغ ص۵۶)

حیدرآباد کا دوسرا سفر

۲۳ر مارچ ۱۸۹۰ء کو شعبان ۱۳۰۷ھ تھا اور داغ نے، شعبان تاریخ روانگی مقرر کی تھی اس دن ہفتہ تھا اور ۲۹ر مارچ، غالباً انہیں روپیہ وقت پر مل گیا اور وہ حسب قرار داد، شعبان مطابق ۲۹ر مارچ کو دہلی سے نکل کر تیسری یا چوتھی اپریل کو حیدرآباد پہنچ گئے،

اب کی بار داغ نے محلہ افضل گنج میں محبوب گنج کے کونے پر مولوی ظہور علی وکیل ساکن اٹاوہ کے مکان کے بازو (برابر) والے مکان میں مستقل طور پر قیام کیا، یہ مکان افضل گنج کی نکڑ پر دو منزلہ تھا سامنے سڑک تھی

تھی اِس مکان کا ایک راستہ محبوب گنج کی کمان کے اندر سے بھی، اب اس مکان کے ٹکڑے ہو گئے ہیں مرکک کے حصے پر دُکانیں اور ہوٹل ہیں اور اندرونی حصے میں موٹر کا کارخانہ ہے یہ مکان بنسی لال موتی لال ساہو کا تھا، بڑا وسیع اور خاصی گنجائش تھی در اصل یہ ایک بہت بڑے مکان کے حصے تھے ایک حصے میں ظہور علی تھے دوسرا حصہ داغ نے لے لیا تھا اور جب ملازم ہو گئے تو اس کا ملحقہ حصہ مع اصطبل وغیرہ بھی داغ ہی نے لے لیا اس طرح گویا دو مکان ایک ساتھ داغ نے لے رکھے تھے تقریباً چودہ سال داغ اِسی مکان میں رہے، آخر آخر میں انہوں نے تُرپ بازار کا مکان لیا تھا جہاں انتقال ہوا اِس مکان میں داغ نے بڑے عیش منائے ہیں ؎

اُڑاتے ہیں مزے دُنیا کے ہم اے داغ گھر بیٹھے
دکن میں اب تو فضل گنج اپنی عیش منزل ہے

داغ نے حیدرآباد پہنچتے ہی پھر جد و جہد شروع کر دی حضور بندگان عالی ہنمکنڈہ تشریف لے گئے تھے مراجعت ہوئی تو داغ نے قطعۂ تاریخ پیش کیا ؎

ہوئے زیب بلدہ جو شاہ دکن	ملا دیدہ و دل کو نور و سرور
کہو خیر مقدم کی تاریخ داغ	ہنمکنڈے سے آگئے اب حضور

[۱۳۱۳ھ]

انہیں دنوں نواب میر عثمان علی خاں بہادر کی بسم اللہ یعنی تسمیہ خوانی ہوئی تو داغ نے تاریخ پیش کی ؎

شہزادہ ہوا ہے زیب مکتب	سبحان نہ ہو ثانئ ولیعہد
سورۂ اقراء کی آج سن لی	سلطاں نے زبانئ ولیعہد
اللہ کرے کہ شاہ دیکھے	پیری و جوانئ ولیعہد

دادر مرزا داغ کے ایک دوست تھے جو صرفخاص میں ایک با اختیار

عُہدہ دار تھے انہیں داور الملک خطاب ملا تو داغ نے تاریخ کہی جس کے ہر ایک مصرع سے ۱۳۰۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں ؎

یہ سرافرازی مبارک زیب ہے باعزّ و شاں
سازگار آئے الٰہی متفق لیل و نہار
داغ نے زیبا کہا ہے سال اس بہبود کا
میرزا صاحب ملا ہے یہ خطاب یادگار

مولوی مُشتاق حسین کو بھی اسی سلسلہ میں خطابات سرفراز ہوئے تو ان کی تاریخ بھی کہی ؎

افزایشِ خطاب مبارک زیادہ باد

داغ اُستاد ضرور تھے مگر فنِ تاریخ گوئی میں انہیں کوئی خصوصیت حاصل نہیں تھی کیونکہ انہیں حساب سے دلچسپی نہ تھی اسی لئے تاریخیں بھی اچھی نہ نکل سکتی تھیں مُشتاق حسین، عبدالرزاق وغیرہ کے خطابات کی تاریخیں مشہور ہوئیں تو لوگوں نے چہ می گوئیاں کیں ان دنوں حیدرآباد میں بعض بڑے زبردست تاریخ کہنے والے موجود تھے خصوصاً تراب علی تورؔ کا تو جواب نہ تھا مگر اس سے داغ کی شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا بقول غالب تاریخ گوئی بنیا پن ہے اُسے شاعری سے کیا تعلق ؟

اسی سال یعنی ۱۳۰۰ھ ہی میں حضور شکار کے لئے تشریف لے گئے اور شکارگاہ سے بہیم شیروں کے شکار کی اطّلاع آنے لگی تو داغ نے بھی تاریخیں کہنی شروع کیں چند مادہ ہائے تاریخی یہ ہیں

اچھا شیر مارا شاہِ آصف جاہ نے
بادشاہِ شیر افگن باشکوہ

شاہ آصف نے شیر مارے دو

حیدر آباد میں کوئی شریف آدمی داغ کا مخالف نہ تھا صرف حاسدین اُن سے جلتے تھے جنہوں نے ان تاریخوں کی خوب ہنسی اُڑائی مگر اس سے داغ متاثر ہوئے اور نہ ان کے شاگردوں نے اس پر کوئی توجہ کی چند روز کے بعد یہ چہمی گوئیاں خود بخود ختم ہو گئیں ۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ داغ تاریخ گوئی میں کوئی خصوصیت تو نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی وہ اچھی تاریخیں نکال لیتے تھے یہ جو تاریخیں اُوپر نقل ہوئی ہیں انہیں داغ نے بڑی پریشانی اور بے دلی کے عالم میں کہا ہے کیونکہ وہ دہلی سے بہت تھوڑا روپیہ لائے تھے جو خرچ ہو چکا تھا اس لئے انہیں پریشانی تھی اور شاید دلی سے بھی تقاضا ہو رہا ہو بہر حال انہیں پریشانیوں میں داغ اچھی تاریخیں نہ نکال سکے کیونکہ ع

پراگندہ روزی پراگندہ دل

بنے ہوئے تھے ، یہ پریشانی اور نا امیدی انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ ۲۶ رجمادی الثانی ۱۳۰۸ھ مطابق ۸ر فروری ۱۸۹۱ء روز یکشنبہ رات کے نو بجے حضور کی غزل پہلی بار مُہر زدہ لفافے میں بند کی ہوئی چوبدار کے ذریعہ آئی اور صبح (دُوسرے روز) آٹھ بجے حاضر و باریاب ہونے کا حکم ملا داغ نے اسی وقت اصلاح دے کر غزل واپس کر دی اور دُوسرے روز حاضر دربار ہو کر نذر پیش کی اس کے بعد سے باقاعدہ اصلاح کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔

گو تنخواہ مقرر ہوئی اور نہ سکہ حالی کی بوچھاڑ ہوئی مگر چونکہ اصلاح کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اس لئے داغ مطمئن ہو گئے اور وقار الملک مولوی مُشتاق حسین سے کہہ کر فی الحال مدار المہام کی منظوری سے پانچسو روپے نقد

بر عنوان دست گردان (مبادلہ) وصول کر لیا، چھ مہینے تک غزلیں آتی رہیں ماہ محرّم شروع ہوا تو غزل گوئی اور اصلاح دونوں موقوف ہو گئے کیونکہ حضور غفران مکاں محرّم میں غزل گوئی ترک فرما دیتے تھے اِس تعطل نے داغ کو پریشان کر دیا اور انہوں نے ۳۰ محرّم ۱۳۰۹ھ (مطابق ۵ ستمبر ۱۸۹۱ء) کو نواب وقار الملک کو چٹھی لکھی:۔

"جناب نواب صاحب عالی مناصب مخدوم مکرّم و محتشم سلامت! تسلیم آج ماہ محرّم تمام ہوا یقین ہے کہ کل سے میری نذر کا موقع ملے گا لفافہ معمولی جو آٹھویں دسویں دن بحضور اعلیٰ حضرت دام اقبالہ مع غزل اور عرضداشت کے جاتا ہے ایک مہینے سے نہیں گیا، ڈر رہا ہوں، کل سے مجھ کو خرچ کی ضرورت بھی ہو گی، آپ کو اگرچہ میں یاد ہوں مگر کثرت کار بھی بعض امور کو ضروری نہیں سمجھنے دیتی میں عرض حال سے زیادہ آپ کے مژدۂ صحت کا طالب ہوں، صبح کو آپ کے دربار میں موقع سخن محال ہے سہ پہر کو حضوری کے واسطے اجازت طلب ہوں زیادہ نیاز

مُلتمسہ

نواب مرزا داغ دہلوی عفا عنہ

(انشائے داغ ص ۳۷-۳۸)

وقار الملک سے داغ کے خاصے مراسم تھے مگر ان مراسم اور تعلّقات کی شہرت نہیں ہوئی کیونکہ دونوں محتاط تھے، سیاسی نقطۂ نظر سے دونوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا ہی مناسب تھا، معلوم ہوتا ہے کہ یکم صفر کو دونوں کی ملاقات ہوئی اور وقار الملک نے ۲ صفر کو مدار المہام بہادر سے

عرض کر کے یہ حکم جاری کرا دیا جو داغ کی مسل (فائل) میں موجود ہے،
معتمد صاحب پ و ف[1]

"داغ صاحب کو پانچ سو (۵۰۰) روپئے پہلے رائے نرسنگ راؤ جی کے پاس سے پہنچائے گئے تھے وہ رائے صاحب کے پاس بھیج دئے جائیں اور ایک ہزار روپیہ حالی اور بطور مدد خرچ کے داغ صاحب کے پاس بھیج دئے جائیں ان کی تنخواہ کا تصفیہ بھی متعاقب ہوتا ہے"۔

۲ صفر ۱۳۰۹ھ

یہ ایک ہزار روپیہ کا چک مراسلہ ۱۹۰۱م ۳ صفر ۱۳۰۹ھ (۸ ستمبر ۱۸۹۱ء) کے ساتھ داغ کے پاس بھیجا گیا۔

تقرر

اِس طرح داغ کی تنگ دستی دُور ہوئی اور اُن پر فتوح کا دروازہ کھُل گیا اور ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو معتمد پولٹیکل فنانس کا حکم صدر محاسب کے نام جاری ہُوا کہ

"سرکار نے یہ منظور فرمایا ہے کہ داغ صاحب کی تنخواہ یکم خورداد ۱۲۹۷ف سے چار سو پچاس (۴۵۰) روپیہ حالی کے حساب سے

---

[1] اُن دنوں پولٹیکل سکرٹری ہی کے تفویض مالیہ یعنے فنانس تھا اس لئے معتمد پولٹیکل و فنانس لکھا جاتا تھا۔ ۱۲

جاری کی جائے اور پندرہ ۱۵۰۰ سو روپیہ پیشگی جو پہنچے ہیں وہ مجرا کر لئے جاویں پس حسبہ تعمیل ہو اور ابتدائے خورداد ۱۲۹۷ف سے لغایتہ آبان ۱۳۰۰ف تین سال چھ ۶ ماہ کا بقایا ادا کیا جاوے اور آئندہ بھی یہی تنخواہ جاری رہے اصلی حکم دستخطی سرکار ملفوف ہے بعد کارروائی واپس ہووے"۔

پہلا بقایا

داغ کو پہلا بقایا ساڑھے تین سال کا بحساب ساڑھے چار سو روپئے ماہوار مبلغ اٹھارہ ہزار نو ۹۰۰ سو روپیہ نقد ایصال طلب تھا جس میں سے پیشگی ایصال شدہ پندرہ ۱۵۰۰ سو روپیہ وضعات کر کے مبلغ سترہ ہزار چار سو روپیہ نقد ادا کیا گیا،

اتفاق سے والد مرحوم (تجلّی) داغ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے یہ رقم پہنچی اُن دنوں نوٹ تو تھے نہیں روپیہ ہی تھا، خزانہ عامرہ سے رقم کی تھیلیاں بنڈی میں ڈال کر لائی گئیں جب یہ تھیلیاں بنڈی سے اُتار کر سامنے ڈھیر کر دی گئیں تو انہیں دیکھ کر داغ کی عجیب حالت ہو گئی آنکھیں بھر آئیں جسم میں رعشہ سا محسوس ہونے لگا اور وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بولنے لگے ٭

اُس شخص کی حالت کا اندازہ کیجئے جو ستّر اسّی روپیہ ماہوار پر اپنی ساری زندگی گزار چکا ہو جو بال بال قرضوں میں بندھا ہوا ہو اور مدت تک

بڑی ہی تنگ دستی سے بسر کرتا رہا ہو اور ساڑھے تین سال سے صرف اُمید پر اُدھار رکھا رہا ہو جب اُس پر خدا کا فضل اِس طرح ہو جائے کہ ہنڈی بھر روپیہ گھر آئے تو کتنی خوشی نہ ہوئی ہوگی،

والد مرحوم فرماتے تھے کہ اُستاد کی یہ کیفیت دیکھ کر میں بھی متاثر ہو گیا اور مجھے ڈر ہونے لگا کہ کہیں ازدیادِ مسرت سے اُستاد کو شادی مرگ کی کیفیت نہ پیدا ہو جائے اِس لئے میں نے اُن کا دھیان بٹانے کے لئے پہلے تو مُبارکباد دی اور پھر مٹھائی کا مطالبہ کیا، تب کہیں اُستاد چونکے اور سلسلۂ تخیّل کو ختم کر کے کہا تُم لوگوں کی دُعائیں قبول ہوئیں خداوند عالم نے فضل فرما دیا مٹھائی ضرور منگوانی چاہیئے چنانچہ اپنا صندوقچہ منگوایا تو میں نے عرض کی اُستاد! اِس تنخواہ کی رقم سے مٹھائی منگوانی چاہیئے چنانچہ اُستاد نے رقم شمار کی دو دو ہزار کی آٹھ تھیلیاں اور ایک ہزار کی ایک تھیلی تھی ان سب کا ڈھیر تو ذرا دیکھ کر الگ رکھ دیا پھر چار سو روپیہ جو الگ تھا اِس کو گن کر اسی میں سے پانچ روپئے نکال کر ملازم کو مٹھائی لانے کے واسطے دئیے تھوڑی دیر کے بعد مٹھائی آ گئی، اس پر فاتحہ دلوائی گئی، اِس وقت تک شاگرد اور آ گئے اور سبھوں نے مٹھائی کھائی اور بعض لوگوں کے گھروں پر بھی بھجوائی گئی اُن دنوں بہترین خاصہ کی مٹھائی پانچ روپے کو من بھر (بارہ سیر) ملتی تھی"۔

والد مرحوم یہ بھی فرماتے تھے کہ بقایا ملتے ہی داغ نے دہلی کو ہنڈی بھجوائی، جوڑی (بگھی) خریدی اور ضروریات کی دوسری چیزیں فرش، فرنیچر، چھپر کھٹ وغیرہ بنوائے اور متعلقین کو بھی بُلوا لیا اور امیرانہ ٹھاٹھ شروع ہو گئے، داغ نے روپے کا صحیح مصرف جان لیا تھا چنانچہ انہوں نے

کہا ہے ؎

دُنیا کا مال اور ہے کس کام کے لئے　　کرتا ہے خرچ آدمی آرام کے لئے

روپیہ جتنی سہولتیں مہیا کر سکتا تھا داغ نے سب حاصل کیں اور بڑے ہی طمطراق سے زندگی بسر کرتے رہے مگر ان میں کمال یہ تھا کہ جو لوگ ان کی تنگ دستی اور پریشان حالی کے زمانے میں ان کی خدمت کرتے رہے اور دامے درمے، قدمے سُخنے ان کی مدد کی جن سے شروع سے بے تکلف تھے اُن لوگوں سے ملنے جُلنے میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا اُسی طرح ملتے جُلتے رہے جس طرح کہ پہلے ملتے تھے والد مرحوم سے داغ کی مُلاقات ان کے حیدر آباد آنے کے ایک آدھ روز بعد ہوئی تھی اور وہ مسلسل ملتے رہتے تھے چُنانچہ یہ سلسلہ داغ کے انتقال تک جاری رہا، ان کے علاوہ رنج، الم، بارق، خلق وغیرہ بھی داغ کے پُرانے دوست اور شاگرد تھے اور ان سبھوں سے داغ بڑی وضع داری نباہتے تھے۔

محمد علی خاں ناظم اور رضی الدین حسن کیفی بھی داغ کے شاگرد تھے مگر یہ دونوں داغ کے فصیح الملک بننے کے بعد شاگرد ہوئے تھے، ناظم کو ان کے ماموں نواب صولت جنگ عابد نے لے جا کر اور کیفی کو میرے والد نے لے جا کر داغ کا شاگرد بنایا تھا، یہ دونوں بھی والد مرحوم کے بے تکلف دوست اور میرے اُستاد تھے ان دونوں بزرگوں نے ہمیشہ داغ کی عالی حوصلگی، شرافت، پابندیٔ وضع، بلند اخلاقی کی تعریف کی اور سیکڑوں قصّے سُنایا کئے۔

دولت کا نشہ بُرا ہوتا ہے، حیدر آباد میں ایسے تماشے بہت نظر آئے، ہوش بلگرامی اور قاضی عبد الغفار اور دوسرے کئی حضرات کے

تماشے خود میری آنکھیں دیکھ چکی ہیں ان کے مقابلے میں داغ کے حالات جو سنتا ہوں تو ان کی شرافت کا قائل ہونا پڑتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ داغ واقعی نہایت پابند وضع تھے اور انہوں نے بڑی آن بان اور رکھ رکھاؤ سے اپنی زندگی گزاری ؎

یہ آپ جانیں داغ میں جو ہیں برائیاں | اتنا تو ہم کہینگے بڑا وضع دار ہے

متعلقین کی آمد

نومبر یا دسمبر ۱۸۹۱ء میں داغ نے اپنی بیوی۔ بیٹی اور نواسے کو حیدر آباد بلالیا، ان لوگوں کے آنے کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہوسکی، والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "استاد نے تنخواہ کی اجرائی کے دوسرے تیسرے مہینے ہی میں گھر والوں کو بلالیا تھا" البتہ انشائے داغ میں (صفحات ۶۲-۶۳) داغ کا ایک خط کنور اعتماد علی خاں کے نام نظر آتا ہے جو سلخ محرم ۱۳۱۰ھ (۲۴ اگست ۱۸۹۲ء) کا لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناصر اور لاڈلی بیگم حیدر آباد سے دلی۔ انبالہ واپس ہوئیں خط چونکہ دلچسپ ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے،

جناب من!

"شکر ہے بخیریت ہوں، ضعف معدہ کی شکایت ہے، پرسوں ناصر الدین احمد طال اللہ عمرہٗ مع اپنی والدہ کے حسب الطلب اپنے والد کے دلی انبالہ روانہ ہو گئے اس وقت تک رسید کا

تار نہیں آیا، پریشان ہوں، انہیں سے دِل لگی تھی کیا کہوں اِن پر جو کچھ گزر رہی ہے خصوصاً تمہاری اُستانی ماہیٔ بے آب ہو رہی ہیں اگرچہ ان لوگوں کے یہاں آنے میں اور رہنے میں اور جانے میں زرِ کثیر صرف ہوا بہت زیر باری ہوئی مگر دل لگی جاتی رہی، تمہاری اُستانی صاحبہ کو بھی روانہ کرتا مگر ان کے جانے میں ایک ہزار رو . . یہ چاہیئے کہ عزیز و اقارب کے لئے سوغات جاتی نیاز و دعوت کرنی تھی اس لئے بھیج نہ سکا میرا وہ حال ہے جو سعد آباد میں تھا۔"

"آجکل اعلحضرت کو شعرِ سخن کی طرف کامل توجہ ہے یہ مصرع طرح کا ہے

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

"پڑی گڑی لڑی قافیہ ہے میں نے ۲۴ شعر ایک دن میں کہے مگر حضور پر نور نے ۱۱۲ شعر کی چار غزلیں کہیں، بہت اچھی طبیعت پائی ہے، تمام شہر نے اس میں غزل کہی ہے لکھنؤ تک سے غزلیں چلی آ رہی ہیں"۔

"میں اپنی ترقی کی بہت خبریں سُنتا ہوں یہاں تو خدا پر قناعت ہے ابوالحمید[1] آزاد آپ کے شاکی ہیں ان کے خط کا جواب آپ نے نہیں لکھا، میری طرف اور میرے گھر کی طرف سے بچوں کو دُعا کہنا اور پیار کرنا دہاں کی بارش کا حال لکھو یہاں خوب بارش ہے" (۲۴ راگست ۱۸۹۲ء)

---

[1] ان کا نام ابوالحمید آزاد تھا اس قصہ میں عبدالحمید چھپا ہے جو کتابت کی غلطی ہے، ۱۲

خطابات

۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) میں حضور کی سالگرہ کی تقریب میں خطابات سرفراز ہوئے اور داغ بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک نواب مرزا خاں بہادر ہو گئے۔ شاہان مغلیہ اور آصفیہ کا یہ دستور تھا کہ پہلے خانی اور بہادری کا خطاب سرفراز کرتے پھر جنگی خطاب اس کے بعد دولہ اور اس کے بعد ملک کا خطاب سرفراز ہوتا تھا مگر بعض خاص اور ممتاز لوگوں کے لئے یہ ترتیب نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ساتھ پورے خطابات سرفراز ہوتے تھے چنانچہ خوش قسمتی سے داغ کو بھی اسی طرح ایک ساتھ پورے خطابات سے معزز و مفتخر کیا گیا۔

خطابات کے سرفراز ہوتے ہی سب سے پہلے داغ نے مہر کھدوائی کیونکہ سرکاری غزلوں کی اصلاح کے بعد جو لفافہ حضور میں بھیجا جاتا تھا اسے بند کر کے لاکھ کی مہر لگائی جاتی تھی، یہ مہر نواب لقمان الدولہ نے اپنی مہر کے ساتھ کھدوا دی تھی جسے حیدر آباد کے مشہور مہر کن غیاث الدین نے کندہ کیا تھا، اس کے بعد داغ نے دہلی سے بھی ایک مہر کندہ کرا کر منگوائی تھی جو عقیق پر تھی اور محمد علی خاں ناظم نے ان دونوں مہروں کو دیکھا تھا اور انہوں نے ہی یہ تفصیل مجھے بتائی تھی۔

مہر کے ساتھ ہی ساتھ داغ نے مانوگرام بھی بنوالیا تھا جو حیدر آباد ہی میں بنایا گیا تھا طغرا میں فصیح الملک بہادر داغ دہلوی اور انگریزی عبارت رقیمے میں بھی یہی تھی یہ مانوگرام عام طور پر استعمال کرتے تھے جو ان کے

بیشتر خطوط پر نظر آتا ہے،

درجہ اعلیٰ کا درباری یونی فارم بھی داغ نے اُسی زمانے میں بنوایا اور اس کے بعد ہی سے استعمال کرنے لگے داغ کی بیشتر تصویریں اسی درباری یونی فارم میں ہیں جو عام ہیں، یہ درجہ اعلیٰ کا یونی فارم تھا جو مخصوص تھا امراء اور وزیروں کے لئے،

اضافۂ تنخواہ

خطابات سے سرفراز ہونے کے بعد تنخواہ میں اضافہ ہوا، داغ کی مسل (فائل) میں مراسلہ ۲۳۶۳ مورخہ ۷ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (۸ ستمبر ۱۸۹۴ء) نظر آتا ہے جو منجانب نواب اعظم یار جنگ معتمد مال و فینانس جاری ہوا ہے جس کی عبارت یہ ہے،

"فصیح الملک بہادر داغ صاحب دہلوی کی ماہوار سابقہ ساڑھے چار سو روپیہ پر ساڑھے پانچ سو روپیہ کا اضافہ کیا گیا، لہٰذا ایک ہزار روپیہ ماہوار کے حساب سے تاریخ تقرر سابقہ سے جاری کیا جاوے اور یہ رقم بقایا اور ماہوار آئندہ ماہ بماہ رقم داخل حضور پُرنور کے ساتھ یہ رقم بھی علاوہ ماہوارات مقررہ صرفِ خاص میں ارسال کی جائے اور رقم بقایا آج ہی ارسال کر دی جائے"،

اس اضافے کی تاریخ داغ نے کہی ہے ؎

ہوگیا میرا اضافہ آج دونے سے سوا
اس ترقی کی کہوائے داغ یہ تاریخ تم

یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
ابتدا سے اپنی ساڑھے پانچسو نقدی بڑھی
۱۳۱۲ھ

دوسرا بقایا

دوسرے اضافے کا بقایا بھی تاریخ ورود حیدرآباد سے دلوایا گیا اور مبلغ بیالیس ہزار آٹھ سو روپیہ نقد ملا، اس طرح داغ کو پہلے اور دوسرے بقایا کی جو رقم یکمشت ملی ساٹھ ہزار دو سو روپئے سکۂ محبوبیہ (حالی) تھی، اس دوسرے بقایا سے متعلق احسن مارہروی نے اپنے منتخب داغ کے مقدمے (ص ـــ) پر لکھا ہے۔

"اس ایک ہزار کا حساب بھی امیدواری کے زمانے سے کیا گیا جس کی تعداد چالیس اکتالیس ہزار ہوئی، جس کو مرزا داغ نے یہ عذر کرکے کہ میرے پاس اتنی رقم رکھنے کی جگہ کہاں، شاہی خزانہ میں رکھوا دیا۔"

یہ مقدمہ احسن نے ۲۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو لکھا ہے، جلوۂ داغ انہوں نے داغ کی زندگی ہی میں لکھی جو داغ کی لکھوائی ہوئی تھی مگر اس میں دوسرے بقایا کے شاہی خزانے میں محفوظ کرائے جانے سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ہے، البتہ احسن نے خمخانۂ جاوید میں داغ کا حال مرتب کرکے دیتے ہوئے داغ کے انتقال کے وقت خزانۂ شاہی میں داغ کو عطا شدہ تحفے اور رقوم کا جمع رہنا ضرور لکھوایا ہے مگر اس میں نقد رقم یا اس بقایا کا ذکر نہیں ہے، مجھے حیرت ہے

کہ جلوۂ داغ کی ترتیب کے وقت احسن کو یہ بات یاد آئی اور نہ دُوسرے مضامین کے لکھتے وقت یاد آئی جو وُہ مسلسل داغ پر لکھتے رہے صرف مُنتخب داغ کا مقدّمہ لکھتے وقت ان کو اس کا خیال آیا، مَیں یہ تو نہیں سمجھ سکتا کہ احسن نے خواہ مخواہ جھوٹ لکھا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ انہیں تسامح ہوا ہے۔

مَیں نے اپنے والد اور دُوسرے بزرگوں سے جو اُن دنوں داغ کے پاس آتے جاتے تھے یہی سُنا ہے کہ داغ نے دُوسرا بقایا حاصل کرنے کے بعد بگھی کی جوڑی کے گھوڑوں کی موجودگی میں سواری کے لئے دو۲ گھوڑے خریدے اور بیشتر چیزیں لیں اور ایک کثیر رقم بیوی کو دے کر نیاز ادا کرنے کے لئے دہلی بھجوایا اور عزیز اقارب کے اور دوستوں کے لئے سوغات بھیجی، چنانچہ انشائے داغ میں محمود خاں محمود رامپوری کے نام داغ کا ایک خط نظر آتا ہے جس میں لکھا ہے،

"مَیں یہاں تنہا رہ گیا ہوں متعلّقین دِلّی گئے ہیں"

یہ خط ۲۰ رمئی ۱۸۹۴ء کا لکھا ہوا ہے (انشائے داغ ص۱۰۹) اور داغ کو دُوسرا بقایا ملا ہے ستمبر ۱۸۹۴ء میں معلوم ہوتا ہے کہ داغ کے متعلّقین ستمبر سے پہلے دہلی سے واپس ہو گئے تھے اور داغ نے بقایا ملنے کے بعد پھر انہیں دہلی بھجوایا ہے۔

عظیم اللہ نامی ایک صاحب داغ کے پاس بہت آتے جاتے تھے ابتداً انہوں نے حیدر آباد میں عطر فروشی کی چنانچہ اسی سلسلہ میں داغ کے پاس آنے جانے لگے اور داغ کے دوستوں اور شاگردوں سے بھی ان کے مراسم بڑھ گئے چونکہ وہ عطر کے علاوہ اور چیزیں بھی بیچا کرتے تھے اس لئے داغ اُن سے بیشتر چیزیں منگوایا کرتے تھے، آخر زمانے میں عظیم اللہ کا کاروبار

خراب ہوگیا تھا اِس لئے قفلیاں بیچنے لگے تھے جب گھومنے پھرنے سے عاجز آگئے تو دَورے کرنے لگے تھے تھوڑا سا عطر لے کر حیدر آباد سے نکلتے اپنے ملنے والوں کے پاس پہنچ جاتے اُن کے مہمان رہتے اور انہیں کے دوستوں ملنے والوں میں یہ عطر بیچ کر لوٹ آتے چنانچہ جب ہم لوگ گلبرگہ پہنچے تو عظیم اللہ گلبرگہ آنے لگے سال میں ایک دو دَورے گلبرگہ کے کر لیتے اور ہزار بارہ سَو روپے کا عطر بیچ کر واپس ہو جاتے تھے چونکہ ہمارے مہمان رہتے اور ان کے عطر کی نکاسی میرے دوستوں اور مُلاقاتیوں کے ذمّہ ہوتی اِس لئے مجھ سے زیادہ مانوس ہوگئے تھے زیادہ وقت میرے پاس ہی گزارتے اور داغ کے قصّے سُنایا کرتے تھے چنانچہ دُوسرا بقایا ملنے کے بعد داغ نے جو سوغات اور تحائف دوستوں اور عزیزوں کے لئے حیدر آباد سے خرید کر بھجوائے وُہ عظیم اللہ ہی کے ذریعہ خریدے گئے تھے جس کی تفصیل وُہ سُنایا کرتے تھے چنانچہ ان کا بیان تھا کہ اورنگ آبادی ہمرو کے تھان ایک ہزار روپے سے زیادہ کے داغ نے منگوائے اور حیدر آباد کے بنے ہوئے زیورات اور دوسری مصنوعات بھی دو ڈھائی ہزار روپئے کی خریدیں اِس طرح تقریباً چار پانچ ہزار روپے کے تحائف بیوی کے ساتھ وطن بھجوائے تھے؛

پہلا بقایا داغ کے قرضوں کی ادائی اور بعض ضروری چیزوں کی خریدی ہی میں ختم ہوگیا تھا اسی دُوسرے بقایا سے انہوں نے یہ تحائف بھجوائے ہوں گے،

احسن مارہروی کی سمجھ میں بیشتر باتیں نہ آسکیں اور انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق لکھ کر قصّہ ختم کر دیا چنانچہ جلوۂ داغ میں انہوں نے لکھا ہے "اب تک آپ (داغ) کو محلات شاہی کی کچہری سے جو صرف خاص سے

متعلق ہے ایک ہزار روپے سکہ حالی ماہوارات خاص کی مد
سے ملتے رہتے ہیں" (جلوۂ داغ صفحہ ۴۹)

اس عبارت نے مجھے بھی چکرا دیا تھا اور میں نے دفتر محلات صرفخاص کا ریکارڈ اسی کی خاطر دیکھا مگر مجھے کہیں بھی کوئی اندراج داغ کی تنخواہ کی اجرائی کے متعلق ملا اور نہ صرفخاص اور تقسیم محلات کی برآوردات میں داغ کا نام نظر آیا پھر جو غور کیا تو "ماہوارات خاص" پر شبہ ہوا کہ یہ صیغۂ منصب کی تنخواہ ہونی چاہیئے چنانچہ میں نے دیوانی کے ریکارڈ کی چھان بین کی تو مجھے داغ، خورشید عالم، ناصر اور لاڈلی بیگم کی تنخواہوں کی مسلیں (فائلز) مل گئیں ⁂

واقعہ یہ ہے کہ داغ کی تنخواہ دیوانی (حکومت سرکار عالی) کے موازنے (بجٹ) سے جاری ہوئی اور اضافہ بھی اسی مد سے ہوا، البتہ اضافہ کے وقت حضور نے یہ تحریر فرما دیا کہ

"آئندہ ماہ بماہ یہ رقم صرفخاص میں ارسال کر دی جائے اور وہاں سے ایصال ہوا کرے"

"رقم داخل حضور پُر نور کے ساتھ یہ رقم بھی ایصال کی جائے"

چنانچہ خزانۂ دیوانی سے صرفخاص کی رقوم کے منجملہ داغ کی تنخواہ بھی صرفخاص میں بھجوا دی جاتی تھی اور وہاں سے دفتر تقسیم محلات کے ذریعہ داغ کو ایصال ہوتی تھی، صرفخاص سے اس تنخواہ کا کوئی تعلق نہ تھا حضور نے یہ طریقہ اس لئے پسند فرمایا تھا کہ داغ کے شاہی تعلق کی خصوصیت قائم رہے ⁂

مہتابِ داغ

حیدرآباد میں مُلازم ہوتے ہی داغ نے ایک خوشنویس کو مُستقل طور پر مُلازم رکھا تھا، جس کا کام دیوان کو صاف کرنا تھا، آفتابِ داغ کی ترتیب کے بعد سے داغ نے جو کچھ کہا تھا وہ محفوظ تھا جسے انہوں نے ازسرِنو مرتب کرکے ملازم کاتب سے چھپوائی کے لئے کتابت شروع کرادی یہ کتابت وسط ۱۳۰۹ھ میں شروع ہوئی اور ۳ رجمادی الثانی ۱۳۱۰ھ مطابق ۲۳ ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو مکمّل ہوئی اور مطبع عزیز دکن چھتّہ بازار حیدرآباد میں طباعت ہوئی ⁂

داغ پہلے شاعر ہیں جنہیں مُستقل طور پر کاتب کو مُلازم رکھ کر اپنی نگرانی میں دیوان کی کتابت کراکر چھپوانے کی سہولت نصیب ہوئی، ان سے پہلے کسی شاعر کو یہ توفیق ہوئی اور نہ اتنی فراغت نصیب ہوئی کہ کاتب کو مُلازم رکھ کر کتابت کرا سکے ⁂

اِس دیوان میں ۲۹۲ غزلیں ہیں جن کے کُل ۴۱۷۶ شعر ہیں، رُباعیات ۱۹، مخمس ۲ (۱۷ بند) قصائد ۶ (۵۱۰ شعر) قطعات ۳۷ (۲۳۰ شعر) غیرتاریخی قطعات ۴ (۴۶ شعر) سہرے ۴ (۴۰ شعر) سلام ۲ (۳۳ شعر) اور ۱۲۰ متفرق اشعار ہیں اس طرح یہ دیوان ۵۳۱۸ شعر کا مجموعہ ہے ⁂

داماد کا انتقال

داغ نے جلوۂ داغ میں اپنی آغوشی بیٹی اور داماد سے متعلق ایک لفظ بھی نہیں

لکھوایا ہے اور نہ داغ کے دوسرے سوانح نگاروں نے اِس طرف توجہ کی ہے، قبل ازیں ہم نے عرض کیا ہے کہ داغ نے اپنی سالی کی لڑکی لاڈلی بیگم کو گود لیا تھا جن کی شادی مرزا ممتاز الدین احمد خاں سے کی تھی جو نہالہ میں غالباً تعلیمات کے انسپکٹر تھے جنھوں نے اکتوبر یا نومبر ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا اس حادثہ کے متعلق داغ نے ایک خط صبا سہسوانی کے نام لکھا ہے،

"مرزا ممتاز الدین احمد خاں جو میرا خویش تھا اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کا پوتا تھا بعمر ۲۴ سال انتقال کر گیا، یہ صدمہ مجھ کو پیرانہ سالی میں غضب کا ہوا اس کو بھی تین مہینے گزر گئے"

(مکتوب داغ مورخہ ۱۳ فروری ۱۸۹۳ء مطبوعہ آجکل دہلی دسمبر ۱۹۵۷ء)

ممتاز الدین احمد خاں، سراج الدین احمد خاں سائل کے بھائی تھے ان کے انتقال کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو حیدرآباد بلا لیا تو سائل ہی انہیں ساتھ لے آئے اور حیدرآباد پہنچنے کے بعد داغ نے بڑی ہی خاموشی سے لاڈلی بیگم کا عقد ثانی سائل سے کر دیا، اِس محفل عقد میں داغ کے صرف چند مخصوص احباب اور شاگرد شریک تھے۔

سراج الدین احمد خاں سائل کو ایک رقم گزارے کی لوہارو سے ملتی تھی اس لئے داغ نے لاڈلی بیگم اور ان کے بیٹے ناصر الدین احمد خاں کی تنخواہ کے لئے حضور میں ایک معروضہ پیش کیا اور اتفاق سے فوراً ہی حضور نے اس پر توجہ فرمائی اور فرمان جاری فرما کر داغ کو بھی ایک سرفراز نامہ روانہ فرمایا جس کی نقل پیش کی جاتی ہے۔

سردار ویلا

فصیح الملک بہادر

"آپ کے نواسے کی ماہوار چار سو روپیہ اور آپ کی دُختر کی ماہوار تین سو روپیہ حالی منصب دیوانی سے اجرا ہونے ہیں نے ابھی وقارالامراء بہادر کو لکھ دیا ہے انشاءاللہ جلد اجرا ہو جائیں گے"

۳۰ رجب المرجب ۱۳۱۲ھ

اجرائی تنخواہ کی مسل میں مدارالمہام بہادر کا یہ حکم موجود ہے،

"حسب الحکم بندگان عالی فصیح الملک داغ دہلوی کے نواسے کے نام چار سو روپیہ اور دُختر کے نام تین سو روپیہ حالی اسی ماہ سے سررشتۂ منصب سے جاری کیا جائے"

اس حکم کی نقل بھیج کر معتمد فینانس ومال نے ذریعہ مراسلہ ۱۸۱ مورخہ ۱۶ ارفروری ۱۳۰۴ف (۱۸ ارفروری ۱۸۹۵ء) صدر محاسب سرکار عالی کو لکھا ہے کہ

"نواب موصوف (داغ) کے نواسے کا نام مرزا ناصرالدین احمد خاں ولد مرزا امتیاز الدین احمد خاں اور دُختر کا نام لاڈلی بیگم ہے اور یہ ماہوار منصب یکم اسفندار ۱۳۰۴ف سے جاری کی جائے"

بدنصیبی سے ہمیں داغ کا وہ معروضہ جس کی بنا پر تنخواہوں کی اجرائی کا فرمان ہوا ہے نہ مل سکا ورنہ تفصیلات معلوم ہوتیں کیونکہ ان تنخواہوں کے متعلق حیدرآباد میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مشہور ہے کہ داغ نے اپنی تنخواہ میں سے ان دونوں تنخواہوں کی اجرائی کرائی تھی چنانچہ اسی حکایت کو ایک صاحب نے نمک مرچ لگا کر بڑی ہی چٹ پٹی بنا کر مشہور

کر دیا تھا جسے سُن کر مَیں نے اپنے ایک مضمون "داغ اور نظام" مطبوعہ ماہنامہ الحمراء لاہور مئی ۱۹۵۶ء میں یہ تفصیل لکھی ہے جس کا مجھے بے انتہا افسوس ہے اب جو یہ ریکارڈ ملا تو اِس کا احساس ہوا، ممکن ہے کہ یہ حکایت اِس حد تک درست ہو کہ داغ نے اپنی علالت کے زمانے میں کوئی معروضہ پیش کیا ہو کہ مَیں علیل ہوں اور عمر بھی خاصی ہو گئی ہے ممکن ہے کہ اس بیماری سے جانبر ہو سکوں اس لئے میری بیٹی اور نواسے کی پرورش کا انتظام فرما دیا جائے، جس کی بنا پر یہ تنخواہیں حضور نے جاری فرمائی ہوں ؛

اکثر لوگوں نے داغ کی بیٹی اور نواسے کی تنخواہ کو داغ ہی کی تنخواہ کا اضافہ تصوّر کر کے داغ کی تنخواہ پندرہ سو بتائی ہے چنانچہ اسی غلط فہمی کی وجہ سے رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اُردو (ترجمہ) عسکری میں لکھا ہے

"یہ مشہور ہے کہ ان کی تنخواہ پندرہ سو روپیہ ماہوار ہو گئی تھی"

(صفحہ ۴۵۴)

بیوی کی وفات

داغ کو اپنی بیوی سے بڑی محبّت تھی اور وُہ تھیں بھی بڑی ہی نیک افسوس ہے کہ ان کی انتقال کی صحیح تاریخ نہ مل سکی مرحومہ کے مزار پر داغ کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ کندہ تھا مگر اب وہ کتبہ اب نہیں ہے معلوم نہیں کسی نے نکال لیا یا خود ہی خراب ہو کر نکل گیا ؛

انشائے داغ میں ایک خط احسن مارہروی کے نام یکم صفر ۱۳۱۶ھ

(۲۱ر جون ۱۸۹۶ء) کا لکھا ہوا ہے،

"میرے گھر میں سخت علالت ہے اطبّا نے جواب دے دیا ہے کوئی دوا راس نہیں آتی خُدا جواب نہ دے۔" (انشائے داغ ص۱۴۵)

معلوم ہوتا ہے کہ اسی بیماری میں داغ کی بیوی نے انتقال کیا جنہیں درگاہ یُوسف صاحبؒ، شریف صاحبؒ میں دفنایا گیا، بیوی کے انتقال کا صدمہ داغ کو بہت ہُوا چنانچہ انہوں نے مدّتوں سوگ منایا ہے، سجادہ صاحب بیدر کو ۲ر محرم ۱۳۱۷ھ (۱۳ر مئی ۱۸۹۹ء) کو لکھا ہے۔

"مَیں علیل رہا ہوں اور اب بھی ہوں مزید علیہ اپنی اہلیہ کے ماتم میں مُبتلا ہوں۔"

۹ر رمضان ۱۳۱۷ھ (۱۳ر جنوری ۱۹۰۰ء) کو دیبی پرشاد مائل کو لکھا ہے،

"مَیں حضور بندگان عالی کے ہم رکاب سفر میں ہُوں ۱۴ مہینے گزرے کہ میری اہلیہ کا اِنتقال ہو گیا ہے میرے حواس بجا نہیں نہایت صدمہ اُٹھایا۔" (انشائے داغ ص۱۲۲)

۲۲ر نومبر ۱۹۰۳ء کو اولیا بیگم کو لکھا ہے،

"..... تمہاری آپا کے مرنے سے نہایت تکلیف میں مُبتلا ہوں۔" (انشائے داغ ص۴۷)

غرض مدّت تک یہ سوگ رہا ہے۔

خورشید عالم کی تنخواہ

مرزا خورشید عالم سے داغؔ کو بہت اُنس تھا اور وہ بھی داغ سے بڑی محبّت کرتے تھے، مرزا خورشید عالم کی بے سروسامانی پر داغ کڑھتے رہتے تھے، ۱۵ ر نومبر ۱۸۸۰ء کو نواب خلد آشیاں رامپور کی خدمت میں داغ نے ایک معروضہ پیش کیا تھا:-

"مرزا خورشید عالم بھی مستحق پرورش ہیں اگر صیغۂ زکات ہی میں سے پندرہ[۱۵] بیس[۲۰] روپئے ماہوار مقرّر ہوجائے تو عین نوازش و مرحمتِ خسروانی ہے"۔ (انشائے داغ ص ۲۷-۲۸)

چُنانچہ داغ ہی کے معروضہ پر نواب صاحب رامپور نے خورشید عالم کے نام تنو[۲] روپیہ وظیفہ جاری فرمادیا تھا[۱]، معلوم نہیں یہ وظیفہ رامپور کے انقلاب کے بعد بھی باقی رہا یا نہیں، ۱۸۸۷ء میں حکومت انگلشیہ نے شاہزادگان مُغلیہ کے نام وظیفے جاری کئے تو ان کے نام بھی پچاس[۵۰] روپیہ کا وثیقہ جاری کیا[۲]، جو انہیں آخر تک ملتا رہا، لالہ سری رام کا بیان ہے کہ خورشید عالم ۱۸۹۰ء[۳] میں حیدرآباد آئے مگر ہمیں ان کی آمد کی کوئی تاریخ یا تفصیل نہ مل سکی:-

خورشید عالم کے لئے داغ نے بڑی کوشش کی کئی بار معروضے پیش کئے بالآخر تنخواہ مقرر کرالی چنانچہ حضور نے فرمان بھجوایا،

[۱،۲،۳] خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۷۹-۸۰:-

سردار ویلا

فصیح الملک بہادر داغ صاحب!

"تمہارے بھائی محمد مرزا خورشید عالم صاحب کے نام ابتدائے ماہ حال سے دو سو روپیہ حالی ماہوار منصب جاری کرنے کے لئے دیوان صاحب کو حکم دیا گیا ہے۔"

(۱۴ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ روز دوشنبہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۹ء)

خورشید عالم کی تنخواہ کی مسل میں حضور کا یہ فرمان مدارالمہام کے نام، موجود ہے،

"فصیح الملک بہادر داغ صاحب دہلوی کے برادر مرزا خورشید عالم کے نام اس ماہ سے دو سو روپیہ حالی ماہوار منصب جاری کی جائے۔" فقط (۱۴ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ)

دفتر صدر محاسبی نے ایک آدھ مہینے کے بعد سے تنخواہ جاری کی تھی مگر داغ نے لڑ جھگڑ کر ماہ مارچ ۱۸۹۹ء سے تنخواہ حاصل کی چنانچہ مسل میں داغ کے اکثر خطوط نظر آتے ہیں،

اسی زمانے میں صاحب عالم یعنے خورشید عالم کی دوستی نواب میر حسن علی خاں امیر سے ہوئی کیونکہ کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے دونوں شوقین تھے، جب حسن علی خاں کی آمد و رفت زیادہ ہونے لگی تو داغ سے بھی ملاقات ہو گئی اور داغ نے اُن کو اپنا دوست بنا لیا اور یہ دوستی اتنی گہری اور پُر خلوص ہو گئی کہ دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہ آتا تھا، حسن علی خاں امیر فارغ البال تھے، آمدنی خاصی تھی اندوختہ بھی بہت تھا نوکری چاکری سے بے نیاز تھے، شاعری کا شوق تھا اسی لئے داغ سے

مراسم بڑھ گئے اور آخر تک رہے، صبح وہ داغ کے گھر پہنچ جاتے تو رات گئے تک وہیں رہتے اور اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔

۱۸۹۸ء میں حیدر آباد میں ایک سیاسی انقلاب ہوا، کیونکہ بعض سازشوں کا پول کھلا اور نتیجہ کے طور پر بعض لوگ شہر بدر ہوئے، چنانچہ داغ نے بیخود دہلوی کو ۲۲ اکتوبر ۱۸۹۸ء کو ایک خط میں لکھا ہے،

"یہاں انقلاب عظیم ہوا، مشتاق حسین حسب الحکم موقوف ہو کر چلے گئے مہدی حسن صاحب معطل ہوئے اور لوگ رواروی میں ہیں۔" (انشائے داغ ص۹۸)

کلکتہ کا سفر

دسمبر ۱۸۹۹ء میں حضور نظام نے کلکتہ کا سفر فرمایا تو داغ بھی ہمرکاب تھے ان کے لئے شاہی اسپیشل ٹرین کا ایک پورا کمپارٹمنٹ مخصوص تھا، یہ سفر بڑے آرام اور نہایت تزک و احتشام سے ہوا، داغ کا یہ تیسرا سفر تھا پہلا سفر انہوں نے نواب صاحب رامپور کے ساتھ کیا تھا اور دوسرا حجاب کی خاطر ہوا تھا۔

کلکتہ میں داغ کے دوست احباب اور ملاقاتی بہت تھے، داغ نے سبھوں سے ملاقات کی مشہور ہے کہ داغ نے حجاب سے بھی ملنا چاہا مگر ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ کسی شخص سے نکاح کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔

کلکتہ سے واپس ہوتے وقت داغ نے حضور سے عرض کیا کہ فدوی نے

امیر مینائی کو بنارس بُلایا ہے انہیں باریاب فرمایا جائے چنانچہ حضور نے داغ کا معروضہ منظور فرما کر ۳ جنوری سنہ ۱۹۰۰ء کو بنارس میں امیر مینائی کو باریاب فرمایا، داغ نے تعارف کرایا تو انہیں بیٹھنے کی اجازت دی ان کا مسدّس سماعت فرمایا اور دیر تک مخاطب رہے ۔

امیر مینائی حیدرآباد میں

امیر مینائی نے ایک اُردو لغات مُرتب کی تھی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث اور محاورات وغیرہ سے متعلق سندی شعرا اساتذۂ لکھنؤ کے کہے ہوئے پیش کئے گئے تھے اِس لُغت کا کام باقاعدہ ہو رہا تھا حافظ جلیل حسن جلیل اِس کام کو انجام دیتے تھے اس کی ۲ جلدیں طبع ہو چکی تھیں اور بقیہ حصّہ مرتبہ رکھا تھا اِس شوق میں امیر مینائی مقروض ہو گئے تھے وُہ چاہتے تھے کہ حضور کی طرف سے اس کی سرپرستی ہو، اور طباعت کے لئے حیدرآباد سے مالی امداد ملے، داغ بھی اِس سلسلہ میں کوشش کر رہے تھے چنانچہ اسی غرض سے امیر باریاب بھی ہوئے تھے اور پھر داغ کے بُلانے پر حیدرآباد آئے ۔

داغ نے امیر کے لئے اپنے مکان کا ایک حصّہ خالی کر دیا اور امیر کے آرام و آسایش کے لئے ساری چیزیں مہیا کیں چنانچہ ۵ ستمبر سنہ ۱۹۰۰ء کو امیر حیدرآباد پہنچے، داغ نے اُن کا استقبال بڑی فراخ دلی سے کیا اور اپنا مہمان بنایا مگر بدنصیبی سے حیدرآباد آتے ہی امیر کو غثیان صفراوی

شروع ہو گیا، داغ نے معالجہ میں بڑی کوشش کی حکیم نظیر علی خاں ٹپری کا علاج ہوتا رہا، اس مرض سے نجات ملی تو دواسیر کی تکلیف بڑھ گئی اور ضعف بھی بڑھتا گیا، داغ نے علاج بھی بدل دیا اور معالج کے مشورے سے تبدیل مقام بھی کیا توپ کے سانچہ پر متہور جنگ کے بنگلہ میں منتقل کیا خود ساتھ ساتھ رہے ۔

امیر کی وفات

امیر کی مٹی حیدرآباد کی تھی داغ نے لاکھ جتن کیئے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور ۲۳ جمادی الآخر ۱۳۱۸ھ (۱۴ اکتوبر ۱۹۰۰ء) کو امیر مینائی اللہ کو پیارے ہو گئے اور درگاہ یوسفین رح میں سپرد خاک ہوئے ؎

کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا

پسماندگان امیر سے داغ کا سلوک

امیر کے ساتھ ان کے فرزند لطیف احمد اور مسعود احمد، اور داماد لیاقت حسین اور ثابت علی۔ حافظ جلیل حسن جلیل، خان علی خاں، برادر مہدی علی خاں اور چند خدمتگار تھے، امیر کے انتقال کے بعد خاصی مدت تک داغ نے ان سب کو مہمان رکھا پھر اور لوگ تو واپس چلے گئے البتہ لطیف احمد

اور جلیل حیدر آباد ہی میں رہ گئے داغ نے ان دونوں کو مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد کی سرکار میں نوکر رکھا دیا، یہ دونوں ملازم ہونے تک داغ ہی کے پاس رہے بلکہ ملازمت کے بعد بھی داغ ان دونوں سے سلوک یعنے مالی امداد کرتے رہے۔

داغ کے لگائے ہوئے یہ پودے ایسے پھلے پھولے کہ داغ کے بعد جلیل حضور غفران مکان کے استاد بن کر جلیل القدر سے مخاطب ہوئے پھر اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ دہم کے مراحم و استاد نوازی کی بدولت نواب فصاحت جنگ بہادر ہو گئے اور لطیف احمد مینائی اختیار جنگ اور معتمد امور مذہبی بنے اور اس خاندان کے بیشتر افراد حیدر آباد میں ملازم ہو گئے، تقسیم ہند کے بعد اختیار جنگ کے خاندان کے اکثر افراد نے ترک وطن کیا مگر جلیل کا پورا خاندان حیدر آباد ہی میں ہے اور خوش حال ہے۔

مکان کی تبدیلی

داغ حیدر آباد آنے کے بعد سے کسی اچھے مکان کی تلاش ہی میں رہے مگر کوئی مکان انہیں مل نہ سکا، ظہیر علی کے برابر والے مکان میں داغ نے چودہ ۱۴ سال بسر کئے یہ مکان ضروریات کے لئے تو کافی تھا مگر وضع دار نہ تھا اس لئے داغ نے اس مکان کو چھوڑ کر کوئی سرکاری مکان حاصل کرنا چاہا، کئی مرتبہ حضور سے عرض کیا اور حضور نے مکان دینے کا حکم بھی صادر

فرمایا مگر داغ کو مکان نہ مل سکا ہے

حضور دینگے تمہیں چند روزہیں اے داغ　　اُٹھاؤ اور کوئی دن مکان کی تکلیف

۱۳ر آبان ۱۳۱۰ف (۱۹ر ستمبر ۱۹۰۱ء) کو داغ نے عزیز یار جنگ بہادر کو ایک خط لکھا ہے،

" ایک مکان جو رانی والا کرکے مشہور ہے بشیر خاں کے مکان سے آگے کنٹے کے پاس سر راہ ہے سُنا گیا ہے کہ بسبب لاوارث ہونے کے سرکاری ضبطی میں آ گیا ہے اور اس پر پولس کا پہرہ ہے آپ جانتے ہیں کہ یہاں مجھ کو کس قدر تکلیف ہے میں نے حضور دام اقبالہ میں ۳ر آبان کو عرضی کر دی ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ بہ کرایہ ہی کفایت کے ساتھ مل جائے اور اگر وہ نہ ہو تو اور کوئی مکان تجویز ہو جائے، آج نو دن ہوئے کہ اس کی کیفیت کچھ معلوم نہیں ہوئی، اگرچہ مکان عطا ہونے کے واسطے سرکار نے تحریر میرے پاس بھجوا دی ہے جس کو چھ سات برس کا زمانہ ہوا، ضابطہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی کیفیت اگر دریافت کرنی ہو گی تو عالی جناب مہاراجہ بہادر مدار المہام سرکار عالی سے دریافت فرمائیں، آپ پیشگاہ مدار المہام بہادر میں یہ تحریر پیش کر کے مجھ کو لکھیں کہ اس کے متعلق کوئی حکم آیا یا نہیں یا آئندہ آئے تو خیال فرمائیں"۔　(انشائے داغ ص ۸۹-۹۰)

داغ نے سالہا سال تک مکان کے لئے کوشش کی مگر کوئی مکان انہیں سرکار سے نہ مل سکا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ داغ ندی پار کے محلّوں مثلاً سدی عنبر بازار، گوشہ محل، ترپ بازار، اسٹیشن روڈ، عابد شاپ

وغیرہ پر سرکاری مکان چاہتے تھے اور ان محلّوں میں سرکاری مکانات تھے ہی نہیں جو داغ کو سرفراز ہوتے اگر اندرون شہر داغ کوئی مکان چاہتے تو انہیں فوراً مل جاتا کیونکہ سرکاری ڈیوڑیاں بیسیوں موجود تھیں، مگر داغ ندی پار رہنا اس لئے چاہتے تھے کہ زیادہ شمالی ہند کے لوگ انہیں محلّوں میں آباد تھے اور یہ محلّے زیادہ گنجان بھی نہ تھے اور یہاں کے مکانات نئی وضع کے تھے۔

داغ چاہتے تو ایک عالی شان مکان اپنے پسندیدہ محلّوں میں بنا سکتے تھے مگر وہ جہاں دیدہ اور عاقبت بین تھے حیدرآباد کی حالت دیکھ رہے تھے اس لئے انہوں نے مکان خریدنے یا بنانے کی ہمت ہی نہیں کی اور سرکاری مکان کی کوشش کرتے رہے مگر جب سرکاری مکان سے نا اُمید ہوگئے تو سن ۱۹۰۱ء یا ۱۹۰۲ء کے اوائل میں ترپ بازار کا مکان کرایہ پر لیا یہ مکان راجہ گوپال راؤ کا تھا جو اکسلنسی آرکیٹیکٹس (ساگر ٹاکیز) کے مقابل سہراب برادرز موٹر ڈیلرز کے بازو اب تک جُوں کا تُوں باقی ہے کیونکہ داغ کے انتقال کے بعد اسے رائے ہیم چندر وکیل نے خرید لیا اور اور اب اُن کے فرزند رائے رامچندر استھانہ، بی، اے۔ ڈپٹی کلکٹر اسی میں رہتے ہیں۔

لُطف خاص یہ ہے کہ اب تک اِس مکان سے شاعری اور شطرنج کا تعلّق باقی ہے، رائے ہیم چندر بڑے زندہ دل اور یار باش وکیل تھے ان کی زندگی بھر یار دوست جمع ہوتے شاعری کم شطرنج زیادہ ہوتی، حیدرآباد کے سابق چیف منسٹر اور کیرالا کے گورنر ڈاکٹر بی رام کشن راؤ ہیم چندر کے ساتھ کام کرتے تھے صُبح بساط بچھ جاتی اور ہیم چندر کھیلنے

بیٹھ جاتے تو رام کشن رائے صاحب بے چین ہو جاتے بار بار یاد دلاتے کہ رائے صاحب فلاں مقدمہ میں بحث کرنی ہے اور فلاں مقدمے کی آج پیشی ہے مگر رائے صاحب ٹس سے مس نہ ہوتے اور کہتے رائے صاحب آپ چلئے بحث شروع کیجئے میں آتا ہوں۔

اب بھی اس مکان میں رائے کالی چرن ایڈوکیٹ اکثر مصروف شطرنج نظر آتے ہیں اور رائے رامچندر راستھانہ کے اطراف شاعروں کا جمگھٹا رہتا ہے شعر و شاعری ہو حق سے مکان گونج اٹھتا ہے، بیس سال سے میری آمد و رفت بھی اسی سلسلہ میں ہے۔

حجاب کی آمد

حجاب داغ کی آنکھوں سے دور تھی مگر دل سے دور نہیں ہوئی تھی، مراسلت برابر ہوتی رہتی تھی ۱۸۹۹ء میں داغ حضور کے ہمراہ کلکتہ گئے تو ان کی شان، شوکت، عزت، حرمت، دولت، ثروت دیکھ کر کلکتہ والے حیران رہ گئے، کدھر وہ داغ جو داروغۂ اصطبل کی حیثیت سے بیک بینی و دوگوش آ کر ناخدا کی مسجد کے سامنے معمولی مکان میں حجاب کے مہمان کی حیثیت سے ٹھیرے ہوئے تھے اور کدھر یہ داغ جو اعلیٰ حضرت نظام دکن کے استاد نواب فصیح الملک بنے ہوئے شاہی کیمپ میں حضور کی قیام گاہ کے قریب شاہانہ ٹھاٹھ سے فروکش تھے، کلکتہ کے دوست احباب ملاقاتیوں نے اپنی آنکھوں سے یہ تزک و احتشام دیکھا اور ان کی زبانی حجاب نے سنا تو بے چین ہو گئی وہ ان دنوں کسی سے نکاح کر کے گھر بیٹھ گئی تھی، قاضی عبد الحمید جو کلکتہ کے قاضی تھے اور اپنے آپ کو محمڈن میرج رجسٹرار کہتے تھے

حجاب سے ملتے رہتے تھے اُن کے ذریعہ حجاب نے ڈورے ڈالے، چُنانچہ انھوں نے داغ کو لکھا،

"حجاب آنا چاہتی ہیں اور لوگ مانع ہیں"

اِس کا جواب داغ نے لکھا،

"مصدر لُطف و کرم جناب قاضی صاحب! السلام علیکم
آپ کا تحریر کرنا کہ حجاب آنا چاہتی ہیں لیکن دُوسرے مانع ہیں دِل کو نہیں لگتی بھلا کوئی دِل سے چاہے اور پھر موانعات حائل ہوں، سمجھ میں نہیں آتا، انہیں شاید کچھ تکلیف ہے، ذرا مجھے تفصیل سے لکھئے کہ اُن کا مدّعا کیا ہے میری جو حالت ہے آپ پر ظاہر ہے سب بتا چکا ہوں نہ مَیں وُہ رہا اور نہ اب وُہ پہلے جیسی رہیں، ایک خلش ہے جو بے چین بنائے ہوئے ہے وُہ چلی آئیں تو وقت خوش گزُرے گا ورنہ ویسے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان بہم ہی رہتا ہے اُن سے کہہ دیجئے کہ گو مَیں بُوڑھا ہو چکا ہوں لیکن اُن کی لگن ویسی ہی تر و تازہ ہے مَیں اُنہیں امکان بھر ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ مجھے یقین ہو جائے کہ وُہ خود بھی میرے پاس آنا چاہتی ہیں، ہر رُکاوٹ دُور ہو سکتی ہے بُعد قُرب ہو سکتا ہے اگر وُہ چاہیں"۔ (بلا تاریخ)

(مسودات رضا لائبریری رامپور)

یہ عجیب و غریب خط ہے ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں کہی گئی ہیں پہلے تو صاف لکھ دیا ہے۔

"نہ مَیں وُہ رہا اور نہ اب وُہ پہلے جیسی رہیں ....

وہ چلی آئیں تو وقت خوش گزرے گا ....

ورنہ ویسے کچھ نہ کچھ سامان دلچسپی کا بہم ہی رہتا ہے .....

اور پھر اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ

"گو میں بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن ان کی لگن ویسی ہی تر و تازہ ہے"

"میں انہیں امکان بھر ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں"

مسودات رامپور میں دو ایک اور خط بھی ایسے ہی نظر آتے ہیں جن سے داغ کی شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے اور بے چینی ظاہر ہوتی ہے مگر یہ سب محض دل لگی تھی وہ صرف وقتی نشاط میں یہ خطوط لکھواتے اور کسی نہ کسی طرح چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور پھر حجاب کو بلا رہے تھے اس کے لئے بیچین تھے کہ جناب نوح ناروی الہ آباد سے حیدر آباد آئے اور آتے آتے نبی جان نامی ایک طوائف کی تصویر بھی لیتے آئے اس تصویر کو دیکھتے ہی داغ بے چین ہو گئے اور خط لکھوایا۔

"کیوں جی ! تم سے کیوں کر ملیں کیوں کر دیکھیں کیوں کر سنیں ؟ اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں ؟ جو شخص عاشق مزاج ازلی ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہو گا ؟ تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی آؤ ، ہائے مجبوری وائے مجبوری ....." (۱۵ دسمبر ۱۹۰۲ء)

(انشائے داغ ص ۶۶-۶۷)

حجاب کے عاشق کا رول داغ نے اس عمدگی سے ادا کیا کہ ان کے دوست اور حاضر باش شاگرد بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ واقعی عاشق ہیں اور دل سے چاہتے ہیں چنانچہ اسے خطوط لکھے کلکتہ گئے دوسرے احباب کو لکھا غرض دن رات اسی کا تذکرہ رہنے لگا اور بالآخر اپنے

نکاحی شوہر سے طلاق لے کر بیچاری حجاب ۱۸ یا ۱۹ جنوری ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد پُہنچ گئی ۔

آخری مرتبہ داغ نے ۳ جولائی ۱۸۸۲ء کو حجاب کو کلکتہ میں خدا حافظ کہا اور اب ساڑھے اُنیس سال کے بعد اپنے گھر پر اس کا استقبال کیا، اُنیس بیس برس تک کسی کی محبت کا باقی رہنا، اور اِس طویل مدّت کے گزرنے کے بعد بھی اسی شوراشوری سے پیش آنا بظاہر عشق صادق کا یقین دلاتا ہے۔ مگر یہ صرف داغ کی دِل لگی تھی یا وضع داری، انہیں عشق صادق تھا نہ عشق کاذب اِس معاملہ کو عشق و محبت سے سروکار ہی نہ تھا، البتہ وُہ ایک رفیق کی حیثیت سے حجاب کو اپنے پاس رکھنا ضرور چاہتے تھے ۔

داغ کی بیوی تو نہ تھیں صرف ایک مُنہ بولی بیٹی تھیں جنہیں ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی وُہ اپنے میاں سائل پر حکومت چلاتے چلاتے داغ پر بھی حُکم چلانے لگی تھیں جس کی وجہ سے داغ ان سے ناخوش تھے اخیافی بھائی خورشید عالم ساتھ ہی رہتے تھے مگر انہیں اپنے لہو ولعب سے فُرصت نہ تھی دِن بھر شغل مئے و مینا میں مصروف رہتے تھے۔ سائل بھی بے اعتدالیوں میں مُبتلا تھے بیوی سے ڈرتے تھے اِس لئے ان سے روپیہ بٹور نہ سکتے تھے، چچا چچا کہہ کر داغ کو بٹورتے اور نقدی لے جاکر جُوئے میں ہار آتے اور اگر چچا کچھ نہ دیتے تو گھر کے سامان پر ہاتھ صاف کرتے، ایک بھتیجا امراؤ مرزا نادان بھی گھر پر تھا جسے خورشید عالم نے شراب کی لت لگادی تھی وُہ بھی نکما ہوگیا تھا، نواسہ ناصرالدین احمد خاں ابھی بچہ ہی تھا مگر سائل، خورشید عالم اور نادان کا رنگ دیکھ کر کنوتیاں بدل رہا تھا غرض

"خانہ تمام آفتاب" کا مصداق تھا اور داغ گھر بھر سے بیزار تھے۔

آپ نے سمجھ لیا کہ داغ کے گھر کا کیا حال تھا کوئی داغ سے دلچسپی لینے والا نہ تھا البتہ داغ کو لوٹنے اور بٹورنے پر سب آمادہ تھے، جہاں عزیزوں کا یہ حال ہو وہاں نوکروں کی کیا حالت ہوگی ظاہر ہے اِس لئے داغ کو ایک ہمدرد اور رفیق کی ضرورت تھی اور یہی سمجھ کر داغ نے حجاب کو بلوایا بھی تھا کہ وُہ گھر پر رہے گی ان کی ضروریات کا خیال رکھے گی، کھانے پینے کا انتظام کرے گی اور ان موجودہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں سے نجات ملے گی ورنہ بہتر ۷۲ برس کی عمر اور پھر اعصابی امراض بھلا ان میں کیا رکھا تھا جو کسی جذبے کے تحت عاشقی کرتے؟

مگر انھوں نے غلطی یہ کی کہ اس صُورت حال سے حجاب کو ناواقف رکھا اور چونکہ حجاب اس پسِ منظر سے ناواقف تھی اس لئے وہ یہ سمجھ کر آرہی تھی کہ داغ کو واقعی اس سے عشق ہے وُہ ایک ہزار روپیہ تنخواہ پاتے ہیں حضورِ نظام کے اُستاد ہیں، رات دِن سرفرازیاں الگ ہوتی رہتی ہیں خوب مال و دولت جمع ہوگی، بہتر سال کی عمر تو ہو چکی ہے دو چار سال اور جئیں گے تو بہت ہوگا پھر یہ سب کچھ میرا ہے اور فصیح الملک کی بیوہ بن کر حضورِ نظام سے وظیفہ الگ حاصل کر لوں گی،

اِسی تصوّر میں حجاب نے آنے سے پہلے یہ شرط لگا دی کہ نکاح کرنا ہوگا وُہ اِسی مغالطہ میں تھی کہ چونکہ داغ کو اس سے سچّی محبّت ہے اس لئے خوشی سے نکاح کریں گے، مگر یہاں آ کر جب اس نے اختر جان کو دیکھا تو جذبات رقابت بھڑک اُٹھے اور اس نے اُسے یک قلم موقوف کرا دیا، دُوسری طوائفیں بھی جو مجرے کے لئے آیا کرتی تھیں روک دی گئیں، یہ احتساب

داغ کو ناگوار گزرنے لگا ادھر گھر کے اندر بھی حجاب نے اقتدار بڑھانا شروع کیا تو لاڈلی بیگم چراغ پا ہوئیں ان کی عقل کل داغ کے مرحوم بچے کی انّا تھی جو بڑی ہی زبان دراز اور "ڈّاٹا" قسم کی عورت تھی اس پیر زن فرماد کش نے بھی لاڈلی بیگم کو پٹی پڑھانی شروع کی کہ یہ کلکتہ والی بڑے طمطراق سے آئی ہے داغ اس سے نکاح کا وعدہ کر چکے ہیں اختر جان جیسی چہیتی کو انہوں نے چھوڑ دیا ہے اب وہ سارے گھر پر قبضہ کر لے گی اور تمہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال دے گی۔

لاڈلی بیگم کو معلوم تھا کہ داغ ان کے شوہر سے اور ان سے ناخوش ہیں صرف ناصر کی خاطر انہوں نے ان لوگوں کو گھر میں رکھ چھوڑا ہے اس لئے انہوں نے علانیہ حجاب کی مخالفت شروع کر دی،

حجاب نے یہ محسوس کر کے کہ وہ تنہا ہے صرف اس کا چھوٹا بھائی خدا بخش ساتھ ہے مگر وہ نوجوان اور ناتجربہ کار ہے کسی معاملہ میں صلاح مشورہ نہیں دے سکتا، بڑی دور اندیشی سے اپنے بعض قرابت داروں کو کلکتہ سے بلا لیا اور ان لوگوں کے آتے ہی باضابطہ محاذ بن گیا دن بھر چخ چخ چلنے لگی داغ نے اس طرح جوتیوں میں دال بٹتی دیکھی تو انہیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ انہیں دوسرے مکان میں منتقل کر دیا جائے چنانچہ شہر میں ایک مکان کرایہ پر لے کر حجاب اور اس کے عزیزوں کو اس میں منتقل کر دیا گیا، داغ نے ابتداً ساٹھ روپیہ ماہوار اور پھر سَو روپیہ ماہوار ان لوگوں کے اخراجات کے لئے دینا شروع کیا مگر حجاب ایک ڈیرہ دار طوائف تھی اور اس کا ہاتھ کھلا ہوا تھا یہ رقم کافی نہ ہوئی تو اس نے داغ کے دوستوں اور شاگردوں سے قرض منگوانا شروع کیا تا کہ داغ کو شرم

آئے اور وہ زیادہ رقم دیا کریں مگر یہ قصّہ جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ بارش میں وہ مکان ہی بیٹھ گیا جس میں یہ لوگ کرایہ سے تھے اِس لئے پھر سارا قافلہ داغ ہی کے گھر منتقل ہو گیا اور وہی جنگ جدال کا قصّہ قائم ہو گیا ؞

لاڈلی بیگم، انا جی اور رسائل نے سازش کر کے حجاب کو خوب بدنام کیا، داغ اور ان کے بعض حاشیہ نشین اس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے اور حجاب کشتنی گردن زدنی قرار دی گئی ؞

نواب حسن خاں امیرؔ اور میرے والد مغفور اس قصّے سے تفصیلی طور پر واقف تھے داغ کی وجہ سے یہ لوگ کبھی کبھار حجاب کے گھر جایا کرتے تھے امیر سے حجاب بے پردہ تھی مگر میرے والد سے پردہ کرتی تھی، ان دونوں بزرگوں نے حجاب کے رکھ رکھاؤ کی تعریف کی ہے داغ کے ایک شاگرد مودود احمد تشنہ بھی تھے جو فارسی میں خفائی تخلص کرتے تھے ان کا بیان تھا کہ حجاب جس مکان میں آکر رہی تھی ان کے مکان کے برابر بازو ہی تھا صرف ایک دیوار بیچ میں حائل تھی پڑوس کی وجہ سے ان کے گھر والوں سے مراسم ہو گئے تھے اور آمد و رفت ہوتی تھی، تشنہ نے ہمیشہ حجاب کے چال چلن کی تعریف کی اور اسے پاکباز ظاہر کیا ؞

واقعہ یہ ہے کہ جب حجاب حیدر آباد پہنچی ہے اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہو چکی تھی عورت طرح دار تھی مگر سن یاس کو پہنچ چکی تھی، سر سارا سفید ہو چکا تھا جسے وہ خضاب لگا کر سیاہ کر لیا کرتی تھی، دانت آدھے سے زیادہ مصنوعی تھے، چہرہ جھریوں سے محفوظ ضرور تھا مگر گلے پر جھریاں نظر آتی تھیں بھلا اس سن و سال میں وہ کس سے معاشقہ کرتی اور کون اس سے دل لگاتا، حجاب کی آوارگی اور آبرو باختگی کے جو قصّے مشہور ہوئے وہ

لاڈلی بیگم اور اناّ جی کے گھڑے ہوئے تھے ؎

حجاب کے آنے کے بعد سے اس کے جانے تک بڑی ہی بے لطفی رہی بالآخر تنگ ہو کر اگست یا ستمبر ۱۹۰۳ء میں وہ کلکتہ چلی گئی اور یہ عاشقی جس شوراشوری سے شروع ہوئی تھی اسی بے لطفی سے ختم ہوئی، حجاب کے کلکتہ جانے کے بعد اس کے صحیح حالات داغ کو معلوم ہوئے اور اسکی بیگناہی اور لاڈلی بیگم اور اناّ جی کی ریشہ دوانیاں ظاہر ہوئیں تو انہیں بڑی کوفت ہوئی اس کے بعد لمبے چوڑے خطوط حجاب کو لکھے اور ماہوار دو سَو روپیہ بھی داغ نے بھجوانا شروع کیا جو مرتے تک بھجواتے رہے ؎

چونکہ حجاب کے جانے کے بعد داغ نے بیشتر خطوط والد مرحوم کے ہاتھ سے لکھائے تھے اس لئے اُنہیں زیادہ واقفیت اِس قصّے سے ہو گئی تھی، داغ کے انتقال کے بعد حجاب نے حسن علی خاں امیر اور میرے والد کو جو خطوط لکھے تھے ان میں بھی اپنی نامرادی اور ناکامی اور داغ کے تغافل کی تفصیل تھی چنانچہ والد مرحوم نے وہ لمبا چوڑا خط بڑی حفاظت سے رکھا تھا، ایک دفعہ یہ خط میرے ہاتھ لگا اور مَیں نے پُورا خط پڑھ لیا اُس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو مَیں نے والد سے پُوچھا یہ مُنّی بائی کلکتہ والی کون ہے جس کا خط آپ کے کاغذات میں رکھا ہُوا ہے تو انہوں نے صرف اتنا کہا کہ یہ حجاب کا نام تھا جو اُستاد داغ کے پاس آئی تھی اور پھر اس خط ہی کو انہوں نے ضائع کر دیا کیونکہ اس میں لاڈلی بیگم اور اناّ جی کے پُورے چرتر لکھے ہوئے تھے ؎

نواب حسن علی خاں امیر کے پاس بھی حجاب کے ایسے ہی خطوط تھے جو اب برادر عزیزم میر لیٰسین علی خاں کے قبضے میں ہیں مگر انہوں نے کسی ایسی جگہ اِس ذخیرہ کو محفوظ کیا ہے جو خود انہیں کہیں مِل رہا ہے ؎

دیوان کا سرقہ

داغ اپنے دیوان کے لئے بڑا اہتمام کرتے تھے ایک کاتب مستقل ملازم تھا جس کا کام دیوان میں غزلیں صاف کرنا تھا اور ایک نفیس جلد کا دیوان بہت ہی خوشخط لکھا ہُوا تقریباً مکمل ہو چکا تھا اِس دیوان کے متعلق والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اس کی ضخامت مہتاب داغ سے زیادہ تھی اور اس میں پانچ ایک سو غزلیں تھیں، قصائد، رُباعیات، قطعات وغیرہ الگ تھے۔ اِس دیوان کے اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار ہو گی، ابھی داغ اِس دیوان کی طباعت کی فکر ہی میں تھے کہ کسی نے اُڑا لیا۔

داغ کے ایک شاگرد سے جن کا نام بعض وجوہ سے ظاہر نہیں کر سکتا مجھے یہ قصّہ معلوم ہوا کہ داغ بعض دفعہ فحش اور عریاں شعر بھی کہا کرتے تھے چنانچہ انہوں نے کسی بے تکلّف دوست کی فرمائش پر ایک ایسی غزل کہی تھی جس کا قافیہ مہ لقا اور چولی کے بند ردیف تھی، یہ غزل داغ نے سوا چند خاص خاص شاگردوں کے جو بے تکلف تھے کسی اور کو نہیں سُنائی تھی مگر دیوان میں اِس غزل کو لکھا دیا تھا، اِس دیوان کی چوری کے چوتھے پانچویں روز چولی کے بند والی غزل مشہور ہو گئی اور آوارہ لونڈے اِس غزل کو سڑکوں پر گاتے ہوئے پھرنے لگے، جن لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ داغ کی یہ غزل اسی دیوان میں تھی جو چوری گیا ہے تو انہوں نے ان لونڈوں سے یہ غزل لکھ لی مگر مقطع جو سُنا تو معلوم ہُوا کہ داغ کے ایک کم سن شاگرد نے جو کبھی کبھار آ کر اپنی غزل سُنا کر اصلاح لیا کرتے تھے اِس غزل میں اپنا تخلص ٹھونس لیا ہے اِس طرح

چور کا پتہ لگ گیا۔

ابتدائً داغ نے اس دیوان کے لئے انعام کا اعلان کیا کہ جو شخص دیوان لاکر پہنچائے گا اُسے انعام دیا جائے گا مگر دیوان نہ آیا، اس کے بعد داغ نے اُن صاحب کو بُلا کر سمجھایا جن کے تخلص سے چوری کے بند والی غزل مشہور ہوئی تھی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ میرے کسی دُشمن نے اس غزل میں میرا تخلص لگا دیا ہے مجھے اس غزل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ آپ کا دیوان میں نے لیا ہے، داغ نے سمجھایا کہ اس دیوان کی تقریباً پُوری غزلیں یا تو گلدستوں کی چھپی ہوئی ہیں یا مشاعروں کی پڑھی ہوئی اور تقریباً سب غزلیں رنڈیوں اور قوالوں کو یاد ہیں اس لئے پُورا دیوان تمہارے لئے بیکار ہے جو غزلیں تمہیں پسند ہوں لے لو بقیہ دیوان مجھے دیدو مگر وُہ انکار ہی کرتے رہے داغ نے مجبور ہو کر کوتوال بلدہ (سٹی پولس کمشنر) کو کہا انہوں نے بھی ڈرا دھمکا کر دیوان حاصل کرنا چاہا مگر دیوان نہ ملنا تھا نہ ملا، داغ نے مجبور ہو کر گلدستوں سے اپنی غزلیں نقل کروالیں رنڈیوں اور قوالوں کے پاس جو غزلیں تھیں اُن سے بھی لکھوالیں اور شاگردوں کے پاس جتنا کلام تھا اسے بھی فراہم کر لیا اور ایک دیوان مرتب کرنا شروع کیا اور اس کی دو نقلیں کرائیں تا کہ ایک چوری جائے تو دوسری محفوظ رہے۔

احسن مارہروی نے اپنے ایک مضمون "داغ کی صحبت میں" مطبوعہ علیگڈھ میگزین ستمبر ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے۔

"ایک مرتبہ پنجاب سے کوئی قوال مرزا صاحب کی مجلس میں آیا اور فرمائش پر تین شعروں کا ایک خمسہ پڑھا جس کے اصل شعر یہ تھے ۔

علاجِ دردِ دل تم سے مسیحا ہو نہیں سکتا
تم اچھا کر نہیں سکتے میں اچھا ہو نہیں سکتا

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

دمِ آخر مری بالیں پہ مجمع ہے حسینوں کا
پھر آنا اے اجل اس وقت پردا ہو نہیں سکتا

قوال سے پوچھا گیا کہ یہ شعر کس کے ہیں تو اس نے ایک چھپا ہوا رسالہ دکھایا جس میں یہ الفاظ درج تھے "خمسہ بر غزل مرزا داغ" ماہتاب داغ کے بعد ان کا ایک مسودۂ دیوان کھو گیا تھا اور بہت سی غزلیں حافظے سے نکل چکی تھیں، مرزا صاحب نے گمان کیا کہ شاید یہ شعر اُسی کھوئے ہوئے مسودے کے ہوں، چھپی ہوئی کتاب کو سند سمجھا گیا، چونکہ یہ شعر ان کو پسند آ گئے تھے اُسی دن اور اشعار کہہ کر غزل پوری کی گئی، اتّفاق سے اسی رات کو حبیب کنتوری کے گھر مشاعرہ تھا، مرزا صاحب کبھی کبھی ان کے مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے چنانچہ وہاں گئے اور بے تکلف ان تین شعروں کے ساتھ اپنی پوری غزل پڑھ دی، بعد کو تحقیقات سے معلوم ہوا کہ وہ تینوں شعر مضطر خیر آبادی کے ہیں، ممکن ہے کہ مشاعرے میں کسی کو شبہ ہوا ہو مگر ان کی شہرت اور عظمت کے سامنے کوئی لب نہ ہلا سکا، اِس اطّلاع و یقین کے بعد وہ تینوں شعر اپنی غزل سے نکال دئے اور نیا مطلع کہہ کر غزل پوری کی گئی بطور نمونہ مطلع ایک شعر اور مقطع سُنایا جاتا ہے ؎

اشارہ اس نگہ کا رُوح افزا ہو نہیں سکتا
کہ جادو گر سے اعجازِ مسیحا ہو نہیں سکتا

شکایت دوست کر سکتے ہیں تیری کر نہیں سکتے
کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے ایسا ہو نہیں سکتا

سوالِ وصل پر اے داغ دل کی رہ گئی دل میں   کہا منہ پھیر کر ظالم نے ایسا ہو نہیں سکتا

افتخار عالم اور احسن مارہروی

احسن مارہروی ۱۸۹۶ء میں خط کے ذریعہ داغ کے شاگرد ہوئے تھے وُہ اپنے چچا افتخار عالم کو ساتھ لے کر بتلاش روزگار حیدرآباد پہنچے اور پہنچتے ہی داغ پر مسلط ہو گئے احسن مارہروی نے داغ کو فصیح اللغات کے چکر میں اور پھر جلوۂ داغ کے پھیر میں پھنسایا، اور افتخار عالم بھی داغ سے سفارش کراتے رہے مگر کوئی صُورت نہ نکل سکی۔

داغ نہایت ہی مُحتاط آدمی تھے اعلیٰ حضرت سے کسی کے متعلق کہنے سُننے کے روادار نہ تھے مگر افتخار عالم نے ایسا اثر اُن پر قائم کر لیا تھا کہ داغ نے ایک معروضہ کے ذریعہ ان کی کتابیں پیش کیں۔

"آج ایک نئی تصنیف فدوی پیش کرتا ہے، سیّد افتخار عالم صاحب ساکن مارہرہ شریف جو پیرزادہ خاندان عالی سے ہیں اور میرے شاگرد ہیں ان کا ایجاد ہے کہ زبان انگریزی میں تاریخ نکالی ہے آج تک یہ ایجاد نہیں دیکھا تھا اور نہ سُنا تھا اور ایک کتاب تاریخ مدرسۃ العلوم علیگڈھ بھی انہوں نے مفصّل تصنیف کی ہے بذریعہ فدوی کے دونوں نذریں ہمراہ عریضۂ ہذا کے مُرسلِ خدمت عالی ہیں اُمید وار ہوں کہ مشرف بہ قبول ہوں"۔ "الٰہی آفتاب دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد"

معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے اس معروضہ پر کوئی التفات نہیں فرمایا جب حضور کو متوجہ نہ پایا تو داغ نے حسن علی خاں امیر کے ذریعہ انہیں ظفر جنگ شمس الملک کے پاس بھجوا دیا۔

"یہ رقعہ ایک خاص معاملے میں آپ کو لکھا جاتا ہے جس کی طرف آپ کو توجہ بھی خاص طور سے کرنی چاہیئے آپ کو معلوم ہے کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب میرے دلی اور مخلص دوست جو ایک نہایت لائق و شریف اور ہر طرح قابل اعتماد شخص ہیں ان کی ملازمت کا کوئی انتظام چاہتا ہوں کہ ہو جائے میری رائے میں مناسب یہ ہے کہ آپ اور جناب مردان علی صاحب عالی جناب شمس الملک بہادر سے مولوی سید افتخار عالم صاحب کو ملا دیجئے اور بالمشافہ میری طرف سے عرض کیجئے کہ مجھ کو جناب ممدوح کے اشفاق و الطاف سے اُمید ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی انتظام فرمادیں گے یقین ہے کہ سردست بھی کوئی موقع ہوگا اور نہ ہو تو آئندہ ایسے مواقع بہت پیش آئیں گے میں اسکی بھی اُمید رکھتا ہوں کہ مولوی سید افتخار عالم صاحب اپنی لیاقت اور کارگزاری دیانت و وفاداری سے ایسی خدمت شایان شان انجام دیں گے کہ جناب نواب صاحب ممدوح ان سے نہایت رضا مند اور خوش ہونگے ایسے لوگوں کا سلسلۂ ملازمت میں داخل ہونا خود سرکاری مقاصد کے لئے نہایت مفید ہے سید افتخار عالم صاحب علاوہ اُردو فارسی کے انگریزی

بھی بقدرِ ضرورت جانتے ہیں، میرے تجربے کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا میں سب چیزیں ملتی ہیں مگر آدمی لائق بہت کم ملتا ہے جس کو مِل جائے اس کی خوش نصیبی ہے اور لیاقت بغیر امتحان کے معلوم نہیں ہو سکتی اور امتحان بغیر پاس رکھے نہیں ہو سکتا"۔

(انشائے داغ ص ۷۱-۷۲) (فروری ۱۹۰۲ء)

افتخار عالم کے متعلق احسن مارہروی نے منقولۂ بالا خط پر نوٹ لکھتے ہوئے لِکھا ہے۔

"سیّد افتخار عالم صاحب مرحوم میرے رشتے کے چچا تھے میرے قیام حیدر آباد کے زمانے میں سال ڈیڑھ سال وُہ بھی وہاں رہے اور اُستاد مرحوم سے تلمذ حاصِل کیا، مرزا صاحب نے اکثر ان کی مُلازمت کے لئے کوششیں کیں انہیں میں سے ایک سعی یہ بھی تھی مگر افسوس ہے کہ کہیں کوئی صُورت فلاح کی نہ نکل سکی، چچا صاحب پھر مارہرے چلے آئے اور مشاغل، تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا"۔

(انشائے داغ ص ۷۲-۷۳)

جلوۂ داغ

امیر مینائی نے اُردو کی ایک لُغت مرتب کی تھی جس میں تذکیر و تانیث اور محاوروں کے اسناد شعرائے لکھنؤ سے لئے گئے تھے اس کی ۲ جلدیں

طبع ہو چکی تھیں جو داغ کے کتب خانے میں موجود تھیں احسن مارہروی نے
اس لغت کو دیکھ کر ایک اسکیم بنائی کہ کیوں نہ اسی قسم کی ایک لغت مرتب
کی جائے جس میں سندی شعر صرف داغ ہی کے ہوں اور اس کا نام داغ
کے نام پر فصیح اللغات رکھا جائے چنانچہ انہوں نے یہ اسکیم داغ کے سامنے
پیش کی مگر داغ نے زیادہ توجہ نہیں دی تو پھر ان سے خواہش کی کہ آپ
اپنے حالات لکھوا دیں تو میں ایک سوانح عمری مرتب کرتا ہوں۔

اُن دنوں بعض لوگ داغ سے ان کے حالات مانگ رہے تھے
چنانچہ شہرت، افسوں، سیماب، وجاہت وغیرہ مدت سے تقاضا کر رہے
تھے کہ اپنے حالات دیجئے تو ہم سوانح عمری شائع کرتے ہیں، اور داغ
ان لوگوں کو اپنے حالات بھیجتے ہوئے اس لئے ڈر رہے تھے کہ معلوم نہیں
ان حالات کو کس طرح مرتب کریں اور کیا کیا لکھ دیں، جب احسن نے یہ
تحریک کی تو انہوں نے روزانہ اپنے حالات سُنانا شروع کیا جسے احسن نوٹ
کرتے جاتے اور پھر مرتب کر کے سُناتے جاتے تھے اس طرح داغ کی سوانحِ عمری
مرتب ہوئی احسن کے مرتبہ حالات جو خود داغ کے لکھوائے ہوئے تھے داغ
روزانہ سُنتے اور اس میں کمی زیادتی کرتے اور اپنے خاص خاص شاگردوں سے
مشورہ بھی کرتے تھے چنانچہ بیسیوں مرتبہ سُننے اور کاٹ چھانٹ کرنے کے
بعد ایک کتاب مرتب ہوئی جس کا نام خود داغ نے جلوۂ داغ رکھا اور اشاعت
کے لئے پریس کو دی گئی اور جب وُہ طبع ہونے لگی تو داغ نے تاریخ کہی ؎

زندگی کے مری احسن نے سوانح لکھے — عُمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو
داغ نے مصرع تاریخ کہا برجستہ — جلوۂ داغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھو

اس سوانح عمری میں داغ نے وُہ پورے حالات بلا کم و کاست

لکھوادیے ہیں جو گفتنی تھے البتہ جو ناگفتنی تھے انہیں چھوڑ دیا ہے، اِس سوانح کو حرفِ آخر بنانے کے لئے یہ بھی لکھوا دیا کہ

"اِس مختصر لائف کے بعد اگر مُستقل طور پر کامل سوانح عمری لکھنے کا خیال ہو گا تو سوائے زاید باتوں کے جو مورخ اپنی رائے سے کتاب کو ضخیم کرنے کے لئے لکھا کرتے ہیں، تمام ضروری باتیں اس میں ملیں گی"[1]

جلوۂ داغ ۱۹۰۲ء میں مطبع شمسی میں طبع ہو کر شائع اور مقبول ہوئی،

افتخار عالم نے حیدرآباد پہنچتے ہی داغ کا ایک روزنامچہ مرتّب کرنا شروع کر دیا تھا جس میں روزانہ جو جو باتیں ہوتیں لکھی جاتی تھیں مگر یہ روزنامچہ روزانہ نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ جس روز انہیں فرصت ملتی بیٹھ کر دو تین روز کے حالات لکھ لیا کرتے تھے، افتخار عالم جب تک یہاں رہے وہ اسے مرتّب کرتے رہے ان کے جانے کے بعد احسن مارہروی نے بھی اسے جاری رکھا، اس کے متعلّق احسن مارہروی نے انشائے داغ کے مقدمہ میں لکھا ہے،

"میرے عزیز قریب سیّد افتخار عالم مرحوم مولف حیاۃ النذیر وغیرہ جو میرے ساتھ حیدرآباد میں قیام پذیر تھے اور اُستاد مرحوم کی خدمت میں میری طرح دن رات حاضر باش رہتے تھے انہوں نے روزنامچہ کی طرح ان کے واقعات قلم بند کرنے شروع کئے یہ مجموعہ پونے دو سو صفحوں تک پہنچا تھا کہ وہ وطن چلے آئے اور میں زیادہ تر فصیح اللغات کی ترتیب تالیف میں مصروف و مُنہمک ہو گیا" (مقدمہ انشائے داغ ص ۵)

---

[1] جلوۂ داغ ص ۷،

رفیق مارہروی فرزند احسن مارہروی نے اِس روزنامچے کے بعض اقتباسات اپنے ایک مضمون میں شائع کئے تو میں نے روزنامچہ دیکھنے کی خواہش کی اور انہوں نے روزنامچے کے پارینہ اوراق کو بڑی محنت سے صاف کرکے اس کی ایک کاربن کاپی میرے پاس بھجوائی، جسے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر میں نے ۲۸ر مئی ۱۹۵۸ء کو اس کی پوری نقل کرلی اور ان کی کاپی انہیں واپس بھیج دی۔

اِس روزنامچے سے مجھے اختلاف تھا کیونکہ اس کے اندراج ۱۴ر فروری ۱۸۹۸ء سے شروع ہوتے تھے جو میری دانست میں غلط تھے کیونکہ انشائے داغ کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ جولائی ۱۸۹۸ء تک داغ نے احسن کو خطوط لکھے ہیں پھر وہ فروری میں حیدرآباد پہنچ کر روزنامچہ کس طرح شروع کرسکتے تھے، علاوہ ازیں بعض واقعات پر بھی مجھے اعتراض تھا جو میری دانست میں غلط یا غلط فہمی سے لکھے گئے تھے مگر چونکہ رفیق صاحب نے اس روزنامچہ کے اشخاص کے متعلق فٹ نوٹس مانگے تھے اِس لئے میں نے مرتب کرکے بھجوا دئے اس کے بعد انہوں نے مجھے لکھا کہ وہ اس روزنامچے کو اس طرح مُرتّب کرنا چاہتے ہیں کہ داغ کی پوری سوانح عمری بھی اس میں آجائے اور یہ روزنامچہ بزم داغ کی بولتی چالتی تصویر بن جائے، چونکہ یہ ایک دستاویزی چیز تھی اِس لئے میں نے انہیں لکھا کہ اس میں افسانوی رنگ بھرنا مناسب نہیں ہے اس کی تاریخی اور واقعاتی اہمیت کو باقی رکھتے ہوئے آپ واقعات کا اضافہ کریں تو بہتر ہوگا چنانچہ انہوں نے

بزمِ داغ

مُرتّب کی جناب نیاز فتحپوری سے اس پر "افتتاحیہ" لکھوایا اور نسیم بک ڈپو

لکھنؤ سے ۲۰ × ۳۰ کے ۲۵۵ صفحات پر شائع کر دیا، مجھے یہ خوشخبری بھی لکھی کہ بزمِ داغ شائع ہو گئی ہے مگر بھیجی نہیں بالآخر میں نے بھائی نسیم انہونوی سے منگوا کر اس کی زیارت کی تو سخت ناامیدی ہوئی،

چونکہ مجھے اعتراض تھا کہ احسن صاحب کے نام داغ کے خطوط جولائی ۱۸۹۸ء تک ملتے ہیں اس لئے رفیق صاحب نے ۱۵ راگست ۱۸۹۸ء سے روزنامچہ کی تاریخیں شروع کیں اور ۱۵ رجون ۱۹۰۲ء تک اُسے پہنچا دیا،

رفیق صاحب نے اپنی ہی مرتبہ کتاب پر آپ ہی "پیش لفظ" تحریر فرمایا ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے،

"میں نے مسودے پر نظر ڈالی تمام یادداشتوں کو بار بار پڑھا، منتشر اور نامربوط انداز میں لکھی ہوئی ان یادداشتوں کو دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی ان کو بجنسہٖ پیش کرنا مشکل نظر آیا، یہ سب یادداشتیں بغیر کسی عنوان کے درج نہیں بعض یادداشتوں پر تاریخ تحریر بھی درج نہیں تھی، روشِ تحریر اتنی رواں تھی کہ بعض مقامات کا پڑھنا مشکل تھا، بیشتر واقعات کے متعلق صرف اشارے لکھ دئے گئے تھے .... آلاخر یہی صورت قابلِ عمل نظر آئی کہ اس روزنامچے کی تمام یادداشتوں کو ان کے اصلی مفہوم میں ذرا بھی تبدیلی کئے بغیر ازسرِ نو لکھا جائے چنانچہ اس کتاب کی بیشتر یادداشتیں ایسی ہیں جو میری زبان میں تحریر ہوئی ہیں لیکن مفہوم مولانا احسن صاحب یا مولوی افتخار عالم صاحب کا ہے"

(بزمِ داغ صہ ۱۴۔۱۵)

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جب یہ یادداشتیں پڑھی نہیں جا سکیں تو پھر

اصلی مفہوم کو ذرا بھی تبدیلی کئے بغیر از سر نو کس طرح لکھا گیا؟ اگر ایسا ہو سکتا تو بڑی اچھی بات تھی مگر رفیق صاحب نے اس کے بجائے فرضی روزنامچہ مُرتب فرما دیا، داغ نمبر نگار لکھنؤ، جلوۂ داغ، اور دُوسری کتابوں سے مواد لے کر متن میں پیوست کر دیا اور ایک دستاویزی چیز ضائع کر دی اگر یہ روزنامچہ بجنسہ اصلی حالت میں شائع کر دیا جاتا اور رفیق صاحب نے جو اضافہ اصل میں کیا ہے وہی حواشی کی صُورت میں لکھ دیا جاتا تو روزنامچے کی تاریخی اہمیت جُوں کی تُوں باقی رہتی اور ایک کار آمد کتاب بن جاتی مگر افسوس ہے کہ رفیق صاحب نے جلد بازی کی،

بزم داغ کے متعلق مَیں نے لکھا کہ آپ نے اِس طرح فرضی روزنامچہ مرتب کر کے "بد دیانتی" اور "بے ایمانی" فرمائی ہے تو وُہ چراغ پا ہو گئے اس لئے مَیں نے اُن سے کہنے سُننے یا بحث کرنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ اب وُہ اپنے آپ کو داغ پر "اتھارٹی" خیال فرماتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس دماغ میں اِتنی کجی پیدا ہو جائے وُہ کیا سمجھ سکتا ہے +

بزم داغ میں رفیق صاحب نے نواب میر حسن علی خاں کے دو خطوط جو داغ کے انتقال کے بعد انہوں نے احسن کو لکھے تھے اور انہی کا ایک خط جو نوح ناروی کے نام تھا جسے نوح نے احسن کے حوالہ کر دیا تھا بجنسہ شائع کر دئے ہیں چونکہ ان میں بھی کتر بیونت کا اندیشہ تھا اس لئے برادرم میر یٰسین علی خاں کے ذریعہ مَیں نے یہ خطوط رفیق کے پاس سے منگوا کر مقابلہ کر لیا ہے شُکر ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی انہوں نے نہیں کی ہے بزم داغ کے یہی ۱۶ ۱/۲ صفحات کار آمد اور اہم ہیں +

چونکہ مسودۂ روزنامچہ جو رفیق صاحب نے ابتداً مجھ کو بھیجا تھا خود غلط

تھا اور بزمِ داغ میں تو انھوں نے اسے غلط در غلط کر دیا ہے اِس لئے مَیں نے اپنی اس کتاب میں سوا احسن علی خاں امیرؔ کے خطوط کے اقتباس کے اور کوئی اقتباس نہیں لیا ہے اور آئندہ بھی داغؔ پر کام کرنے والے اس کتاب سے استفادہ نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ تقریباً سب واقعات غلط ہیں ؂

فصیح اللغات

قبل ازیں میں نے عرض کیا ہے کہ احسنؔ صاحب نے داغؔ کو فصیح اللغات کی چکر میں پھنسا دیا تھا اور داغؔ اس اسکیم سے بہت خوش تھے احسنؔ کا منشا اس سے یہ تھا کہ یہ کام بہت لمبا چلے گا اِس سلسلہ میں حیدر آباد میں مُستقل قیام ہی نہ ہو گا بلکہ کوئی مُستقل امداد بھی مل جائے گی جو ان کی خود بسری کے لئے کافی ہو سکے گی، اس میں ان کی کوئی بدنیّتی نہ تھی بلکہ وہ کام کر کے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اور داغؔ اِس لئے خوش تھے کہ دہلی کی زبان کا ایک لُغات مُرتب ہو جائے گا جس سے ان کی شہرت بھی ہو گی ؂

اِس لُغت کے متعلّق احسنؔ نے انشائے داغؔ میں لکھا ہے،

"راقم الحروف نے قیام حیدر آباد کے زمانے میں "فصیح اللغات" کے نام سے ایک تصنیف شروع کی تھی جس میں حرف مرزا صاحب کے نظم کئے ہوئے محاورے اور الفاظ مثالوں کے ساتھ یکجا کئے گئے تھے اِس تالیف و تصنیف سے مرحوم کو خاص شغف ہو گیا تھا اور اس کے مصارف کے لئے منجملہ اور تدابیر کے

ایک صورت یہ بھی نکالی گئی تھی کہ اپنے مقامی شاگردوں سے بخصوصیت پیشگی امداد چاہی گئی جس کے لئے فہرست بنوائی گئی اور وُہ فہرست سب شاگردوں کے پاس بھیجی گئی اور خود بھی اِس فہرست میں مرزا صاحب نے شرکت فرمائی وہ فہرست مہاراجہ کشن پرشاد مدارالمہام کے پاس پہنچی تو ممدوح نے اس پر مبلغ تین سو روپئے کی رقم اپنے قلم سے لکھی"۔

(انشائے داغ صہ ۳۸-۳۹)

فصیح اللغات کی طباعت کے لئے داغ نے اپنی طرف سے ۵۰ روپئے دئے (انشائے داغ صہ ۹) اور مہاراجہ بہادر سے تین ۳۰۰ سو روپئے دلوائے اور دوسرے شاگردوں نے بھی حسب مقدور دیا، اِس طرح تقریباً ایک ہزار روپیہ جمع ہوگیا، افتخار عالم اور احسن علیحدہ مکان لے کر ٹھہرے ہوئے تھے کھانا دونوں داغ کے پاس کھاتے تھے مگر ان کے ذاتی مصارف کے لئے داغ کچھ نہ دیتے تھے اِس لئے جب تک ان کے پاس وطن سے لایا ہُوا سرمایہ تھا انہوں نے خرچ کیا اور جب وُہ ختم ہوگیا تو اسی فصیح اللغات کے چندے کی رقم کو صرف کرتے رہے ؛

باوجود داغ کی کوشش کے افتخار عالم کو کوئی مُلازمت نہ مِل سکی اور وُہ خاموشی کے ساتھ وطن واپس ہو گئے اُن کے جانے کے بعد بھی احسن چند مہینے تک حیدر آباد ہی میں رہے اور اواخر جُون ۱۹۰۲ء میں وہ بھی چلے گئے، فصیح اللغات کے دو جزو نہایت گندہ کاغذ پر بڑی ہی خراب لکھائی چھپائی سے شائع ہوئے تھے جو مطبع شمسی ہی میں پڑے رہے جن کا حساب صاف نہیں کیا گیا، نہ صرف اِس لُغت کی طباعت کے اخراجات بلکہ

جلوۂ داغ کے کاغذ اور چھپائی کے اخراجات بھی مطبع کو وصول نہیں ہوئے تھے اور مطبع والے یہ سمجھ کر خاموش تھے کہ یہ کام داغ کا ہے اور وہ خود یہ رقم بھجوا دینگے، جلوۂ داغ کی طباعت کے اخراجات داغ نے پہلے ہی دیدیئے تھے اور اس کی جس قدر جلدیں فروخت ہوئیں اُن کی قیمت احسنؔ ہی لیتے گئے، داغ نے اس رقم کے متعلق کوئی شرط بھی نہیں کی تھی اُن کا منشا یہ تھا کہ کتاب کی فروخت سے جو رقم آتی جائے وہ احسنؔ بطور جیب خرچ کام میں لائیں مگر احسنؔ صاحب نے ہوشیاری یہ کی کہ طباعت کے اخراجات جو داغ نے دئے تھے وہ بھی اپنے صرف میں لائے اور حیدرآباد میں بیشتر لوگوں سے قرض دام بھی کیا، اس کی تفصیل داغ کے ان خطوط میں موجود ہے جو داغ نے احسنؔ مارہروی کو ان کے حیدرآباد سے جانے کے بعد لکھے تھے جنہیں اپنی بدنامی کے خیال سے احسنؔ نے انشائے داغ میں شریک نہیں کیا مگر اُن کے سعادتمند فرزند نے اِن خطوط کو "زبانِ داغ" میں شائع کر کے اپنی عالی ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔

محمد ابراہیم خاں مالک مطبع شمسی کے پاس مدت تک فصیح اللغات کے اوراق بطور ردی پڑے رہے چنانچہ میں نے بھی ایک آدھ جزو ان سے لے رکھا تھا جو ضائع ہو گیا کوئی خاص بات اس میں نہ تھی۔

دلی دربار

ملک معظم اڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کا جو دربار جنوری ۱۹۰۳ء میں دہلی میں

مُنعقد ہوا وُہ دہلی دربار کے نام سے مشہور ہے، اس میں ہندوستان کے سارے والیان ریاست شریک تھے چنانچہ حضورِ غفران مکان نے بھی شرکت فرمائی تھی اور داغ بھی ہمرکاب تھے، شاہی کیمپ میں ہزاروں آدمیوں نے جاکر داغ سے مُلاقات کی اور اکثروں نے اس کی تفصیل لکھی ہے مگر اس وقت صرف ۲ مضامین میرے سامنے ہیں ایک مضمون بیخود دہلوی نے "داغ کی شخصیت" کے عنوان سے ماہنامہ ساقی دہلی بابت مارچ ۱۹۴۰ء میں لکھا ہے اور دُوسرا مضمون مولوی عبدالرزاق کانپوری مولف البرامکہ کا ہے جو دہلی دربار کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مضامین "یادِ ایام" میں چھپا ہے۔

بیخود نے کوئی تفصیل نہیں لکھی البتہ عبدالرزاق کانپوری نے بڑی تفصیل لکھی ہے جو نقل کی جاتی ہے،

"دِلّی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز اُفتادہ رقبہ کوٹھی سے متعلّق تھا جس میں امرائے دولت کے سینکڑوں خیمے اور بارگاہیں تھیں، صدر پھاٹک پر ملٹری سپاہیوں کا پہرہ تھا اور ایک کمرے میں پولس آفیسر جمع تھے مُلاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وُہ ایک عرب تھا جب میں نے مرزا داغ سے مُلاقات کی تحریک کی تو اس نے درخواستِ مُلاقات کا کارڈ طلب کیا چنانچہ چند کارڈ پیش کئے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھہرے رہے ایک گھنٹہ کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا اور ان کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ میں جانے کی اجازت ہوئی"۔

"راستے میں صدہا خیمے نظر آئے جو ایک سے بڑھ کر ایک

شاندار تھے ہر خیمے کے دروازے پر شوخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ حروف میں صاحب خیمہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ ۳۵ منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا، اِن بارگاہوں کے قریب ہی کوٹھی تھی جس میں حضور نظام خواب راحت میں تھے۔ میرے بوٹ کے چرچر کی آواز آرہی تھی ایک پہرہ دار دوڑتا ہُوا آیا اور شریفانہ انداز میں فہمایش کی کہ آہستہ چلئے حضور آرام میں ہیں بُوٹ کی آواز کسی طرح خوابگاہ تک نہیں جا سکتی تھی تاہم حُکم کی بسر و چشم تعمیل کی گئی اس وقت مجھے صائب کا یہ شعر یاد آیا اور منشی رحمت اللہ رعد کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا ؎

اے صبا بر برگ ہائے غنچہ نہ آہستہ پا   پاسبا نانِ گُل ہا صائبا خوابیدہ است

میرے دوست نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مَیں نے جواباً کہا ؎

سودا کے جو بالین پہ گیا شورِ قیامت   خُدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

الحمد للہ منزل ختم ہوئی اور داغ کی بارگاہ تک پُہنچ گئے، صدر دروازے پر ایک چوبدار نے جس کی زرد مخملی وردی پر طلائی و نقرئی کام تھا چک اُٹھائی اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے پہلے گول کمرے میں بٹھائے گئے جس میں ایرانی قالین کا فرش تھا کُرسیاں سیاہ رنگ کی تھیں، چند منٹ بعد طلبی ہوئی دو درجے طے کر کے تیسرے درجے میں پہنچے تو یہ دیکھا کہ ایک

قوی الجثہ شیخ خیمے کی چوب تھام کر ہمارے استقبال کو اُٹھ رہا ہے کیونکہ چلنے سے معذور ہے اور پنڈلیوں پر گرم اُونی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں درد (عرق النسا) میں مُبتلا تھے، بارگاہ کا یہ حصّہ نہایت آراستہ تھا ایک جانب چاندی کا پلنگ بچھا تھا وسط میں قیمتی ایرانی قالین تھا اور وسط سے ذرا ہٹ کر چاندی کی ایک بڑی انگیٹھی میں آگ بھڑک رہی تھی"۔

"مرزا صاحب نے کھڑے کھڑے مصافحہ کیا پھر ہمارے اصرار پر بیٹھ گئے کارڈ سے نام تو پہلے ہی معلوم ہو چکے تھے اب نام بنام تعارف ہُوا اور بیٹھتے ہی میری جانب پیچوان بڑھایا اور ارشاد فرمایا شغل فرمائیے، مَیں نے عرض کیا پیر و مُرشد! خُدا نے اِس آگ سے مجھے اب تک محفُوظ رکھا ہے، فرمایا اس کا نعم البدل بھی موجُود ہے اجازت ہو تو ایک جام پیش کیا جائے اس لطیفے پر خُوب ہنسی ہوئی اور یہ محض شاعرانہ مذاق تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داغ اخیر عمر تک زندہ دِل تھے"۔

"میری کتاب البرامکہ ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکی تھی اور مرزا صاحب پڑھ چکے تھے چُنانچہ اِس کتاب کے بعض مضامین پر بحث ہوتی رہی اس کے بعد سُلطان سنجر سلجوقی کے متعلق مجھ سے چند سوالات کئے صحیح جواب ملنے پر بہت خوش ہوئے و حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور فرمایا کانپور پہنچ کر اپنا فوٹو بھیج دینا، میرے بعد مُنشی رحمت اللہ رعد سے مخاطب ہوئے اور فرمایا جناب رعد! آپ تو میرے ہم مشرب ہیں، رعد نے معذرت کی کہ

مسدس حالی کے بعد شاعری سے تائب ہو چکا ہوں تاہم دو تین غزلیں سنائیں جو قدیم رنگ شاعری کا نمونہ تھیں اس کے بعد موجودہ شاعری پر مناظرہ شروع ہوا، ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ اگرچہ ہماری شاعری عیوب سے خالی نہیں ہے لیکن اردو ادب کی ترقی کے لئے شاعری اور شاعروں کا بقا ضروری ہے، البتہ اِس امر کی ضرورت ہے کہ اُردو کانفرنس قائم کر کے اُس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے اور جو عیوب ہیں ان کی اصلاح کی جائے"۔

"جب یہ دلچسپ بحث ختم ہو گئی تو میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ (لغت اُردو) لکھی ہے تحقیقات لُغات اور مُحاورات اور زبان کی حیثیت سے اِس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے، فرمایا سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے، اور یہ کہہ کر خاموش ہو گئے مکرر سوال کرنا میں نے بھی ادب کے خلاف سمجھا اور اس جواب سے یہ نتیجہ نکالا کہ تحقیقات لُغات میں کوئی اعتراض نہیں البتہ فرہنگ کی زبان ٹکسال باہر ہے، کیونکہ عرب سرائے کی آبادی بیرون دِلّی ہے"۔

"انگیٹھی سے فاصلے پر چاندی کی ایک تپائی پر ریشمی بستے میں ایک کتاب رکھی ہوئی تھی، منشی رحمت اللہ نے اجازت لے کر اس کو کھولا اندر سے طلائی کام کی ایک جلد نکلی، رعدؔ نے خیال کیا کہ مصحف ہے چاہتے تھے کہ آنکھوں سے لگائیں اس پر مرزا صاحب کو ہنسی آ گئی اور رعدؔ بھی سمجھ گئے سرورق کھولا تو مہتاب داغ کا جلوہ

نظر آیا"

"یہ دکن کی پیداوار تھی رعدؔ نے جو اپنے تخلص کے اعتبار سے بلند آواز تھے ایک غزل پڑھی حاضرینِ بزم نے داد دی لیکن جناب داغؔ کی موجودگی میں رعدؔ کی یہ کڑک مجھے پسند نہ آئی میں نے مرزا صاحب سے عرض کیا کہ مسافر نوازی کی تو یہ شان ہے کہ جناب خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں درخواست منظور ہوئی رعدؔ سے دیوان لے کر کئی غزلیں سنائیں پڑھتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک بست سالہ نوجوان غزل پڑھ رہا ہے نہ آنکھیں پھڑکتی تھیں نہ ہاتوں کو حرکت تھی یہ محسوس ہو رہا تھا متن کے ساتھ شارح تفسیر کرتا جاتا ہے بیس۲ منٹ میں غزل خوانی ختم ہوئی، میری زبان سے برجستہ نکلا آج میں نے داغؔ نہیں ذوقؔ علیہ الرحمۃ کی زبان سے غزلیں سنی ہیں، ذوقؔ کا نام لیتے ہی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چند منٹ تک خاموشی رہی، اس علمی مذاکرے کے بعد چائے کی کشتیاں آئیں جن میں زرد پیالیوں کے سوا کل سامان نقرئی تھا بسکٹ، کیک، مٹھائیاں، پھل ہر قسم کے تھے خود شریک نہیں ہوئے کیونکہ ناشتہ کا وقت گزر چکا تھا اس درمیان میں چند اصحاب دہلی کے ملاقات کے لئے آئے اور ہم لوگ رخصت ہوئے مرزا صاحب نے مصافحہ اور دعائے خیر کے بعد جانے کی اجازت دی، افسوس ہے کہ داغؔ کی یہی پہلی ملاقات تھی اور یہی آخری"[1]

---

[1] یادِ ایام صفحہ ۲۵۰-۲۵۶،

داغ کی صحت

داغ کی صحت ابتدا ہی سے خراب تھی اس کی تفصیل انہوں نے ۱۲؍جون ۱۸۸۶ء کو ڈاکٹر عوض خاں مہتمم گلدستۂ عطار کانپور کو لکھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۶ء سے ان کے عوارض کا سلسلہ جاری تھا جبکہ ان کی عمر ۳۵ سال کی تھی،

"بیس برس ہوئے کہ ۱۸۶۶ء میں دورے پر تھا سردی کا زمانہ مہاوٹ کے دن برف باری کی کثرت تھی یکایک میرے بائیں شانے میں درد ہوا، مالش وغیرہ جو کی گئی تو شانے کے جوڑ میں پشت کی جانب گٹھلی پڑ گئی یہ ہاتھ دوبار ٹوٹ چکا تھا ماؤف تھا، بارہ برس تک اس گٹھلی نے کچھ تکلیف نہ دی، بعدہٗ یکایک درد کی شدت ہوئی کہ حوائی قلب تک اثر پہنچا، نوبت بجان پہنچی، بالاتفاق یہاں کے طبیبوں اور ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ پیپ پڑ گئی آخر شگاف کی نوبت آئی، زرد گٹھلی نکلی اور بہت سا جیتا گوشت انہوں نے کاٹ ڈالا، بہت بڑا زخم ہوا اس کا علاج ہونے لگا، السی کا پولٹس بندھنے لگا، صدہا دانہ پشت پر نکل آیا، منجملہ اور دانوں کے ایک دانہ نیلگوں پیدا ہوا جو کہ واقعی سرطان تھا وہ کاٹا گیا ایک دن میں سات منہ اس میں ہو گئے مرمر کر بچا، اب یہ حال ہے کہ کئی برس سے موسم گرما میں اس میں سوزش ہوتی ہے اور ورم ہو جاتا ہے

کچھ مادہ بھی آجاتا ہے، دس مہینے ہوئے کہ فصد، مسہل ہوئے، جونکیں لگیں یونانی طبی علاج ہوئے خدا خدا کرکے شفا ہوئی مگر ساٹھ برس کی عمر میں ہر سال دو ایک فصدیں دو ایک مسہل جب ہوں تو پھر طاقت کہاں؟ میرے قویٰ بہت قوی تھے اس نے ضعیف کردیا، اور باہ میں بھی ضعف ہوگیا، جگر میں حرارت ہے خون فاسد پیدا ہوتا ہے، معدے میں رطوبت ہے، ہاضمہ خراب ہے اس پر ریاح بواسیری، میرا رنگ چمپئی تھا اب سیاہ ہوگیا، صفرا محترق ہوکر سودا ہوتا ہے، ذراسی گرمی برداشت نہیں، اب کے رمضان میں جو روزے رکھے پشت میں وہ سوزش ہوئی کہ آٹھ دن سے ایک انگارا رکھا ہوا ہے، کل جونکیں لگیں اور زیادہ آگ لگ گئی، آج اور لگائی جائیں گی مجھ کو زندگی کا لطف نہیں اور پاس بھی ہے وہ دوا مجھ کو کہاں سے میسّر ہو کہ جو مصفیٰ خون و مقوی معدہ ہو اب تک یہ حال ہے کہ باوصف ضعفِ باہ تجرید سے حرارت ہوتی ہے، مَیں عاشق مزاج ہوں دل میں ہر وقت آگ لگی رہتی ہے[1]"

اُس وقت داغ کی عمر پچپن سال تھی مگر اُنھوں نے ساٹھ سال اندازہ کیا ہے چونکہ پچپن سے آگے بڑھ گئے تھے اِس لئے یہ اندازہ درست ہی تھا، داغ اُس خاندان کے چشم و چراغ تھے جو سمرقند و بخارا سے آیا تھا خاندان کے سب افراد سُرخ و سفید تھے والدہ بھی کشمیر جنت نظیر کی تھیں مگر قدرت نے

---

[1] مسودات رامپور و اردو ادب علیگڑھ ستمبر ۱۹۵۶ء ص ۳۶-۳۷،

انہیں چمپئی رنگت دی تھی جو بعد کو سیاہ ہوگئی، قد و قامت ناک نقشہ تمام چیزیں خاندان سے ملتی تھیں صرف ایک رنگ ہی تھا جو اُس خاندان سے دُور کر رہا تھا اور اسی رنگ کی وجہ سے اکثر لوگ ان کو اس خاندان کا فرد ہی نہیں شمار کرتے تھے یہ داغ کا قصور نہیں بلکہ والدین اور خصوصاً والد کا گناہ تھا جو ان کی سیاہ رنگت کا باعث ہُوا یہ مرضِ سودا اور سائیکوسس کے اثرات تھے جو داغ کالے پیدا ہوئے یا بعد میں کالے ہو گئے +

بُخاری و مُسلم کی مُتفقہ روایت ہے کہ

"ایک دیہاتی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری بیوی نے ایک سیہ فام بچہ جنا ہے جو میرے نُطفہ سے نہیں ہے رسولؐ اللہ نے فرمایا کیا تیرے پاس اُونٹ ہیں؟ اس نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا ان کے بالوں کی رنگت کیسی ہے؟ عرض کیا سُرخ! فرمایا،

"سُرخ اُونٹوں کے بچے خاکستری رنگ کے کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ عرض کیا کوئی رنگ ہے جس نے ان کو خاکی رنگ دیا، فرمایا شاید اسی رنگ نے تیرے بچے میں کالا رنگ پیدا کر دیا ہو"

اِس رنگ کے اختلاف سے داغ کو شمس الدین خاں کی اولاد تسلیم نہ کرنا ظُلم ہے کیونکہ بیشتر گھرانوں میں ایسا ہوتا ہے میرے اجداد بھی بخارا کے تھے میرے دادا نہایت سُرخ و سپید اور بالکل ولایتی معلوم ہوتے تھے والد مرحوم کا رنگ اتنا صاف نہ تھا مگر گورے وُہ بھی تھے، مَیں بچپن میں نہایت ہی صاف رنگ کا تھا جوانی میں بھی سُرخ و سفید رہا جُوں جُوں آلام و افکار و امراض میں گرفتار ہوتا گیا، رنگت بدلتی گئی اب مَیں بھی تقریباً سیاہ رو ہو گیا ہوں

مگر میرے بچّے میری خاندانی رنگت پر رہیں ممکن ہے یہ بھی بڑے ہو کر میری طرح کالے ہو جائیں اِس لئے مَیں رنگت کے اختلاف کو اہمیت نہیں دیتا،

داغؔ کو بچپن میں چیچک نِکلی تھی اور مختلف مزمن عوارضات خصوصاً فسادِ خُون، کمزوریٔ اعصاب، ضُعفِ معدہ، ضُعفِ باہ وغیرہ میں مُبتلا رہے، عُمر بھر انہیں یہ امراض ستاتے رہے اور اسی وجہ سے وُہ صاحبِ اولاد بھی نہ ہو سکے، ایک لڑکا شروع میں پَیدا ہُوا بھی تو جی نہ سکا اور یہ اچھا ہی ہُوا ورنہ وُہ معذور یا مجذُوم ہوتا،

داغؔ کے بیشتر خطوط بیماریوں کے تذکرے سے بھرے ہوئے ہیں اُن میں سے چند کا اقتباس پیش کرتا ہوں،

"کل بروز سہ شنبہ دارد دہلی ہُوا راہ میں بشدّت حرارت مزاج میں پَیدا ہو گئی کہ اب تک ہر بن مُو سے نیش زنبور کی کیفیّت ہے، آتشِ سوزاں بھڑک رہی ہے"

(بنام خُلدآشیاں) ۱۱ راگست ۱۸۸۸ء

"فدوی کل صُبح کو پانچ بجے دِلّی پُہنچا گرمی کی شدّت نے تمام بدن میں آگ لگا دی ہے"

(بنام خُلدآشیاں) ۳۰ رمئی ۱۸۸۸ء

"چار مہینے سے ضُعفِ معدہ میں سخت مُبتلا ہوں"

(بنام بیخود دہلوی) ۲۵ ردسمبر ۱۸۹۳ء

"اِس وقت مَیں فی الجملہ صحیح ہوں دوا چلی جاتی ہے ایک مہینے تک دردِ نقرس کا پابند رہا"

(بنام کنور اعتماد علی خاں) ۱۶ راپریل ۱۸۹۶ء

"دو مہینے سے بیمار جاں بلب ہوں اب ذرا سنبھلا ہوں مگر علیل ہوں دَوران سر سے عاجز ہوں"

(بنام اطہر ہاپوڑی) ۲۷ر جون ۱۸۹۷ء

"کئی دِن سے ذات الجنب میں مُبتلا ہوں سخت تکلیف ہے ایک مرض کو خفّت ہوتی ہے تو دُوسرا پیدا ہوتا ہے، اللہ شافی ہے"

(بنام محمود خاں) ۲۲ر ستمبر ۱۸۹۷ء

"مجھ کو وجع مفاصل کی شکایت ہے"

(بنام ذوالفقار علی خاں گوہر) ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۲ء

"میری زندگی از سرِ نو ہوئی، مجھ کو بند تخمہ پڑا، شدید درد ہُوا اور قولنج رِیاحی، پھر تپ کی شدّت ہوئی، رِیاح بند اجابت کیسی؟ دو ولایتی ڈاکٹروں نے علاج کیا کچھ نہ ہُوا، آخر جواب دے دیا، یُونانی علاج راس آیا، کہ دست آئے سُدّے برآمد ہوئے درد مِٹ گیا، تھوڑی تپ باقی ہے، پاؤں چلنے میں لڑکھڑاتے ہیں، ضُعف کو قوت ہے نو دِن سے اِس بلا میں مُبتلا ہُوں"

(بنام واقف شمس آبادی) ۳ر اکتوبر ۱۹۰۳ء

"مجھ کو تخمہ پڑا تھا ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا خدا نے زندگی کردی مگر وجع مفاصل سے جوڑ جوڑ میں درد ہے"

(بنام اولیا بیگم) ۲۲ر نومبر ۱۹۰۳ء

"میری طبیعت اب تک صحیح نہیں ہوئی وجع مفاصل کی تکلیف ہے اس کی دوا ہورہی ہے (بنام بیخود دہلوی) ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۳ء

میری طبیعت نادرست ہے ضُعف معدہ اور وجع مفاصل کی شکایت سے نہایت تکلیف ہے"۔

(بنام نسیم ہلسوی) ۷ر فروری ۱۹۰۴ء

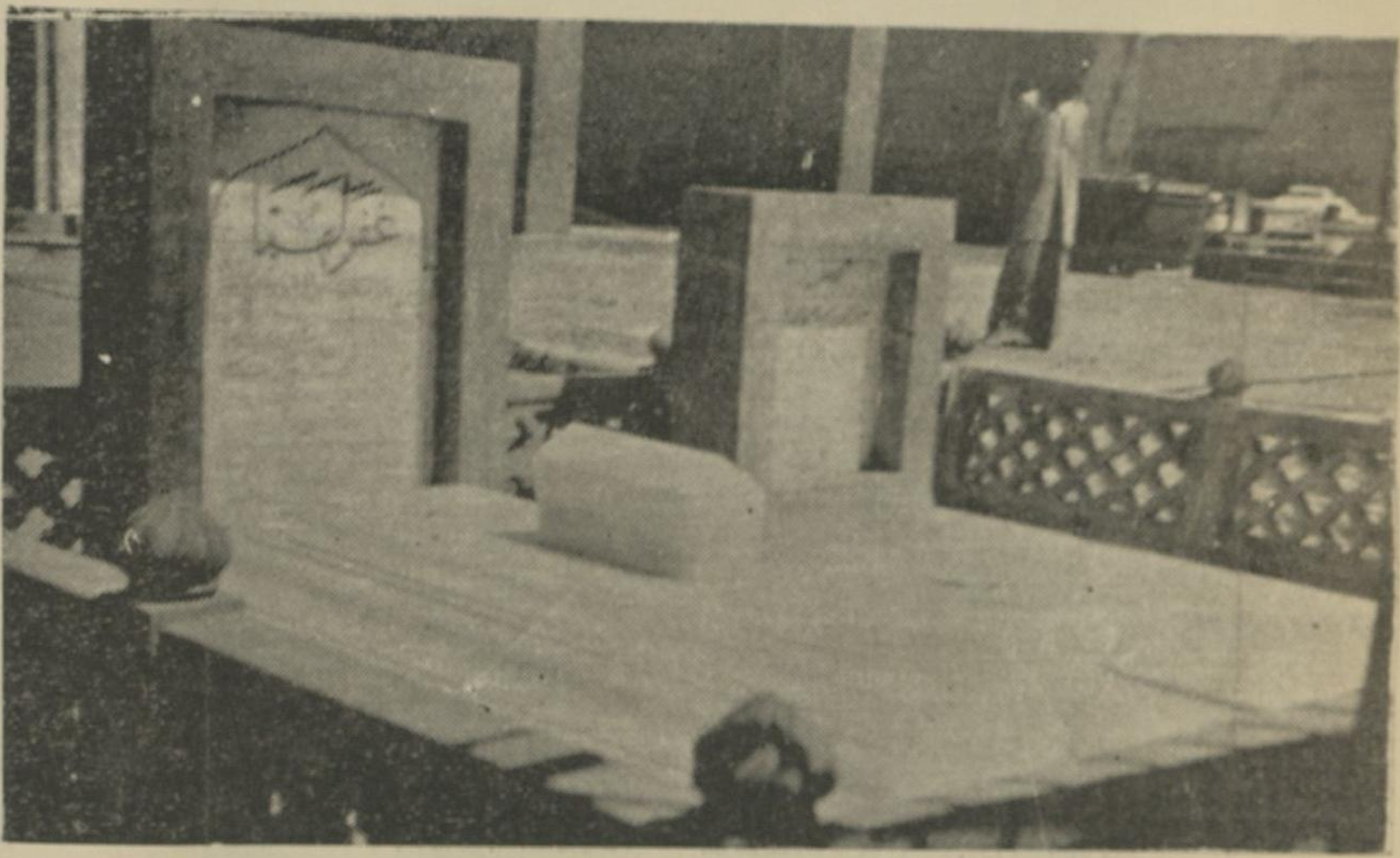
"آجکل مُختلف امراض کا شکار ہُوں"

(بنام ناطق گلاوٹھی) ۴ر جولائی ۱۹۰۴ء

وفات

خُون کے دباؤ کا عارضہ پہلے ہی سے تھا مگر آخری عُمر میں اس میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا، دَورانِ سر اکثر رہتا تھا، ایک مرتبہ فالج بھی ہوچکا تھا، جو مقامی اطبّا کے عِلاج سے جاتا رہا اور تندرست ہوگئے تھے مگر تہتّر سال کی عُمر تک مختلف عوارضات میں مُبتلا رہنے کی وجہ سے اعضائے رئیسہ جواب دے چکے تھے اور انہیں خود اپنی زندگی اجیرن ہوگئی تھی،

اِنتقال سے چار مہینے پہلے سے ابوالحمید آزاد اور دوسرے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ اب ہماری زندگی کے دِن ختم ہوچکے ہیں ہم کچھ دِن کے مہمان ہیں، ایک دفعہ آزاد نے کہا اُستاد! آپ ہمیشہ ایسا ہی کہا کرتے ہیں چار سال پیشتر بھی تو آپ نے ایسا ہی فرمایا تھا، اب بھی انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا، داغ نے کہا نہیں میں خراب شگون مُنہ سے نکالنے کا عادی نہیں ہوں لیکن اِس بات کا مجھے یقین کامل ہے کہ میری مَوت کے دِن قریب آپہنچے، انہوں نے کہا اُستاد! آپ تو غیب دان ہوگئے، کہنے لگے



مزار داغ و اہلیہ داغ واقع درگاہ حضرت یوسف شریف
نام پلی، حیدر آباد دکن





درمیان میں استاد داغ ۔ سیدھی طرف پیچھے کھڑے ہوئے ناصرالدین احمد خان، داغ کے نواسے بائیں طرف بیٹھے ہوئے سید رضی الدین حسن کیفی

تمہیں معلوم ہے مجھے عطر کا شوق کس قدر تھا، اب عطر سونگھتا ہوں تو بُو محسوس نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے قوت شامہ بیکار ہو گئی ہے، اسی طرح گانا سُننے کا مجھے بے انتہا شوق تھا مگر اب گانا سُنتا ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے، غزل کہنے اور سُننے سے طبیعت گریز کرتی ہے، لوگوں سے ملنے جُلنے اور بات چیت کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا، بس دِل چاہتا ہے کہ تنہا پڑا رہوں ۔

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے   اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

اِس گفتگو کے چوتھے مہینے ہی چل بسے،

احسن مارہروی چونکہ داغ کے اِنتقال کے وقت پاس نہ تھے اس لئے انہوں نے نواب حسن علی خاں امیر سے داغ کے انتقال کے حالات دریافت کئے تھے، حسن علی خاں نے ۲۲ رمضان ۱۳۲۳ھ کو ایک طویل خط کے ذریعہ پُوری تفصیلات لکھ بھیجی ہیں اِس خط کو رفیق مارہروی نے بزم داغ میں شائع کر دیا ہے، چونکہ بزم داغ میں رفیق صاحب نے مَن مانے غلط سلط باتوں کا اضافہ کر دیا ہے اِس لئے ان خطوط کو نقل کرنے سے پہلے مَیں نے برادرم میر یاسین علی خاں کی وساطت سے یہ خطوط رفیق صاحب کے پاس سے منگوا کر مقابلہ کر لیا ہے، شُکر ہے کہ ان خطوط کو رفیق نے بجنسہٖ نقل کیا ہے اِس لئے مَیں بزم داغ سے نقل کر رہا ہوں،

بھائی صاحب مشفق مہربان کرم فرمائے مُخلصان سلمہ اللہ الرحمٰن

"سلام شوق اور آرزوئے مُلاقات کے بعد مدعا نگار ہوں، ابھی آپکا پرچہ فصیح الملک پہنچا، آپ نے مجھ سے کچھ حالات اُستاد مرحوم کے دریافت کئے تھے مَیں بچے[1] کی شادی کے کاروبار میں مصروف تھا،

---

[1] نواب میر حسن علیخاں امیر کے ایک ہی صاحبزادے میر آصف الدین تھے جن کی شادی انہیں دنوں ہوئی تھی انہیں کے فرزند میر یاسین علیخاں بی، اے (علیگ) انکم ٹیکس آفیسر ہیں،

فرصت نہ ہوئی معافی چاہتا ہوں، دو چار روز پیشتر صاحب عالم[1] تشریف لائے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ احسن صاحب بھائی صاحب کی وفات کے زمانے کے حالات مانگتے ہیں اور تاریخ بھی،

بھائی صاحب! اُستاد مرحوم کے ایامِ مرض کے پورے پورے حالات نہ صاحب عالم کو معلوم نہ سراج الدین خاں کو صاحب عالم تو رات میں ایک دفعہ اور دن میں ایک وقت اُستاد مرحوم کے پاس آ کر دو چار منٹ باتیں کر کے جاتے تھے مگر مرزا سراج الدین بہادر[2] نے آغاز بیماری سے روز انتقال تک مُڑ کر بھی اس طرف کو نہ دیکھا اور نہ ناصر نے دیکھا اور مرزا سراج الدین خاں آپ ہی مرض اختلاج میں مبتلا ہو گئے جو کوئی ان سے بیمار کے پاس جانے کو کہتا تھا وہ جواب دیتے تھے کہ بیمار کو حالات مرض میں مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، البتہ روز تفریح کے لئے حیدرآباد کلب میں اور منشی محمود علی صاحب کے مکان پر چوسر گنجفہ وغیرہ کھیلنے جایا کرتے تھے، ناصر[3] بائیسکل پر بیٹھ کر اپنے یاروں میں سرگرداں، حالت مرض میں روزانہ اُستاد مرحوم نے مرزا سراج الدین خاں اور ناصر کو بار بار یاد کیا اور کہا گیا گھر میں نہیں ہیں، موجودہ لوگوں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ گھر میں نہیں ہیں،

۱؎ مرزا خورشید عالم برادر اخیافی داغ، ۲؎ سراج الدین احمد خاں سائل ۔
۳؎ ناصر الدین احمد خاں فرزند لاڈلی بیگم ۔

"بھائی! اِس قسم کے لوگ سنگ دِل مَیں نے آج تک نہیں دیکھے، ادھر صاحب عالم اپنے مرض میں مُبتلا، خدمتگاروں اور عبدالغنی خاں نے بیمار داری اور نگرانی کی، بیمار ہونے کے حالات سُنئے، ۲۹ر ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ کو انہیں نزلے کی تحریک ہوئی پائینِ صحن جا بیٹھے، دفعتاً زبان میں لُکنت ہوئی، وہاں سے اُٹھے عبدالغنی کو بُلایا اور یہ کہا کہ ایک بات میرے مُنہ سے لُکنت کے ساتھ نکلی اب اس کا اثر کچھ نہیں ہے پھر مجُھ سے باتیں ہوتی رہیں مَیں نے گھر جانے کو کہا تو مجھُ سے کہنے لگے کھانا کھا کر جاؤ مَیں بیٹھا رہا، ۸ بجے حسب عادت کھانا آیا، میرے لئے گاڑی کا حُکم دیا مَیں سوار ہو کر چل دیا، ۳۰ر ذیقعدہ کو پانچ بجے گیا، اُستاد تخت پر نہایت عُمدہ کوٹ پہنے بیٹھے اور رُوبرو مُنشی لطیف احمد اور حافظ جلیل حسن صاحب بھی ہیں، مَیں جب قریب پُہنچا تو میرے لئے اُستاد مرحوم اُٹھ کھڑے ہوئے سلام کر کے مَیں پاس اُن کے بیٹھ گیا، اتنے میں ولیعہد بہادر[1] کا لفافہ لے کر سوار آیا اس کو دیکھ کر مجھُ سے فرمایا کہ یہ چوتھا لفافہ ہے، لفافہ مجھے دیا مَیں نے اُسے کھولا مضمون سُنا دیا، کسی محاورے کے باب میں ولیعہد نے یہ لکھا تھا کہ میرا پہلا لفافہ بھیج دیجئے تاکہ مَیں اپنے لفظ دیکھوں، مجھُ سے فرمایا وہ ڈیکس[2] میں سے نکالو

---

[1] ولیعہد بہادر سے مُراد نواب میر عثمان علی خاں بہادر ہے، حضور کو بچپن سے تحقیق الفاظ و محاورات کا شوق تھا اُسی زمانے میں حضور نے شعر کہنا شروع فرمایا تھا اور اپنی غزلیں داغ ہی کے پاس بغرض اصلاح بھجوایا کرتے تھے انہیں غزلوں کی رد دیکھو صفحہ ۱۸۴)

ہر چند تلاش کیا مگر وُہ نہ ملا، اُس وقت دوات قلم کاغذ طلب فرمایا اور اپنے ہاتھ سے لکھنا شروع کیا جب دو چار سطریں انہوں نے لکھیں، لطیف میاں نے کہا حضرت! آپ کیا کر رہے ہیں کاغذ پر جو آپ نے لکھا ہے کوئی حرف معلوم نہیں ہوتا اُستاد نے انہیں جواب دیا بھائی میرا دماغ نزلے سے بند ہے، کیا کروں پھر مجھ سے کہا میاں! تم لکھو وہ کہتے تھے مَیں لکھتا تھا لفافہ بند کر کے سوار کو دیا اور خط میں ولیعہد کو نزلے کا حال لکھا، قبل مغرب حافظ صاحب اور لطیف میاں رُخصت ہوئے، اُستاد نے عبدالغنی کو یاد کیا اور اُن سے کہا لُعاب بہدانہ، لُعاب گاؤزبان تیار کرو، مجھ سے کہا اندر چلو، آٹھ بجے شب کو مَیں نے رُخصت ہونا چاہا تو کہا کھانا کھا کر جائیے، اُسی وقت کھانا منگا کھانا آیا تو کہا مجھے بھوک نہیں آپ کھا لیجیے، مَیں نے عبدالغنی کو ساتھ لے کر کھانا کھایا، اُستاد لطیف جان سے ہنستے رہے، دس بجے مَیں وہاں سے چل دیا، مَیں اپنی حالت اِس جگہ عرض کرتا ہوں، اُستاد کو چھوڑ کر جانے کا یہ سبب تھا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۳) اصلاح کے سلسلہ میں محاوروں کی بحث پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے متعلق استفسارات فرمایا کرتے تھے۔

؎ داغ کے انتقال کے بعد سراج الدین احمد سائل نے ان کا سامان ہراج کیا تو وُہ تخت جس پر داغ بیٹھا کرتے تھے کیفی نے اور یہ ڈیکس جس پر کاغذ رکھ کر داغ لکھا کرتے تھے والد مرحوم نے خرید لیا تھا یہ ڈیکس اب تک موجود ہے ۱۲

میرا نواسہ[1] اُس زمانے میں بُخار سے سخت علیل ہو گیا تھا، اُستاد خود روزانہ آکر دیکھتے تھے، اس سبب سے وُہ آپ ہی مجھے رُخصت کر دیا کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر مَیں نے اپنا مکان چھوڑ دیا تھا ملک پیٹھ میں ایک کوٹھی سَو روپیہ کرایہ پر لے کر ٹھیرا ہُوا تھا، زنانہ مردانہ سب وہیں تھا، خیر صُبح کے ۹ بجے میں پھر اُستاد کے پاس گیا تو کیا دیکھتا ہُوں کہ اُستاد بند کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ نواب! مجھ پر فالج گرا اور آبدیدہ ہوئے، مَیں نے تسلی دی اور پُوچھا کہ کیا گزری تو اُستاد نے کہا کہ حسب عادت ۴ بجے رات اُٹھ کر وضو کیا جب پَیر دھویا تو زُبان میں لکنت ہوئی اور ہاتھ کانپے جمال صاحب نے تولیے سے ہاتھ پَیر کا پانی خُشک کیا، اُستاد نے نماز پڑھی جمال صاحب کا بیان ہے کہ سجدہ کبھی کسی طرف کیا کبھی کسی طرف، نماز سے فارغ ہو کر شبیح محمد کو کہا حکیم نابینا صاحب[2] کو جا کر لاؤ، حکیم صاحب نے گاڑی واپس کی اور چار گولیاں بھیجیں کہا جاتے ہی ۲ دو گولیاں کھلاؤ بارہ بجے ۲ دو گولیاں، چار بجے گاڑی لاؤ مَیں آتا ہوں، اُسی وقت ۲ دو گولیاں کھلائی گئیں، دروازے کمرے کے بند کر دئیے اعلیحضرت کو بذریعہ

---

[1] نواب حسن علی خاں کی بڑی صاحبزادی نواب رحیم یار جنگ بہادر سے بیاہی گئی تھیں جن کے بطن سے یہ صاحبزادہ تولد ہُوا تھا ان کا نام نصیرالدین خاں تھا، اڈنبرا سے ایم، اے کیا تھا، سنٹرل ریکارڈز آفس کے ڈائرکٹر تھے، وظیفہ پر سبکدوش ہوتے ہی انتقال کیا بڑی اچھی صلاحیتوں کے اور صاحب ذوق تھے، [2] حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری برادر ڈاکٹر انصاری مرحوم، ۱۲

عرضداشت اطلاع کی گئی، دس بجے ایک دست ہُوا جس کا رنگ سیاہ اور نہایت بُری بُو کا تھا، اعلیحضرت نے حکیم صاحب کو لکھ بھیجا کہ میرے اُستاد کا علاج دِل لگا کر کیجیے اور وقتاً فوقتاً مجھے اِطّلاع ہو۔ حکیم صاحب ۵ بجے آئے مریض کو دیکھا اور اطمینان ظاہر کیا، اور ہم سے کہا کہ قوائے قلب وغیرہ سب اچھے ہیں ذراسی ہوا لگ گئی ہے انشاء اللہ تعالیٰ ۲ دور وز میں اچھے ہو جائیں گے، دوا غذا میری رائے کے موافق ہو، پھر دست ہوئے ہوش حواس سب اُن کے درست تھے مگر تمام دن بیچینی زیادہ رہی شب میں کرب بہت رہا، ۲ ذی الحجہ کو حکیم صاحب نے مُرغ اور جنگلی کبوتر کا شوربا دینے کا حُکم دیا، اُستاد نے نزدیک اپنے مجھے بُلا کر کہا کہ نواب میرا ہاتھ ایک پہر نہیں اُٹھتا، صاحب عالم سے بھی کہا، ہاتھ پیر کی بیکاری پر روئے مگر اس میں حرکت پیدا نہ ہوئی، حکیم صاحب سے صُبح مَیں نے کہا تو حکیم صاحب نے جواب دیا کہ ۲ دور وز میں کھُل جائیں گے، اِس کا خوف نہ کیجئے دُوسرے روز مدارالمہام نے تر کی صاحب کو عیادت کے لئے بھیجا، مَیں نے خود جا کر اُستاد سے کہا کہ مدارالمہام نے تر کی صاحب کو بھیجا ہے اُس وقت چوکی پر تھے مجھ کو جواب دیا ابھی بُلوا تا ہوں، تھوڑی دیر کے بعد سالار آیا اور مجھ سے کہا کہ تر کی صاحب کو لے جائیے، مَیں تر کی صاحب کو لے گیا، اُستاد لیٹے ہوئے تھے تر کی صاحب نے آداب عرض کی جواب سلام کا دیا، تر کی صاحب نے کہا فصیح الملک بہادر! لوگوں نے آپ کو میری طرف سے

بدگمان کیا ہے اور جھوٹ کہا ہے میں آپ کا چالیس برس کا
نیاز مند ہوں آپ نے تو میرے ساتھ نیکی کی ہے اور یہ کہا کہ
ایک بکری منگواؤ اور اس طرح اس کی قربانی کرو پھر اُستاد نے
آنکھیں بند کرلیں ترکی صاحب بیٹھے رہے پھر ترکی صاحب نے
مجھ سے کہا کہ سرکار نے جلدی آنے کا حکم دیا ہے، میں نے کہا
اُستاد کو اطلاع کرو اور پوچھو ترکی صاحب نے کہا آپ ہی
پوچھ لیجئے میں نے اُستاد کو جگایا اور کہا کہ ترکی صاحب کو سرکار
نے یہ حکم دیا ہے کہ آپ کی کیفیت جلدی لائیں تو اُستاد نے فرمایا
دوات قلم کاغذ منگواؤ اور آپ کو سب حال معلوم ہے لکھ دو،
میں نے ابتدائے مرض سے اِس وقت تک کا حال لکھا، پھر
اُستاد سے کہا کہ لکھ چکا ہوں دستخط کون کرے گا مجھ سے فرمایا
دستخط اپنے کرو، جب میں نے دستخط اپنے کرکے کہا بند کردوں تو
فرمایا یہ فقرہ لکھو اور بند کردو وُہ فقرہ اُستاد کی زبان کا یہ تھا
"آپ نے ترکی صاحب کو میری عیادت کے لئے بھیجا، میں
نہایت ممنون ہُوا، ترکی صاحب نے پھر عرض کی، مدارالمہام
صاحب نے فرمایا ہے کہ آپ جس قسم کی مدد مجھ سے چاہتے ہیں
اس کو پُورا کرنے کو میں حاضر ہوں، اُستاد نے اس کا جواب دیا
اعلیٰحضرت نے سب کچھ دیا ہے آپ سے کوئی ضرورت نہیں،
ہر روز تین چار سوار مدارالمہام کے مزاج پُرسی کے لئے آتے رہے
پانچ چھ روز مزاج ایک حالت پر رہا ساتویں تاریخ حکیم
صاحب نے نبض وغیرہ دیکھ کر کہا کہ اب میں آپ کو مُبارکباد

دیتا ہوں کہ آپ اچھے ہو گئے، اُستاد نے حکیم صاحب سے کہا کہ گانا سُننے کی اجازت دیجئے حکیم صاحب نے کہا ضرور سُنئے اُستاد نے فرمایا گُناہ آپ کے سر پر، حالت مرض میں بھی اُستاد مرحوم ایک ایک سے ہنستے تھے خصوصاً لطیف جان سے،

ساتویں تاریخ تمام دِن مزاج اچھا رہا شب میں آٹھ بجے مُرغ، کبوتر اور بٹیروں کا شوربا تیار کرایا گیا تھا، ۲ تولہ پھلکا اور شوربا اور ایک کوفتہ خواہش کے ساتھ منگوا کر حسب رائے حکیم صاحب کھایا، پانچ تولے پانی پیا پھر کہا تھوڑا سا پانی اور دو لطیف جان نے ۲ تولے پانی اور دیا، دانت منگوائے مُنہ میں لگائے، پان کھایا اور ہر ایک سے کہا خُدا نے بچا لیا، گیارہ بجے رات کو مَیں سوار ہو کر ملک بیٹھ چل دیا تمام رات وُہ اچھے رہے صُبح سب سے بات کی حکیم صاحب کو رُقعہ لکھوایا صُبح سے گو نہ بُخار تھا دس ۱۰ بجے دفعتاً بُخار زیادہ ہُوا بے ہوش ہو گئے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا چاہتے تھے مگر کھُلتی نہ تھیں بارہ ۱۲ بجے تنفس ہو گیا، حکیم صاحب ۴ بجے آئے ۲ دوایک اُدویات ساتھ لائے تھے آدھے آدھے گھنٹہ کے فصل سے دیں تنفس اور بڑھ گیا حکیم صاحب نے کہا پیچھے بڑا تکیہ لگا کر بٹھاؤ، ویسا ہی کیا گیا اس سے تنفس میں کچھ کمی ہوئی، سیدھا ہاتھ دم بدم اُٹھاتے تھے حکیم صاحب نے عبدالغنی سے پُوچھا دواء المسک ہے؟ غنی نے کہا ہے، چھ ماشہ پانی میں گھول کر پلائی، آدھ گھنٹہ دیکھتے رہے، پھر کہا چھ ماشہ اور اسی طرح پلاؤ، پھر پلایا، تھوڑی دیر کے بعد نبض بگڑ ی

حکیم صاحب مریض کے پاس سے اُٹھے باہر آئے ہم اور صاحب عالم ان کے ہمراہ آئے اور ہم نے پُوچھا کہ حکیم صاحب! کیا ہو گا؟ حکیم صاحب نے کہا کہ اُمید کم ہے اور مایُوسی زیادہ، گھر جا کر ایک دوا بھیجتا ہوں اگر ہوش آ گیا تو بچ گئے، حکیم صاحب سوار ہوئے صاحب عالم نے مجھ سے کہا کہ حکیم صاحب کا بیان اعلحضرت کو لکھنا چاہیئے، اور یہ بھی لکھنا چاہیئے کہ اب ڈاکٹروں کو بھیجئے صاحب عالم نے مجھ سے کہا کہ آپ عرضی لکھئے میں اُستاد کے پاس جا رہا تھا کہ مولٰنا نے مجھے آواز دی کہ نواب صاحب جلدی آئیے میں اور عزیز یار جنگ، عبدالغنی خاں، مظفّر علی، پیرجی جو باقی باللہ صاحب کے سجادہ ہیں اُسی روز دِلّی سے آئے تھے، ہم چاروں اُن کے کمرے میں گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ہاتھ کی حرکت بند ہوئی، ہم نے تکیہ نکالا اور پلنگ پر لٹا دیا، اس وقت ہم چاروں نے کلمۂ طیّب پڑھنا شرُوع کیا، اُستاد کے مُنہ سے اللہ اللہ اللہ جاری تھا، لطیف جان نے رونا پیٹنا شروع کیا اللہ اللہ پر خاتمہ ہو گیا، اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن"

(بزمِ داغ صفحہ ۲۳۸ - ۲۴۶)

داغ ہمیشہ آرزو کرتے تھے کہ خُدا حج کے روز موت دے، چُنانچہ دُعا قبول ہوئی اور ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے، عُمر بحساب قمری ۷۶ سال اور بحساب شمسی ۷۴ سال تھی ولادت بھی اسی مہینے میں ہوئی تھی اور وفات بھی اسی مہینے میں ہوئی،

حضورِ غفران مکان کو داغ کے اِنتقال کی اطلاع ملی تو بے انتہا افسوس

فرمایا اور حسب دستور تجہیز و تکفین کے لئے تین ہزار روپئے سرفراز فرمائے، مکّہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھانے کا حکم ہُوا، یہ اعزاز بھی داغ کی قسمت میں تھا کہ حیدرآباد کی اس مسجد میں جہاں صرف بادشاہوں اور اقرباء شاہی اور خاص خاص لوگوں کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، داغ کی نماز جنازہ بھی پڑھی گئی ❖

نماز عید اضحیٰ کے ختم ہوتے ہی داغ کے جنازے کی نماز ہوئی ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا، میّت نام پلی میں حضرت یوسف صاحبؒ، حضرت شریف صاحبؒ کے مزار کے پائین میں اُن کی بیوی کے بازو دفنائی گئی،

والد مرحوم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اُستاد کے جنازے کی نماز میں لاکھوں آدمی تھے اور یہ سب چار مینار تک میّت کے ساتھ آئے چونکہ عید کا روز تھا اور سبھوں کو اپنے اپنے گھر پہنچ کر قربانی کرنی تھی اس لئے بیشتر آدمی اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے اور پھر بھی تقریباً ایک ہزار آدمی درگاہ شریف تک ساتھ رہے، تدفین کے وقت بیشتر شاگرد، امراء اور عُہدہ دار آ گئے تھے جو تدفین تک ٹھہرے رہے، مگر یہ بات خصوصیّت سے فرمایا کرتے تھے کہ، اُستانی کی تدفین میں جتنے لوگ شریک تھے اُستاد کی تدفین میں اُس سے کم تھے،

وجہ صاف ظاہر ہے مشہور کہاوت ہے کہ "قاضی جی کی لونڈی مری تو سارا شہر آیا اور قاضی جی مرے تو کوئی نہ آیا"، پھر بھی یہ داغ کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی تدفین میں اتنے لوگ بھی شریک رہے،

داغ کی میّت کا جلوس اُسی طرح گیا جس طرح امراء کی میّتیں جایا کرتی تھیں مُغل فقیر، مولود خواں وغیرہ ساتھ تھے سرکاری زرّین شامیانہ جنازے پر تھا جس کے رُوپہرے ڈنڈے مزدور تھامے ہوئے چل رہے تھے ایک

ہاتھی پر دو طرف روٹیاں رکھی ہوئی تھیں جو راستہ بھر بانٹی گئیں، فاتحۂ سوم (زیارت) بھی بڑے ہی تزک و احتشام سے ہوئی،

داغ کی وفات کے دو مادے "نواب مرزا داغ" اور "فصیح الملک داغ"، مُستقل نکلے جنہیں سینکڑوں شاگردوں نے قطعہ بند کیا اور ان کے علاوہ بھی اچھے اچھے تاریخی قطعات ہزاروں کہے گئے، سب سے نفیس مرثیہ سَر اقبال نے کہا ہے

عظمت غالب ہے اک مدت سے پیوند زمیں ۔۔۔ مہدی مجروح ہے شہر خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی مَوت نے غربت میں مینائے امیر ۔۔۔ چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی بزم سُخن ماتم میں ہے

چل بسا داغ آہ میت اُسکی زیب دوش ہے ۔۔۔ آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے
اب کہاں وہ بانکپن وُہ شوخیٔ طرزِ بیاں ۔۔۔ آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی کہاں
تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پُوچھے گا سکوتِ گُل کا راز ۔۔۔ کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں ۔۔۔ آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں
جوہر رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال
پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال

کر دیا قُدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر ۔۔۔ داغ یعنے وصل فکر میرزا و درد و میر
شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہُوا ۔۔۔ دیدۂ خُوں بار پھر منت کش داماں ہُوا
بُلبل دہلی نے باندھا اِس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدائے خامشی　　آہ دِلسوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی
اور دکھلائینگے مضموں کی ہمیں باریکیاں　　اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رُلوائیں گے
یا تخیّل کی نئی دُنیا ہمیں دکھلائینگے
اِس چمن میں ہونگے پیدا بُلبلِ شیراز بھی　　سینکڑوں شاعر بھی ہونگے صاحبِ اعجاز بھی
اُٹھینگے آذر ہزاروں شعر کے بُت خانے سے　　مئے پلائینگے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لِکھی جائیں گی کتابِ دِل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت
ہُوبہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون　　اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دِل پر تیر کون
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہُوں مَیں　　تُو بھی رو اے خاکِ دہلی داغ کو روتا ہوں میں
آہ اے بیت الحرام مذہبِ اہلِ سُخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وُہ گُلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا　　یعنے خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں　　وُہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

فصاحت جنگ جلیل نے بھی ایک تاریخی قطعہ ۲۷ شعر کا بڑا ہی عُمدہ کہا ہے جس کا تاریخی مصرع ہے ع

صد حیف وُہ دِل کو دے گئے داغ

جلیل کا یہ قطعہ کئی جگہ طبع ہو چکا ہے،

والد مغفور (تجلّی) نے بھی کئی قطعے اور تاریخیں کہی ہیں، جو غیر مطبوعہ ہیں، ذیل کا قطعہ بہت ہی طویل ہے جس کا اِنتخاب پیش کرتا ہوں ؎

عید کی شب تھی مجھے فکرِ سخن — سامنے آیا مرے اک سیم تن
تھی رُخِ روشن پہ ہلکی سی نقاب — آنسوؤں سے تر تھی چشمِ سحر فن
مَیں نے پُوچھا اے مسیحائے زماں — دُشمنِ زہد و بُتِ تقوےٰ شکن
یہ تو کہہ تو ہے کلی کس پھول کی — کونسا گُلزار ہے تیرا وطن
گُل سا چہرہ کیوں ہے کملایا ہُوا — کہہ دے کیا ہے باعثِ رنج و محن
ہچکیاں لے لے کے وُہ کہنے لگی — چل دئے سب میرے یارانِ وطن
سب مجھے کہتے ہیں اُردو شاعری — ہے مرا اصلی وطن مُلکِ دکن
قدرداں تھے میر اور مرزا مرے — ذوق اور غالب تھے شمعِ انجمن
تھا امیرِ لکھنوی زینت مری — کھا گیا اس کو بھی یہ چرخِ کہن
رہ گیا تھا ایک اُستادِ جہاں — تھی اسی کی ذات سے شانِ سخن
آسمانِ شعر کا تھا آفتاب — لگ گیا افسوس اس کو بھی گہن
زینت افزائے کلامِ ماسبق — یادگارِ اوستادانِ کہن
صاف بندش صاف اسکی بول چال — تھا نرالا جس کا اندازِ سخن
اس کا ثانی اب نہ پائے گا کہیں — لاکھ چکر کھائے یہ چرخِ کہن
اس کے مضموں میں غضب کی سادگی — اسکے شعروں میں غضب کا بانکپن
نام تھا اس کا فصیح الملک داغ — ہے اسی کا مجھ کو اب رنج و محن
اب کریگا کون میری دیکھ بھال — اب سکھائے کون مجھ کو بانکپن
ہوگئی سُنسان بزمِ شاعری — ہوگئی ویراں غزل کی انجمن
آگ ہے دِل میں فراقِ داغ کی — کم نہ ہوگی حشر تک اس کی جلن
داغ کا یہ داغ مٹنے کا نہیں — جائیگا دِل سے نہ یہ رنج و محن
خاک میں ہے تیری پنہاں ایسا چاند — فخر کر اے حیدرآباد دکن

داغ سے رخصت ہوئی جب جانِ داغ — اک زمانے کو ہوا رنج و محن
یہ تجلی نے کہا سالِ وفات — انتقالِ طوطیٔ شیریں سخن
۱۹۰۵ء

والدِ مغفور بھی تاریخ نکالنے میں اپنے اُستاد کے جانشین ہی تھے اس لئے جانِ داغ (۱) کے ایک عدد کا تخرجہ ہے اور طوطی کی (ے) کے (۲۰) عدد لیئے ہیں تب کہیں تاریخ نکلی ہے،

ایک اور قطعہ بھی حضرت مرحوم ہی نے کہا ہے ؎

ہائے اُردو کا جو تھا شاداب باغ — ہو گیا اُستاد کے مرنے سے راغ
آسمانِ شاعری کا آفتاب — اور بزمِ شعر کا روشن چراغ
ناظمِ جادو بیاں افسوں نگار — شاعرِ شیریں زباں عالی دماغ
ہائے میرا قدرداں جاتا رہا — دیکھ کر ہوتا تھا مجھ کو باغ باغ
ڈھونڈھتی ہیں اسکو آنکھیں رات دن — اب کہاں اسکا نشاں اسکا سُراغ
شاعری کا چل بسا پیرِ مغاں — ٹوٹے پھوٹے رہ گئے خالی ایاغ
بُلبُلِ ہندوستاں ہی جب نہ ہو — شاعری کا خاک ہو شاداب باغ

جب تجلی کو ہوا مطلوب سال
غیب سے آئی ندا ناسُورِ داغ
۱۳۲۲ھ

ایک فارسی قطعہ البتہ بڑا ہی اچھا کہا ہے ؎

ہیہات اُستادِ جہاں آں بُلبُلِ ہندوستاں — در سایۂ باغِ جناں اے وائے جاں آرام خفت
گریم تجلی زیں اَلم، شام و سحر من دم بدم — سالِ وفاتش ہاتفم داغ فصیح الملک گفت
۱۳۲۲ف

والدِ مرحوم کے پہلے دو قطعات مَیں نے کسی خوبی کے خیال سے نہیں بلکہ محض اس لئے نقل کر دئے ہیں کہ محفوظ ہو جائیں کیونکہ مرحوم کے تین دیوانوں کا مَیں نے انتخاب کر لیا ہے اور اس میں تاریخی قطعات وغیرہ مَیں نے نہیں لئے ہیں،

کیفی حیدر آبادی نے بھی دو قطعات بڑے اچھے کہے ہیں ؎

زیں جاں گداز سانحہ از فرش تا بہ عرش | فریاد و آہ نالہ و شور و فغاں برفت
داغے بدل گذاشت و داغ از جہاں برفت | سرمایہ دار ناز شِ اُردو زباں برفت
رفت آنچہ برمن از غم ایں واقعہ مپرس | ہوش و خرد تحمّل و تاب و تواں برفت
از خونِ دِل بصفحۂ عالم برائے سال | کیفی نوشت، مبلبل ہندوستاں برفت
۱۳ھ۲۲

رخت بربست چوں فصیح الملک | از پئے مغفرت دُعا گفتم
سال تاریخ رحلتش کیفی | داغ نواب مرزا گفتم
۱۳ھ۲۲

نواب حسن علی خاں امیرؔ نے بھی ۲ قطعات بڑے اچھے کہے ہیں،

چل بسے دُنیا سے داغ دہلوی | روتے ہیں ان کے لئے پیر و جواں
اب نظر آتا نہیں ایسا کوئی | اہل دِل اہلِ سُخن اہل زباں
سال رحلت تُم یہ کہہ دو اے امیر | مرد کامل بادشاہ شاعراں
۱۳ھ۲۲

فصیح ملک جہاں اوستاد مرزا داغ | چو رخت بردبہ مُلک بقا بہ حُسن یقین
امیر از پئے تاریخ او بلوح مزار | ندا رسید بگو شم مزار داغ ببیں
۱۳ھ۲۲

شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر ولا نے قطعۂ تاریخ کہا ؎

میرے اوستاد داغ نام آور | جو مرجع تھے ہر مقابل پر
اِس زمین میں وہ ان کی فِکر بلند | آسماں تھی زمین مُشکل پر
بُلبُل ہند تھے زبان اُن کی | مُستند تھی لب عنادِل پر
آہ دُنیا سے کر گئے وہ سفر | واصل حق ہیں پہلی منزل پر
ہو گیا آج اُن کا بیڑا پار | رہ گئے ہم تڑپ کے ساحل پر

مصرع سال ہے فغان و ولا ہائے وہ داغ دے گئے دل پر
۱۳ ھ ۲۲

احسن مارہروی نے بھی کئی قطعات کہے ہیں جن میں سے ایک نقل کیا جاتا ہے،

سو گیا حیف جا کے زیرِ زمیں ایسا نازک مزاج بلبلِ ہند
شاعرِ بے نظیر تھا واللہ تھا غضب کا دماغ بلبلِ ہند
جس کو گلزارِ داغ کہتے ہیں اصل میں ہے وہ باغ بلبلِ ہند
کہا ہاتف نے مصرعِ تاریخ چل بسا حیف داغ بلبلِ ہند
۱۳ ھ ۲۲

نواب مشرف جنگ بہادر نے مصرع تاریخ بڑا اچھا پایا ہے

ہائے لطف شاعری جاتا رہا
۱۳۲۲ھ

ترک علی شاہ ترکی کا تاریخی مصرع ہے، ع

مرد داغ دہلوی اے وا،
۱۳ ھ ۲۲

لوحِ مزار

ہزاروں آدمیوں نے داغ کی وفات کی تاریخیں کہیں جو مدتوں اخباروں اور گلدستوں میں طبع ہوتی رہیں اور شاگردانِ داغ نے سب تاریخیں سائل کے پاس بھجوائیں، نواب حسن علی خاں امیر نے یہ تحریک کی کہ تمام تاریخوں کو جمع کر کے ایک کمیٹی کے ذریعہ تصفیہ کیا جائے کہ اِن تاریخوں میں سے کونسی تاریخ لوحِ مزار پر کندہ کرائی جا سکتی ہے مگر سائل نے اِس خوف سے کہ کسی دوسرے شخص کی تاریخ لوحِ مزار کے لئے منتخب نہ ہو جائے اپنی کہی ہوئی تاریخ کندہ کرا کر مزار پر

لگا دی سے

رفت از دہر چوں فصیح الملک	لرزہ اُفتاد در تمامی ہند
اوستادِ نظام آصف جاہ	موردِ لطف شاہ حامی ہند
راست بر قامتش قبائے سخن	زیب بر شُے خطاب جامی ہند
سلک نظمش بسانِ سلک گہر	جوہری سخن نظامی ہند
شُدہ فاتش بشام یوم الحج	دفن شُد روز عید سامی ہند
آہ دِل برکشید و سائل گفت	مدفن پاک داغ نامی ہند

اس میں (دل) کے ۳۰ عدد کا تدخلہ ہے، کاش سائل اس فارسی کے بجائے اُردو ہی میں کوئی تاریخ کہہ کر کندہ کرا دیتے تو مناسب و موزوں ہوتا، جس وقت یہ تاریخ پتھر پر کندہ کرائی جا رہی تھی اسے دیکھ کر ابوالحمید آزاد، کیفی، تجلّی، خلق وغیرہ نے سخت اختلاف کیا بلکہ سبھوں نے یہ خواہش کی کہ صرف "فصیح الملک داغ دہلوی" اور اس کے نیچے تاریخ و سنہ وفات کندہ کرا دیا جائے مگر سائل بھی بڑے ہی ضدی تھے انہوں نے کسی کی نہ سُنی،

داغ کے مرثیے اور تاریخی قطعات سینکڑوں ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا کہا ہوا مرثیہ لافانی ہے جو نقل کیا جا چکا ہے اور ریاض خیرآبادی نے بھی بڑا نفیس قطعۂ تاریخ کہا ہے جو نقل کیا جاتا ہے سے

ہے قیامت داغ کا مرنا ریاض	شورِ ماتم آج اس محفل میں ہے
گوشۂ محمل بنا ہے کنج گور	بند لیلائے سخن محمل میں ہے
اُٹھ گیا شاہنشہِ ملک سخن	خامشی بزمِ شہ عادل میں ہے
غم سے گویا بن گئی ہے جان پر	غمزدوں کی جان کس مشکل میں ہے
دِل کو بھی دیکھو جگر کو دیکھ کر	اور بسمل پہلوئے بسمل میں ہے

پھیر لائے اِس مُسافر کو کوئی / وُہ ابھی تو پہلی ہی منزل میں ہے
آئی ہے کس کو مٹانے؟ داغ کو / لُطف اجل کی سعئ لاحاصل میں ہے
زِندہ جس کا نام ہے مرتا نہیں / راستی اس دعویٰ باطل میں ہے
داغ مٹتا ہے مٹائے سے کوئی / وُہ فروغ شمع ہر محفل میں ہے
اے لحد تُو چاند پر ڈالے گی خاک / داغ آغوشِ مہ کامل میں ہے
کیوں چھُپانے سے ترے چھُپ جائے داغ / وُہ نہاں تجھ میں عیاں ہر دل میں ہے
وقت پر آنکھیں چُرانا اے لحد / یہ بُرائی تیری آب و گل میں ہے
مر کے بھی پیشِ نظر ہے شکل داغ / آنکھ کہتی ہے وُہ میرے تل میں ہے
کہہ رہا ہے مصرعِ سالِ وفات / اے لحد اب داغ لاکھوں دِل میں ہے
۱۳۲۲ھ

ورثاء میں جھگڑا

داغ کے ورثاء میں ان کی آغوشی دُختر لاڈلی بیگم اور ان کے شوہر سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، لاڈلی بیگم کے فرزند مرزا ناصرالدین احمد خاں اور داغ کے اخیافی بھائی مرزا خورشید عالم اور ایک اخیافی بھتیجا امراؤ مرزا نادان تھے،

ناصر اور نادان تو کوئی ادعا نہیں رکھتے تھے کیونکہ ناصر کم سن اور نادان اسم بامسمیٰ نادان ہی تھے، صرف لاڈلی بیگم، سائل اور خورشید عالم میں جھگڑا تھا، لاڈلی بیگم اور سائل دونوں ایک ہی تھے دوسری طرف خورشید عالم اکیلے تھے۔

سائل کو جوئے کی لت تھی اس لئے داغ کی زندگی ہی میں انہوں نے دست درازیاں شروع کردی تھیں، نقد روپیہ یا قابل فروخت چیزیں اُڑا لیا کرتے تھے چنانچہ حضور سے عطا شدہ بعض چیزیں اسی طرح سائل نے فروخت کردی تھیں جس کی وجہ سے داغ نے سرکار سے عطا ہونے والی چیزیں سرفرازی کے بعد پھر واپس گزراننا شروع کردیا تھا کہ میرا مکان محفوظ نہیں ہے عطیات شاہی خزانۂ صرف خاص ہی میں محفوظ رکھوادی جائیں، چنانچہ تلواریں، گھڑیالیں، گھڑیال کے توڑے، انگوٹھیاں، لکڑیاں، چھڑیاں، زربفت و کمخواب، ہمرو و مشروع کے تھال شال دوشالے، عطردان، پاندان، اور سینکڑوں دوسری چیزیں داغ ہی کے نام سے خزانہ میں محفوظ تھیں۔

نقد رقم بھی داغ نے گھر پر رکھنا چھوڑ دیا تھا، منشی جگناتھ پرشاد کے ذریعہ کسی ساہوکار کے پاس جمع کرادیتے تھے یہ پرشاد ہی ان کے کارندے اور پیشکار رہے تھے،

داغ نے تقریباً اٹھارہ سال تک ہزار روپیہ تنخواہ پائی تھی، جس کی مجموعی مقدار سوا دو لاکھ روپیہ ہوتی ہے، داغ مسرف نہ تھے بلکہ افلاس و تنگدستی نے ان کو روپئے کی قدر و قیمت سے واقف کرادیا تھا وہ بہت ہی احتیاط سے روپیہ خرچ کرتے تھے، اپنے عیش آرام اور ضروریات کے علاوہ وہ غیر ضروری امور پر بے جا مصارف پسند نہیں کرتے تھے،

میں نے جہاں تک سنا ہے پانچ سو روپیہ داغ ہر مہینے خرچ کرتے تھے جو ان کے ذاتی اور گھریلو اخراجات پر صرف ہوتا تھا اور پانچ سو روپیہ ماہوار جمع ہوتا تھا، سوا دو لاکھ کی مجموعی آمدنی میں سے ابتدائی یکمشت بقایا تنخواہ کے پچاس ہزار اور ان کے ماہوار اخراجات کے پچھتر ہزار روپے اس رقم میں سے

نکال دئے جائیں تو ایک لاکھ روپیہ نقد داغ کے پاس تھا اگر لاکھ روپیہ نہ ہو تو پچاس ہزار یقیناً انہوں نے اُٹھا رکھا تھا کیونکہ وُہ بڑے ہی محتاط اور نہایت ہی دُور اندیش تھے، حیدر آباد کی سیاسی حالت ان کے پیش نظر تھی اِسی لئے انہوں نے کوئی مکان خریدا اور نہ ہی تعمیر کیا ورنہ وُہ نہایت ہی عُمدہ مکان بنوا سکتے تھے،

داغ کی احتیاط کے متعدّد واقعات بیان کئے جاتے ہیں، نہایت فراخ دلی سے اکثر مدّات پر خرچ کرتے ہوئے بعض امور کے متعلق ذرا سی بعض اوقات لطیفہ بن جاتی تھی،

شاگردوں کے خطوط کے جواب اور پوسٹ سے آنے والی اصلاحی غزلوں کی واپسی کے ٹکٹ وہی ادا کرتے تھے کسی مہینے میں ان ٹکٹوں کی رقم زیادہ ہو جاتی تو خفا ہوتے کہ خواہ مخواہ لوگ میرے پاس غزلیں بھیجتے ہیں آخر اور لوگ بھی تو ہندوستان میں موجود ہیں اُن سے اصلاح کیوں نہیں لیتے؟ مگر جب اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا خیال آتا تو چُپ ہو جاتے تھے،

عاقبت بینی اور احتیاط ان میں خاصی تھی اور انہوں نے معقول رقم جمع کی تھی جس میں سے خرچ نہیں کرتے تھے خود اپنی زندگی کے کئی اِنقلاب اُن کے پیشِ نظر تھے اِس وجہ سے وُہ پس اندازی شدید ضرورت کے قائل اور اُس پر عامل تھے،

تنخواہ مِلنے میں کبھی کبھار دیر ہو جاتی تو جگناتھ پرشاد سے کہتے کہیں سے قرض لا دو ورنہ حسن علی خاں آمیر کے پاس سے روپیہ قرض لیتے اور تنخواہ ملنے کے بعد ادا کر دیتے،

ان کے دیوان میں اِس قسم کے شعر جو نظر آتے ہیں ؎

دیا جو داغ نے ظاہر وہ سب کو ہے معلوم ۔۔۔ ملی ہے تم کو جو چکے سے وہ رقم کیا ہے
داغ سے کہتے ہیں سب دیدۂ مجھے ۔۔۔ جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے

وہ اسی قسم کے خاص مواقع پر بے ساختہ کہے ہوئے ہیں، معلوم نہیں یہ قصے حجاب کے ہیں یا لاڈلی بیگم کے مطالبے یا سائل کی دراز دستیاں، بہر حال ہیں واقعے،

داغ کا انتقال ہوتے ہی مصارف تجہیز و تکفین کے لئے جو رقم سرکار سے آئی تھی اُسی پر جھگڑا شروع ہو گیا، خورشید عالم یہ رقم خود حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ بھائی تھے اور سائل وہ رقم اِس لئے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ وہ داماد تھے، مگر کارپردازانِ سرکاری نے دونوں کو سمجھا منا کر تصفیہ کر دیا،

زیارت کے بعد حضور نے لاڈلی بیگم کو "خلعت ماتمی" سرفراز فرمایا تو انہوں نے اُسے اپنی وراثت کا قبالہ تصور کر لیا اور خورشید عالم کو صاف طور پر کہدیا کہ اب آپ کا تعلق اِس گھر سے نہیں رہا ہے آپ چلے جائیے،

خورشید عالم داغ کی زندگی بھر ان کے ساتھ رہے البتہ لاڈلی بیگم کی بہودگیوں سے متاثر ہو کر دو دفعہ انہوں نے علٰحدہ مکان بھی لے لیا اور چند روز کے لئے الگ ہو بھی گئے مگر داغ نے پھر انہیں بُلا لیا اور بعض دفعہ انہوں نے اپنے کھانے کا انتظام بھی علٰحدہ کر لیا مگر داغ نے اسے بھی ناپسند کیا اور مرنے تک ان کو اپنے ساتھ ہی رکھا،

خورشید عالم لاکھ گئے گزرے سہی مگر شاہانہ خون اُن کی رگوں میں تھا وہ داغ کے مجبور کرنے پر ان کے پاس رہتے اور کھایا کرتے تھے مگر داغ سے انہوں نے مستقل طور پر کوئی رقم مسلسل نہیں لی کبھی کبھار کچھ لے لیا ہو تو اور بات ہے ورنہ ان کو حیدرآباد، رامپور اور دہلی سے جو تنخواہیں ملتی تھیں ان کی مقدار ساڑھے تین سو روپئے تھی اسی میں وہ اپنے شوق ذوق کر لیتے تھے، سائل کی طرح نازیبا

حرکات انہوں نے کبھی نہیں کی تھیں،

داغ کے انتقال کے بعد ہی ساری چیزیں لاڈلی بیگم اور سائل نے پار کر دیں اور علیحدہ مکان لے کر اس مکان سے اُٹھ گئے اور خورشید عالم نے بھی اسی بدمزگی میں یہ گھر چھوڑ دیا،

حسن علی خاں امیر نے ۱۹ محرم ۱۳۲۴ھ کو احسن مارہروی کو جو خط لکھا ہے اس کا اقتباس رفیق مارہروی نے بزم داغ میں دیا ہے کہ

"اُستاد مرحوم کے گھر کے قفل صاحب عالم بہادر نے کھول ڈالے افسوس ہے کہ کچھ برآمد نہیں ہوا، سب مال و اسباب جناب سائل صاحب لے گئے، فرش فروش الماریاں فرنیچر اور کتب خانہ چھوڑ گئے جس قدر مال تھا وہ سب لے گئے صاحب عالم بہادر نے قفل کرایہ کی زیر باری سے بچنے کے لئے کھول ڈالے، اُس وقت دس بیس آدمی موجود تھے کچھ نہ نکلا دو چار دن میں مکان سے اُٹھ جائیں گے، اعلیٰحضرت کی خدمت میں عرضی بھیجدی ہے"

(ص ۲۵۳)

والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ داغ کی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت ہوئیں ان کی خریداری کے لئے لوگ آتے اور دیکھ کر قیمت لگاتے مگر اس قیمت پر فروخت کرنے پر خورشید عالم راضی نہ ہوتے اور وہ لوگ چلے جاتے، شام میں یہی کتابیں خورشید عالم سے چھپا کر سائل ان لوگوں کے پاس لے جاتے اور اونے پونے بیچ کر جوا کھیلتے، اس طرح داغ کا کتب خانہ برباد ہوا، اُوپر کے اقتباس میں فرنیچر اور کتب خانہ حسن علی خاں نے بھول کر لکھ دیا ہے کیونکہ کتب خانہ کی صرف الماریاں رہ گئی تھیں کتابیں سائل غائب کر چکے تھے، قفل کھولنے کا

جو واقعہ حسن علی خاں نے لکھا ہے اس وقت والد مرحوم، کیفی، فروغ وغیرہ بھی موجود تھے ان لوگوں نے الماریاں خالی دیکھیں، اچھی قسم کا فرنیچر تو غائب کر دیا گیا تھا، تخت، معمولی کرسیاں، چند چار پائیاں وغیرہ وہیں تھے، یہ فرنیچر اسی بنگلہ میں ہراج ہوا چنانچہ داغ جس تخت پر بیٹھا کرتے تھے وہ تخت کیفی نے خریدا اور اُن کے لکھنے کا ڈسک والد مرحوم نے خرید لیا اس طرح داغ کی دولت لُٹی،

۸ رجمادی الثانی ۱۳۲۶ھ کو میر حسن علی خاں نے ایک خط نوح ناروی کے نام لکھا تھا جسے انہوں نے احسن کے حوالے کر دیا تھا جسے رفیق مارہروی نے بزم داغ میں شائع کر دیا ہے،

"ایک خط لاڈلی بیگم کا بھی آپ کے دیکھنے کو بھیجتا ہوں جس کے دیکھنے سے آپ کو بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ داغ مرحوم سراج الدین خاں سے کتنے ناراض تھے مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ ان سب کی صورت سُور کی معلوم ہوتی ہے اور بہت سے ابواب ہیں، لکھنے کو دفتر درکار ہے آپ کو بھی تھوڑا سا معلوم ہے جو ایک دفعہ اُستاد مرحوم نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ سراج الدین کے یہاں نہ جایا کرو" (ص ۲۵)

یادگار داغ

۳ رشوال ۱۳۲۳ھ کو حسن علی خاں امیر نے جو خط احسن مارہروی کو لکھا ہے اس کی نقل بزم داغ میں شائع ہوئی ہے اس سے یادگار داغ سے متعلق جو حصہ ہے نقل کیا جاتا ہے،

"یادگارِ داغ" جس کا مسودہ اور مبیضہ اُستاد مرحوم کے کُتب خانے میں رہا کرتا تھا اُستاد کے اِنتقال کے بعد عبدالغنی کی شرکت سے سراج الدین خاں نے اپنے قبضے میں کر لیا، ایک دن لاڈلی بیگم نے مجھے اپنے پاس بُلوا کر یہ کہا کہ ہم آپ کو بجائے داغ صاحب کے جانتے ہیں آپ کو لازم تھا کہ داغ صاحب کے دفن کے بعد آپ داغ صاحب کی جگہ بیٹھ جاتے آپ نے تو مجھے پرسا بھی نہ دیا اِسی قسم کی شکایت آمیز باتیں کرتی رہیں، تھوڑی دیر کے بعد مَیں نے لاڈلی بیگم سے پُوچھا کمرے میں سراج الدین خاں ہیں؟ تو انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں، مَیں حُقّہ پینے کی غرض سے چلا گیا دیکھا تو سراج الدین خاں تو نہیں ہیں غلام رسول کاتب مُلازم اُستاد مرحوم موجود ہے اور یادگار داغ صاف ہو رہا ہے، مَیں نے اُس کاتب سے پُوچھا یہ دیوان یہاں کیسے آیا تو اُس نے جواب میں جھُوٹ بات یہ کہی کہ انتقال کے دو چار روز پیشتر مدارالمہام کے یہاں مشاعرہ ہوا، اس مشاعرے میں سرکار سے مانگ لے گئے تھے جب سے اب تک سراج الدین خاں کے پاس ہے، مَیں نے ان سے کہا تُم بالکل غلط کہتے ہو اُستاد نے ہرگز نہیں دیا، اس کے بعد اسی کاتب سے مَیں نے کہا کہ میری طرف سے سراج الدین خاں کو کہہ دینا کہ یہ کام اچھا نہیں، اِس قسم کی بدعنوانیاں ہونگی تو فیمابین رنجش بڑھے گی، ابھی اُستاد کو انتقال کئے چار روز گزر رہے ہیں اِتنی جلدی دیوان کے صاف ہونے میں

کیوں ہو رہی ہے، جب کُل سامان کا تصفیہ ہوگا اس کا بھی ہوگا، یہ کہہ کر مَیں اپنے گھر چل دیا، سراج الدین خاں جب آئے تو کاتب نے اُن سے میری کہی ہوئی باتیں کہیں، انہوں نے یقین کر لیا کہ اس نے صاحب عالم سے کہہ دیا ہوگا، مارے خوف کے وُہ سیدھے صاحب عالم کے پاس گئے اور ان سے کہا، چچا جان کا دیوان حضور میں گزارنے کے صاف کروا رہا ہوں، صاحب عالم نے پوچھا قفل سے کیونکر نکلا تو پھر انہوں نے وہی عُذر پیش کیا، کہ چچا جان نے مدارالمہام کے مشاعرے میں لے جانے کو چند روز قبل دیا تھا، جب سے میرے پاس ہی ہے، صاحب عالم نے کہا دیوان جہاں تھا وہیں رکھ دیا جائے اگر آپ کو نقل کرانی ہو تو روز نکالا جائے اور کاتب لکھے پھر وہیں رکھ دے، انہوں نے صاحب عالم کے کہنے پر عمل نہیں کیا، صاحب عالم نے اعلیٰحضرت کے پاس ایک عرضداشت اِس مضمون کی لکھی کہ بھائی صاحب مرحوم کا دیوان "یادگار داغ"، بقیمت چار یا پانچ ہزار روپیہ بیچ رہے ہیں اِسی بنا پر صاف کرا رہے ہیں، ساتھ ہی سرکار نے ناظم الملک یعنی محبوب یار بہادر جنگ کو حکم دیا کہ تم جا کر مسودہ اور مبیّضہ دونوں لیتے آؤ، اور یہ حکم ان کو سُنا دو کہ سرکار اس کو چھپوائیں گے، محبوب یار جنگ آئے اور دیوان لے کر داخل سرکار کیا، اب خدا ہی نکالے تو نکلے، میری رائے میں دیوان کے نکلنے کی یہی شکل ہے کہ

اُستاد مرحوم کے جمیع تلامذہ مل کر ایک عرضداشت پیش کریں اور یہ عرضداشت صرف دیوان ہی کے لئے نہ ہو بلکہ اُستاد کے فاتحہ درُود سالانہ ہونے کے لئے ہو اور اس کی سرپرستی کسی ایک شاگرد کو ملنی چاہیئے جب تو سارے کام نکلیں گے ورنہ ورثائے مرحوم سے کچھ نہ ہو سکے گا کیونکہ یہ لوگ کتّوں کی طرح جھوٹی ہڈّی پر لڑ رہے ہیں اُستاد مرحوم کے دیوان کی ایک نقل آپ کے پاس ہے اور ایک بارق صاحب کے پاس اور ایک صاحبزادہ اعلیٰحضرت کے پاس ہے اور ایک نقل سراج الدین خاں کے پاس ہے اس کا بجز میرے کسی کو علم نہیں ہے، وُہ نقل امراؤ مرزا کے ہاتھ کی اور میرے ہاتھ کی ہے اُن سب کے پاس تاریخات قصائد قطعات متفرقات نہیں ہیں یہ بھی بہت کچھ ہے، اب اِس دیوان کا چھپوانا بلا اجازت اعلیٰحضرت کس طرح ہو سکے گا، اعلیٰحضرت کے پاس رجسٹری خطوط برابر پہنچتے ہیں معرفت مولوی احمد حسین سکریٹری میری ناقص رائے میں کسی امر کی ہر ایک طرف سے گزارش مناسب نہیں ہے، مَیں یقین کرتا ہوں کہ جمیع شاگردان اُستاد مرحوم کی طرف سے جو درخواست پیش ہو گی اُس پر سرکار توجہ فرمائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ ....

لاڈلی بیگم مجھ سے ایک روز کہنے لگیں کہ صاحب عالم سے کہہ کر آپ نے دیوان کھوا دیا، مجھ کو ان کی یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی اُس روز سے ملنا ترک کر دیا،

بھائی صاحب! لاڈلی بیگم اچھی آدمی ہیں مگر مرزا اسائل صاحب
کے دام محبّت میں گرفتار ہیں، ناصر تو ازحد ابتر ہو گیا ہے،
سُنا ہے کہ اس مہینے سے اپنی تنخواہ ناصر نے آپ سے لی ہے،
آپ کو تو ان کے حالات خوب معلوم ہیں" (بزم داغ ص ۲۴۸ - ۲۵۲)

داغ کے انتقال کے بعد سے بیشتر شاگردوں نے غزل کہنا ہی چھوڑ دیا تھا جن میں سر فہرست اعلیحضرت غفران مکان ہیں، حضور نے داغ کے بعد غزل گوئی ترک ہی فرما دی اتّفاق سے داغ کے انتقال کے ایک آدھ سال کے بعد ہی حضور کی ایک چہیتی صاحبزادی کا اِنتقال پُر ملال واقع ہُوا یہ صدمہ بھی حضور کی طبیعت پر اتنا ہُوا کہ شعر و شاعری سے رغبت ہی نہیں رہی البتہ محرّم میں مجالس عزا میں شرکت فرماتے تو مرثئے اور خصوصاً وہ مرثئے جن میں علی اصغرؑ وغیرہ معصومین کی شہادت کا بیان ہوتا بڑی توجہ سے سماعت فرماتے اور کبھی کبھی خود بھی سلام کہتے تھے، بس اتنی توجہ شاعری کی طرف رہ گئی تھی،

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے مسلسل عرض کرنا شروع کیا کہ حضور! جلیل سے مشورہ فرمایا کریں تو مدّت کے بعد صرف سلام کہہ کر جلیل کو بغرض اصلاح سرفراز فرمانے لگے اور مرزا داغ کی تنخواہ میں سے کچھ تنخواہ (جس کی مقدار کا حال معلوم نہ ہو سکا بعض لوگ تین سَو بتاتے ہیں اور بعض پانچ سَو روپئے) جاری فرمائی اور زبانی "جلیل القدر" کا لقب سرفراز فرمایا اور یہ سلام بھی پچاس ساٹھ ہی ہوں گے جنہیں اصلاح دینے کی سعادت جلیل کو نصیب ہوئی،

داغ کے بعد چھ سال حضور غفران مکان حیات رہے مگر غزل گوئی

نہیں فرمائی اُسی زمانے میں داغ کے دیوان کے لئے کوئی یاد دلاتا تو یقیناً طباعت کا انتظام ہوجاتا اور بڑی شان سے یہ کام انجام پاتا، مگر حسن علی خاں کے مشورے پر کسی نے عمل نہیں کیا،

حسن علی خاں امیر نے احسن مارہروی کے پاس یادگار داغ کی جس نقل کی موجودگی کا حوالہ دیا ہے اس میں داغ کی ماہ جون ۱۹۰۲ء تک کی کہی ہوئی غزلیں اور اس زمانے تک کہے ہوئے بعض قطعات وغیرہ تھے داغ کے انتقال کے بعد احسن مارہروی نے اختر (نگینہ) بجنوری، نوح ناروی، نسیم بھرت پوری، وجاہت جھنجھانوی، نسیم ہلسوی، عزیز یار جنگ عزیز، کے پاس داغ کی جتنی غیر مطبوعہ غزلیں تھیں منگوالیں اور گلدستہ معیار الانشاد، محبوب الکلام، گلچین، وغیرہ سے بھی غزلیں نقل کرلیں اور داغ نے فصیح اللغات کے لئے جو سندی شعر کہے تھے انہیں اکٹھا کرکے نومبر ۱۹۰۵ء میں "یادگار داغ"، لاہور سے چھپوا دیا جو رائل سائز کے ۲۲۰ صفحات پر طبع ہوا ہے، جس میں ۱۵۶ غزلیں ہیں جن کے ۲۷۷۲ شعر ہیں، اسی میں فصیح اللغات کے سندی شعر ۱۰۱۷، اور قصائد وقطعات متفرقات ۳۱۱ شعر اس طرح کُل ۴۱۰۰ شعر ہیں،

لالہ سری رام ایم، اے، مولف تذکرۂ خمخانۂ جاوید جب حیدرآباد تشریف لائے تھے تو انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ انہوں نے مہتاب داغ اور یادگار داغ کے حقوق کئی ہزار روپئے لاڈلی بیگم اور مرزا اسمٰعیل کو دے کر حاصل کئے اور مہتاب داغ بڑے ہی نفیس کاغذ پر عمدہ چھپوا دیا ہے اور پھر یادگار داغ بھی انہوں نے شائع کیا ہے اس کے بعد جو غزلیں ملیں انہیں "ضمیمۂ یادگار داغ" کے نام سے چھپوا دیا ہے،

سری رام دہلوی کا چھپوایا ہوا مہتاب داغ میں نے دیکھا ہے جو بالکل حیدر آباد کے مطبوعہ دیوان کی نقل ہے مگر لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت ہی اچھا ہے، البتہ سری رام کا چھپوایا ہوا یادگار داغ کہیں نظر نہیں آیا ممکن ہے کہ احسن نے جو یادگار داغ چھپوایا ہے یہ سری رام ہی کی مالی سرپرستی میں طبع ہوا ہو کیونکہ اس کی طباعت جن دنوں میں ہوئی ہے احسن مارہروی سری رام کے پاس مُلازم تھے اور خمخانۂ جاوید کے دفتر میں کام کرتے تھے،

"ضمیمۂ یادگار داغ" رائل سائز کے ۶۳ صفحات پر شائع ہوا ہے جس میں ۷۰ غزلیں ہیں جن کے ۱۱۳۶ شعر ہیں اور متفرق ۳۰ شعر ہیں اس طرح کُل ۱۱۶۶ شعر ہیں،

گویا یادگار داغ اور ضمیمہ ملا کر کُل ۵۲۶۶ شعروں پر حاوی ہے جس کی غزلیں ۲۲۶ ہیں ؛

داغ کا سرمایۂ شعر

اِس طرح داغ کے پانچوں دیوان (۱- گلزار داغ، ۲- آفتاب داغ، ۳- مہتاب داغ، ۴- یادگار داغ، ۵- ضمیمۂ یادگار داغ) میں کُل ۱۰۲۸ غزلیں ہیں جن کے کُل اشعار ۱۳۷۷۹ ہیں، گویا تقریباً چودہ ہزار شعر داغ نے غزل کے کہے ہیں،

منتخب داغ کے مقدمے میں احسن مارہروی نے چاروں دیوانوں کے

صرف غزلوں کی تعداد ۱۶۱۶۲ لکھی ہے اور نوری نے اپنی کتاب داغ میں داغ کے چاروں دیوانوں کے غزلوں کے اشعار کی تعداد ۱۲۶۴۳ بتائی ہے،

میں نے بڑی دقّت سے داغ کے پانچوں دیوان اکٹھا کئے ہیں ان کی غزلیں شمار کیں اور غزل کے شعر گنے تو یہ اعداد برآمد ہوئے۔

۱۔ گلزار داغ ۔ ۳۹۱ غزلیں، کُل ۴۹۴۳ شعر
۲۔ آفتاب داغ ۔ ۱۲۹ غزلیں، کُل ۱۷۵۶ شعر
۳۔ مہتاب داغ ۔ ۲۹۲ غزلیں، کُل ۴۱۷۶ شعر
۴۔ یادگار داغ ۔ ۱۵۶ غزلیں، کُل ۲۷۷۲ شعر
۵۔ ضمیمۂ یادگار داغ ۔ ۷۰ غزلیں، کُل ۱۱۳۶ شعر
جُملہ ۱۰۳۸ غزلیں، کُل ۱۴۷۸۳ شعر

داغ کی عُمر پچہتّر سال کی تھی اور مشہور ہے کہ انہوں نے بارہ[۱۲] سال کی عُمر سے شعر کہنا شروع کیا تھا اس طرح ان کی شاعری کی عُمر باسٹھ سال ہوتی ہے داغ کے سے پُرگو شاعر کا باسٹھ سال کا کلام کم از کم سالانہ ایک ہزار کی اوسط سے باسٹھ ہزار ہونا چاہیئے مگر بدنصیبی سے ہم تک صرف پندرہ ہزار شعر غزل کے پہنچے قصائد قطعات وغیرہ متفرقات تقریباً پانچ ہزار فرض کئے جائیں تو کُل سرمایۂ شعری بیس[۲۰] ہزار ہو سکتا ہے،

اگر داغ کا ایک دیوان ہنگامۂ غدر میں ضائع نہ ہوتا اور ایک دیوان حیدرآباد میں چوری نہ جاتا اور ایک آخری دیوان حضور کے پاس داخل نہ ہو جاتا تو شاید آج ہمارے سامنے داغ کے تیس[۳۰] چالیس[۴۰] ہزار شعر کم از کم ضرور ہوتے،

داغ کا آخری دیوان جو حضور میں داخل ہوا تھا کتب خانۂ نذری باغ واقع کنگ کوٹھی میں محفوظ اور بڑی اچھی حالت میں موجود ہے میں اِس کوشش میں ہوں کہ حضور بندگان عالی سے عرض کر کے دیوان کی اشاعت کی صورت نکالوں خدا کرے ایسی صورت جلد نِکل آئے ؎

پسماندگانِ داغ

داغ کے پسماندہ لوگ دراصل وہی تھے جن کا ذکر ہم نے ورثاء کے عنوان سے کیا ہے مگر اب ہم داغ کے ان قرابت داروں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو اِن کے انتقال کے زمانے میں زندہ تھے،

بادشاہ بیگم خفی داغ کی ایک بہن تھیں جیجے پور میں رہتی تھیں، ان کے متعلق ایک لطیفہ مشہور رہو گیا ہے،

مہتاب داغ میں (ص ۳۱۵-۳۱۶) ایک قطعۂ تاریخ طبع دیوان خفیؔ ہے،

واہ عصمت مآب کیا کہنا	کیا ہی اچھی کہی ہے نعت نبیؐ
تپشِ دِل کی آگ ہے اس میں	اور راک لاگ ہے محبت کی
کیا فصیح و بلیغ ہے یہ کلام	کہیں تمکین ہے کہیں شوخی
جس طرح رنگِ گُل ہوں تشنہ دِل	یُوں ہے جپیدہ لفظ سے معنی
بندشیں اچھی زباں اچھی ہو	یہی شعر و سُخن کی ہے خوبی
رگ مجذوب ہے خط مسطر	کا غذ اس کا ہے بادل صُوفی

ہے دوات اس کی یا ہے دیدۂ حور   خامہ اس کا ہے یا ہے بال پری
حق تعالےٰ اسے کرے مقبول   بطفیل محمدؐ عربی
طبع دیواں کا سال تو لے داؔغ   کہدے، مطبوع عشق پاک خفی

اِس قطعہ کو بعض حضرات نے فقط خفیؔ تخلص کی بنا پر بادشاہ بیگم کے دیوان کی تاریخ سمجھ لیا اور یہ لکھ دیا کہ بادشاہ بیگم کا دیوان شائع ہو چکا ہے جس کی تاریخ خود داؔغ نے کہی ہے،

اگر مَیں دیوان خفیؔ کی حقیقت سے ذاتی طور پر واقف نہ ہوتا تو مجھے بھی یہی مغالطہ ہوتا مگر اتّفاق سے مَیں اس حقیقت سے واقف ہوں، آپ نے حیدرآباد کی پتھر گھٹی پر مولوی اکبر کا نبی خانہ دیکھا یا سُنا ہوگا جس میں آجکل جمعیتہ العلماء حیدرآباد کا دفتر ہے یہ نبی خانہ مولوی اکبر مرحوم نے بنوایا تھا ان کے فرزند مولوی احمد علی خاں تھے جو یہیں رہتے تھے اُن کے ایک فرزند ابوالخیر سعید الدین تھے جو حکومت سرکار عالی میں مُنصفیٔ عدالت کے عُہدے سے سرفراز تھے جن کے صرف ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی،۔

ابوالفیض صاحب موزوں طبع تھے اور نعت کہا کرتے تھے معلوم نہیں اس میں کیا مصلحت تھی کہ انھوں نے خفیؔ تخلص اختیار کیا تھا اور اپنی شاعری کو اپنی بیٹی کے نام سے شہرت دیتے تھے، چُنانچہ یہ غزلیں مائلؔ کو دکھائی جاتیں اور اصلاح کے بعد بصورت دیوان جمع کی جاتیں ایسی ۱۲۹ نعتیہ غزلوں کو اکٹھّا کر کے رائل سائز پر انھوں نے دیوان خفیؔ چھپوا دیا، ۱۷ سطری مسطر کے ۷۶ صفحات پر غزلیں ہیں اور بقیّہ تقاریظ و تواریخ وغیرہ کل ۹۱ صفحات کا مجمُوعہ ہے،

خفیؔ کے حقیقی بھائی مولوی امجد علی مُنصفِ عدالت تھے اور اضلاع پر

ان کی تعیناتی تھی، میرے خالو مولوی احمد علی منصب دار کے رشتہ کے چچا ہوتے تھے اور احمد علی صاحب ہی کے ایک مکان میں جو ان کے مکان سے ملا ہُوا تھا رہتے تھے انہیں کے ساتھ یہ بہن بھی مع اپنے شوہر اور بچوں کے رہتی تھی جنہیں خفیؔ سمجھا جاتا تھا، ۱۹۱۹ء میں میری والدہ کا انتقال طاعون سے ہُوا اور خالہ نے ہم لوگوں کو مجبور کر کے اپنے مکان میں منتقل کر لیا اور یہاں منتقل ہونے کے بعد میری نانی فالج میں مبتلا ہو گئیں اور ایک طویل عرصہ تک ان کی علالت رہی جس کی وجہ سے مجھے بھی خالہ ہی کے مکان پر رہنا پڑا، خفیؔ کے تین۳ لڑکے اور دو۲ لڑکیاں تھیں، دو۲ لڑکے میرے ہم عمر تھے جن کے لئے مَیں اُن کے گھر میں جایا کرتا تھا، خفیؔ کے شوہر پُرانی وضع کے منصب دار اور خان زمان خاں مولف تاریخ گلزار آصفیہ کے خاندان سے تھے شعر بھی کہتے تھے داغ ہی کے شاگرد تھے غالباً عنصر تخلص تھا، اُنہیں دنوں خفیؔ نے اپنا دیوان مجھے دیا تھا، افسوس ہے کہ میرے دُوسرے ذخیرے کے ساتھ یہ دیوان بھی تلف ہو گیا اور ان سطور کی تحریر کے سلسلہ میں مجھے دیوان خفیؔ مولوی امجد علی کے لڑکوں سے حاصل کرنا پڑا،

داغ کی تاریخ طبع دیوان از قلم اعجاز رقم بُلبُل ہندوستان اُستاد السلطان جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی" کے عنوان سے صفحات ۸۸-۸۹ پر طبع ہوئی ہے دُوسرے قطعات تاریخی بھی ۱۳۱۰ھ اور ۱۸۹۲ء کے ہیں،

جب آپ ان خفیؔ کے اتنے حالات جان چکے تو چند شعر بھی سُن لیجیے، ؎

مداحی کے طفیل ہیں مجلس میں شاہ کی / اِس عاصیہ خفیؔ کا بھی مذکور ہو گیا

نبیؐ کی مدح خواں تو ہے خفیؔ تجھکو ہے پھر کیا ڈر / ترا ہر وقت حامی وہ رسولؐ کبریا ہوگا

پڑھتا ہوں میں حدیث کئی دن سے اے خفیؔ / مجھ سے شفیع میرا ہے کرتا کلام روز

مجھ کو خفیؔ سے عشق رسولِ خدا سے بس / اِس وجہ سے میں کرتا ہوں وصف و ثنا فقط

اِک وقت کی دید سے نہیں ہوتی تسلّی / بیتاب کو پھر اپنی وہ صورت تو دکھا دو

جز نعت محمدؐ نہیں نکلے گا قلم سے / تم شعر خفیؔ سے کوئی لکھوا کے تو دیکھو

بس اب خفیؔ کے حال پہ فرمائیے کرم / اِس کو دکن سے روضے پہ اپنے بلائیے

لِلّٰہ الحمد خفیؔ خواب میں آئے احمدؐ / اب مسرّت ہوئی حاصل کبھی ایسی تو نہ تھی

مدح احمدؐ خفیؔ لکھے جاؤ / یہ تمہارے لئے عبادت ہے

نعت گوئی میں نہ کیوں صلہ بڑھ جائے مرا / اے خفیؔ حضرت مائل سا جو استاد رہے

دیوان کے آخر میں ایک اعلان بھی ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

اعلانِ مفید عام و خاص

اِس دیوان مسمّٰی ذکر خفیؔ کو کوئی صاحب ارادہ طبع کا بدوں اجازت والد مصنّفہ مسمّٰی محمدؐ ابوالفیض سعید الدین نہ فرمائیں، ناحق بجائے نفع نقصان نہ اُٹھائیں جس قدر نسخے دیوان کی ضرورت ہو والد مصنّفہ سے طلب فرمالیں،

العبــــــــد

مہر ابوالفیض سعید الدین

اِس دیوان پر نہ تو قیمت لکھی ہوئی ہے اور نہ یہ فروخت ہی ہوا ہے، غالباً مفت ہی تقسیم ہوا ہے، مولوی امجد علی کی زندگی میں کوٹلہ عالی جاہ کے مکان

میں اِس دیوان کی ڈھیر میں نے دیکھی تھی معلوم ہوتا ہے کہ دیمک کی نذر ہوگئی اب جو میں نے مانگا تو ایک نسخہ بڑی دقّت سے عزیزم اکبرالدین نے مجھے عاریتاً دیا ہے،

آغا مرزا شاغل، یہ داغ کے اخیافی بھائی تھے نواب شمس الدین خاں کی پھانسی کے بعد داغ کی والدہ آغا تراب علی سے وابستہ ہوئیں ۱۸۴۱ء ۱۲۵۷ھ میں مرزا شاغل پیدا ہوئے دہلی ہی میں تعلیم و تربیت پائی اور غدر کے بعد رامپور جا رہے اور صاحبزادہ امداد اللہ خاں کے گھرانے میں شادی کی پھر رامپور سے عظیم آباد چلے گئے درویش منش آزاد مشرب تھے، آخر عُمر میں عظیم آباد سے رامپور آگئے اور وہیں ۴ر فروری ۱۸۹۸ء کو انتقال کیا، شاغل کے حالات کے لئے حضرت اثر رامپوری کا ممنون ہوں،

مرزا شاغل کو صرف ایک لڑکا امراؤ مرزا تھا جن کا تخلّص ابتداً مرادِ تھا بعد میں نادان بن گئے تھے جو حیدرآباد میں رہے مرزا شاغل بڑے اچھّے شاعر تھے، داغ ہی سے مشورہ کرتے تھے کلام نہ جانے کہاں گیا تذکرۂ خمخانۂ جاوید میں معتد بہ شعر نقل ہوئے ہیں اُن میں سے چند نقل کرتا ہوں ؎

لاشہ پہ دن کو دھوپ پڑی شب کو چاندنی — دو چادروں کا ہم کو میسر کفن ہوا
کہیں دکھلا رہی ہے تیغ ابرو بانکپن اپنا — کہیں پھیلا رہی ہے جال زلف پر شکن اپنا
بتائیں کس زباں سے ہم خزاں دیدہ وطن اپنا — نہ اُجڑے یوں کسی کا جسطرح اُجڑا چمن اپنا
اشکِ خوں پی لئے غم کھالیا اور شکر کیا — اب تو مدت سے یہ ہے اپنی بسر کی صورت
مجھ سے کیا پوچھتے ہو روزِ جزا کیا ہوگا — کیا کہوں دیکھ ہی لوگے جو تماشا ہوگا
شمع پروانے کے جلنے پر ہنسی — مجھ کو غصہ آگیا گل گیر پر

دمِ فریاد اسکا سر جھکے میدانِ محشر میں　　ندامت یہ بھی لکھی تھی مگر میرے مقدر میں

جس سے ملتے ہو بنا لیتے ہو عاشق اپنا　　رسمِ اخلاق کو اتنا کوئی برتے بھی نہیں

دے اب جواب ان کو جسے ہوش رہا ہو　　لو پوچھتے ہیں مجھ سے کہ تم چاہتے کیا ہو

واعظ تری حوروں کے ابھی ہم ہوں خریدار　　کچھ ملتی ملاتی تو شباہت ہو کسی کی

امراؤ مرزا نادان،

مرزا شاغل ہی کے اکلوتے فرزند تھے، رامپور ہی میں تولد ہوئے وہیں تعلیم و تربیت پائی، مرزا شاغل نے بڑی عمدگی سے تعلیم دی تھی، فطرتاً شاعر اور بڑے ہی تیز تھے، ہمیں کوئی صحیح اطلاع تو نہیں ملی مگر قیاس یہ ہے کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آگئے اور داغ ہی کے پاس رہنے لگے، ان دنوں داغ کے ساتھ خورشید عالم بھی رہتے تھے انہوں نے نادان کو اپنا مصاحب بنا لیا، انہیں سے شراب منگواتے انہیں سے ساقی گری کا کام لیتے اس طرح شراب سے انہیں قربت ہوتی گئی مگر پیتے نہ تھے، ان کا بیان تھا کہ جب ان کی بیوی نے انتقال کیا تو تو انہیں بڑا صدمہ ہوا اور اسی زمانے میں خورشید عالم نے ایک آدھ دفعہ جبراً پلا دیا، پھر کیا تھا انہیں مزہ لگ گیا اور ع

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

کہہ کر بلا نوشی شروع کر دی اتنی پیتے تھے کہ خورشید عالم بھی ان کے سامنے ماند پڑ گئے تھے، باوجود ان کی بے اعتدالیوں کے داغ انہیں چاہتے تھے اور ان کے پورے مصارف برداشت کرتے تھے طبیعت بڑی تیز پائی تھی موزونیت کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک نشست میں دو دو تین تین

غزلیں بے تکلّف کہہ لیتے تھے،

ابتداً ایک بیاض میں اپنا کلام نقل کر لیا کرتے تھے جو ضائع ہو گئی، اس کے بعد سے کبھی کلام جمع نہیں کیا کبھی غزل لکھ لیتے تو ایک تکیہ میں رکھ چھوڑتے، داغ کے انتقال کے بعد ایک آدھ سال خورشید عالم کے ساتھ رہے پھر خورشید عالم دہلی اور رامپور میں قیام کرنے لگے تو یہ بے گھر ہو گئے داغ کے شاگرد ہی ان کی خبر لیتے تھے، آخر عمر میں نواب سید جنگ کے صاحبزادوں کے پاس رہا کرتے تھے نواب عزیز یار جنگ روزانہ روپیہ بارہ آنے دیا کرتے تھے جو ان کی شراب کی راتب تھی۔ لوگ راستے میں گانٹھ کر دو چار آنے کی شراب پلا دیتے تو بڑی لمبی چوڑی غزل کہہ دیتے میں نے دیکھا ہے کہ بعض مشاعروں کی طرحوں میں دس۱۰ دس۱۰ بارہ۱۲ بارہ۱۲ غزلیں لوگوں کو کہہ دیں اور پھر بغیر غزل کے مشاعرے میں پہنچ گئے لوگوں نے غزل سنانے پر مجبور کیا تو فی البدیہہ دس۱۰ پندرہ۱۵ شعر نہایت ہی نفیس سُنا دئے،

ایک روز شراب پی کر میخانے سے نکلے ہی تھے کہ سامنے سے ایک بگھی آئی اور آپ نشہ میں ٹکرا کر گرے غالباً گھوڑے نے تیزی میں ایک دو۲ ٹاپ رسید کر دئے ہڈیاں ٹوٹ گئیں لوگوں نے اُٹھایا تو اُٹھتے اُٹھتے شعر کہا ؎

ضُعف سے کُوچۂ دُشمن میں گرا میں نے ٹھوکر بھی کہاں کھائی ہے

غزلیں جس تکئے میں بھری ہوئی تھیں اسے یار لوگوں نے غائب کر دیا، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ داغ کے عزیز شاگرد نے اِس متاعِ عزیز کو ارمغاں بنا لیا اللہ بہتر جانتا ہے کہ حقیقتِ حال کیا ہے، بہر حال نادان کا

کلام نہیں ملتا، مَیں نے بعض مشاعروں کے گُلدستوں سے اور سید نواب (نظام الدین صاحب) سے سُن کر جو شعر جمع کئے ہیں نقل کرتا ہوں ؎

یہ کیا کہتے ہو ہم سا دِلرُبا مشکل سے مِلتا ہے
خُدا ملتا ہے بندے سے جو بندہ دل سے ملتا ہے

تمہیں کون ہیں اور بہکانے والے
یہی آنے والے یہی جانے والے

کیا بتاؤں کِس پریشانی میں ہُوں
سر سے جو اُونچا ہو اُس پانی میں ہُوں
کِس کی زُلفیں کِس کا شانہ کِس کا خم
مَیں تو خود اپنی پریشانی میں ہُوں

آسماں کے نہیں زمیں کے نہیں
جو تمہارے نہیں کہیں کے نہیں

مُنہ پھیر کے شرم سے حیا سے
بوسہ بھی دیا تو کِس ادا سے
جلتے ہیں تو آپ کو غرض کیا
مَرتے ہیں تو آپ کی بَلا سے
نادان سمجھ کے مجھ کو نادان
دے جاتے ہیں روز دم دلاسے

حشر میں دادِ طلب جورِ بتاں کے آئے
ڈنکے بجتے ہوئے فریاد و فغاں کے آئے
بھولے بھٹکے بھی وُہ آجائیں تو اے دل یہ کہیو
قول کے سچّے وُہ پابندِ زبان کے آئے

چار پیسے گرہ میں ہوں ناداں
اپنے بیگانے آپ آتے ہیں
یُوں نہ تَن تَن کے تم کمر دیکھو
دیکھو لگ جائے گی نظر دیکھو
بن گئی میرے گلے کا ہار جو صُبح وصال
وُہ کمندِ ناز کا پھندا تھا انگڑائی نہ تھی

کچھ ایسی ہوئی عقل مری دیوانی
مَیں نے نہ محبّت میں کسی کی مانی
دِل مُفت گیا جان بھی لو جاتی ہے
ناداں ہوئی مجھ سے بڑی نادانی

برہمن کو ناز اپنے قشقہ و زُنّار پر
شیخ جی مغرور اپنے جُبّہ و دستار پر
ہم سوائے معصیت کچھ بھی نہیں رکھتے مگر
خُوب یاد آیا کہ ہیں بھُولے ہوئے غفّار پر

کبھی اُداس طبیعت کبھی اُچاٹ ہے دل — یہ حال تم جو نہ آؤ ضرور ہوتا ہے

بُتوں کو دیکھ کے ایماں سے بتا واعظ — یہ ڈیل ڈول یہ انداز حور ہوتا ہے

یہ آیا کون محشر میں ادا سے — پکڑ کر رہ گئی خلق خدا دل

بدنام ہو گے جا کے رہو گے جہاں کہیں — بہتر نہ میرے دل سے ملیگا مکاں کہیں

ان کو یہ ضد کہ رکھئے اُسے دم میں رات دن — مجھ کو یہ شوق ہو بھی چکے امتحاں کہیں

وہ خوگر ستم ہوں کہ ہر دم یہ فکر ہے — تو مہرباں نہ ہو بُت نامہرباں کہیں

ہائے اس میں اب خدا کا نام تک باقی نہیں — دل کی بستی ان بتوں نے کس قدر برباد کی

غربت میں اس کو ہم نے یہ جانا خضر ملا — اہل وطن جو کوئی ہمیں مل گیا کہیں

ذکر جسکا ہے زباں پر یاد جسکی دل میں ہے — اپنے گھر میں ہے خدا جانے وہ کس محفل میں ہے،

نادآن کے شعر مَیں نے اِس لئے زیادہ نقل کئے ہیں کہ یہ تلف ہو رہے ہیں اور کہیں بھی اس غریب سے اعتنا نہیں کی گئی افسوس ہے کہ نادآن کو انتقال کئے تیس ۳۰ بتیس سال ہو گئے لوگ انہیں بھول ہی گئے ہیں،

مرزا خورشید عالم

داغ کے اخیافی بھائی تھے داغ کی والدہ جب لال قلعہ میں مرزا فخرو ولیعہد سلطنت کے دامن سے وابستہ ہوئیں تو وہاں ۱۸۴۵ء ۱۲۶۱ھ میں مرزا خورشید عالم پیدا ہوئے ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو اللہ کو پیارے ہوگئے تو داغ کو بھی قلعہ سے نکلنا پڑا اور ان کی والدہ بھی داغ کے ساتھ ہی قلعہ سے نکل آئیں مگر خورشید عالم کو شاہ ظفر نے اپنی سرپرستی میں لے لیا، جب غدر کے بعد ظفر کو رنگون بھیج دیا گیا تو خورشید عالم داغ کے پاس رامپور جا رہے، داغ نے کوشش کر کے نواب صاحب رامپور سے ستّر روپئے تنخواہ مقرر کرا دی اور یہ کبھی رامپور کبھی دہلی رہنے لگے، جب داغ حیدرآباد آگئے تو

یہ بھی ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد آگئے اور داغ ہی کے پاس رہے، داغ نے حضور سے عرض کر کے جولائی ۱۸۹۹ء میں دو سو روپیہ ماہوار منصب جاری کرادی انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں شاہزادگان دہلی کے نام تنخواہیں جاری کیں تو ان کے نام بھی پچاس ۵۰ روپئے کا وظیفہ کر دیا تھا، اس طرح انہیں ساڑھے تین سو ۳۵۰ روپیہ ماہوار ملتا تھا، رہتے اور کھاتے داغ کے پاس تھے تنخواہ عیاشی اور شراب کے نذر ہوتی تھی، شادی ہو چکی تھی مگر بیوی نے ایک لڑکی چھوڑ کر انتقال کیا تھا اس کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی بلکہ اپنی بیٹی کی شادی دہلی کے ایک شریف الخاندان نوجوان محمد اسحٰق سے کر دی تھی جو صاحب اولاد تھے ایک لڑکا غالباً قطب عالم نامی تھا اور ایک لڑکی تھی جو ناصر الدین احمد خاں سے بیاہی گئی تھی،

داغ کے انتقال کے بعد کبھی حیدر آباد کبھی دہلی کبھی رامپور میں رہتے تھے، ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء کے اوائل میں حیدر آباد آکر اپنی منصب کی تنخواہ اپنے نواسے کے نام منتقل کرانا چاہا عرصے تک حیدر آباد میں مقیم رہے انہیں دنوں مجھے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، بڑے ہی خوش رو، خوش قیافہ، خوش پوش، وضع دار، وجیہہ اور بارعب بزرگ تھے مگر خوش باش نہ تھے، سنا ہے کہ خوش گلو بھی خاصے تھے علم موسیقی کے ماہر اور شاعر بھی بڑے اچھے تھے دسمبر ۱۹۱۲ء میں رامپور میں اللہ کو پیارے اور وہیں دفن ہوئے،

ایک دفعہ داغ نے غزل کہی۔ یہاں سے نکلا جان سے نکلا ردیف قافیہ میں مگر ایک مصرع وہ ایسا کہہ گئے کہ اس پر وہ خود مصرع نہیں پہنچا سکے کہنے کو بیسیوں مصرعے کہے مگر خود انہیں پسند نہیں آرہا تھا مشہور ہے کہ ایک روز داغ بیٹھے ہوئے اسی مصرع پر مصرعے پہنچا رہے تھے کہ خورشید عالم

اپنا بٹیر ہاتھ میں لئے آئے اور کہنے لگے بھائی جان مٹھائی کھلائیے تو ہم مصرع دیتے ہیں داغ کا مصرع تھا ع

جو ہماری زبان سے نکلا

جب داغ نے مٹھائی کھلانے کا وعدہ کیا تو خورشید عالم نے مصرع سنایا ع

اس کو سمجھو لکیر پتھر کی

داغ پھڑک گئے کہنے لگے تم میرا مصرع لے لو، انہوں نے کہا بھائی جان آپ نے غزل پوری کر لی ہے میں نے غزل تھوڑا ہی کہی ہے آپ اسے بدل کر لے لیجئے چنانچہ داغ نے اس طرح بدلا ع

سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے

خورشید عالم بالکل وارفتہ مزاج اور شہزادوں کی خصوصیات سے متصف تھے، کبرا بیگم نامی ایک خانگی بھی ان کے پاس آتی جاتی تھی جو بڑی ہی تیز اور طرار تھی چونکہ وہ داغ کے سلام کو بھی آتی تھی اور داغ کبھی کبھی اس سے ہنس بول لیتے تھے اس لئے اس نے شہرت دے رکھی تھی کہ وہ داغ صاحب سے متعلق ہے یہ قتل ہوئی اس کے قتل کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے اتفاقاً اس قتل کے مقدمے کی پوری فائل مجھے اس طرح ملی کہ میرے خالو احمد علی صاحب نے اپنے والد مولوی ارشد علی (مولوی کرامت العلی محدث دہلوی) کے انتقال کے بعد ان کی کتابیں اور کاغذات وغیرہ مجھے دیدیئے، اسی ذخیرے میں کبریٰ بیگم کے قتل کی مثل بھی تھی جس میں اس کی تصویر بھی تھی اور بعض بیانات میں داغ کا نام بھی جگہ جگہ آیا تھا اور ان بیانات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ عورت داغ سے متعلق تھی اب تک اکثر لوگ اسی مغالطہ میں مبتلا ہیں اس لئے مثل کے واقعات عرض کر دیتا ہوں،

کُبرا بیگم ایک شخص حافظ محمد اشرف کی بیٹی تھی خاندان شریف تھا مگر یہ آوارہ ہوگئی تھی منجملہ اور آدمیوں کے اس کے تعلقات خورشید عالم سے بھی تھے مگر یہ اپنے آپ کو فصیح الملک کی وابستہ بتاتی تھی، احمد علی کے ہاں بھی اس کی آمد و رفت تھی ایک مرتبہ مولوی ارشد علی کو اس کے آنے کی اطلاع مل گئی اور انہوں نے بگھی کے کوچ بکس سے ہنٹر گھسیٹ کر ایک دو ہنٹر رسید کر کے بھگا دیا، ہنٹر کی مار کا کچھ اثر اس پر نہ ہوا کیونکہ کرتا، ساڑی، برقعہ سب جسم پر لپیٹا ہوا تھا اس پر ہنٹر کیا اثر کرتا، اس واقعہ کے دوسرے روز کبرا کے چاہنے والے اسے میر عالم کے تالاب پر لے گئے جہاں آپس میں جھگڑا ہوگیا اور یہ ظاہر ہوا کہ دو حقیقی بھائیوں سے اس نے مغالطہ دے کر تعلقات رکھے ہیں چنانچہ ان دونوں بھائیوں نے مل کر اسے خوب پیٹا اور ادھ موا کر کے گھر بھیج دیا، سر شام یہ اپنے گھر پہنچی اور رات ہی میں مر گئی، دوسرے روز دفنا دی گئی، کوتوال بلدہ کو اس حادثے کی خبر لگی اور انہیں معلوم ہوا کہ ارشد علی نے بھی اسے پیٹا تھا تو محض ارشد علی کو پریشان کرنے کی خاطر قبر کھلوا کر نعش نکلوائی گئی اور پوسٹ مارٹم کرایا گیا ارشد علی کو اقدام قتل میں گرفتار کرنا چاہا مگر ان کا خاندان نہ صرف برسر اقتدار تھا بلکہ ان کے گھرانے میں چوٹی کے وکیل موجود تھے یہ لوگ کوتوال کی جان کو آگئے، مقدمہ چلا مگر خارج ہوگیا۔

حیدرآباد کے گلدستوں میں "کبرا بیگم تلمیذ داغ" کی غزلیں بھی طبع ہوتی رہتی تھیں چنانچہ گلدستۂ نسیم دکن اپریل ۱۹۰۲ء میں بھی ایک غزل طبع ہوئی ہے جس کا مطلع و مقطع ہے ؎

تم مانتے نہ مانتے دِل کا کہا کبھی
سُنتے تو کان رکھ کے مرا مدعا کبھی

یہ انقلاب دہر ہے کبرا تو ایک دن / محفل میں اسکے اپنی بندھے گی ہوا کبھی

کبرا کا قتل ماہ ذیقعدہ ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں ہوا ہے،

غرض داغ کا کوئی تعلق کبرا سے نہ تھا صرف یہ کہ وہ ان کے مکان میں خورشید عالم کے لئے آتی جاتی تھی اور داغ حسب عادت وہ سامنے آجاتی تو مذاق دل لگی کر لیتے تھے،

خورشید عالم شاعر بھی بڑے اچھے تھے، کم کہتے مگر خوب کہتے تھے اور اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے چند شعر نقل کرتا ہوں، ؎

وہ کہتے ہیں ہمارا چاہنے والا بھی ایسا ہو / زمانے سے انوکھا ہو تو دنیا سے نرالا ہو
شب وصل اسنے شرما کر یہ شوخی سے کہا آخر / ہمیں چھیڑے تو غارت ہو ہمیں دیکھے تو اندھا ہو
ستم سہنے کا ساری عمر کے یہ پھل ملا ہم کو / وہ اب سب سے یہ کہتے ہیں جو عاشق ہو تو ایسا ہو
ہوا ہم کو یہ حاصل دوستوں کی بیوفائی سے / کہ ہمنے عمر بھر کو توبہ کر لی آشنائی سے
جاتے تھے کہیں اور ادھر بھول کر آئے / کیا دیدہ و دانستہ وہ خود میرے گھر آئے
محشر ہو، اجل ہو کہ وہ کافر ہو کوئی ہو / ہم منتظر اسکے ہیں کہ جو بیشتر آئے
کون مرتا ہے کسی کے واسطے / جان کا کھونا بہت دشوار ہے

سائل دہلوی

مرزا سراج الدین احمد خاں نام تھا نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کے پوتے اور نواب شہاب الدین خاں کے بیٹے تھے، ۲۰ شوال ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۷ء کو تولد ہوئے چار برس کی عمر میں یتیم ہو گئے، دادا نے تعلیم و تربیت کی، نواب ممتاز الدین حسین خاں رئیس پاٹودی کی بہن سے شادی ہوئی مگر ان کی خفیف حرکات کی وجہ سے نباہ نہ ہوا اور افتراق ہو گیا، داغ کی آغوشی بیٹی

لاڈلی بیگم ان کے بڑے بھائی ممتاز الدین احمد خاں سے بیاہی گئی تھیں جنہوں نے ایک لڑکا چھوڑ کر انتقال کیا تھا داغ نے لاڈلی بیگم سے ان کا عقد ثانی کر دیا اور یہ گویا گھر داماد بن کر رہنے لگے چونکہ ان کی کمزوریوں سے لاڈلی بیگم واقف تھیں اس لئے ان پر چھائی ہوئی رہتی تھیں اور یہ بہت دبتے تھے،

۱۸۸۵ء میں نیر درخشاں کے بعد سے انہیں ریاست لوہارو سے سو روپے گزارہ ملتا تھا پھر مرزا احمد سعید خاں طالب نے لاولد انتقال کیا تو ان کے حصے سے پچاس روپئے اور اضافہ ہوئے اس طرح ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملنے لگا، تین سو روپیہ منصب حضور نظام نے لاڈلی بیگم کے نام مقرر فرمادی تھی، داغ کے انتقال کے بعد انہیں دونوں تنخواہوں سے ان لوگوں کی گزر بسر ہوتی رہی لاڈلی بیگم کو سائل سے بھی اولاد تھی غلام قطب الدین احمد اور غلام نظام الدین احمد دو لڑکوں کو تو میں نے دیکھا ہے غالباً بعد نظام الدین احمد نے انتقال کیا اور اب قطب الدین احمد حیات ہیں،

۱۹۰۸ء لاڈلی بیگم اور سائل کبھی حیدرآباد میں کبھی دہلی میں رہتے تھے بالآخر لاڈلی بیگم نے ۱۲ صفر ۱۳۲۶ھ کو ایک عرضی پیش کر کے مستقل طور پر دہلی میں رہنے کی اجازت مانگی، چنانچہ ۳۰ مارچ ۱۹۰۸ء کو انہیں مستقل طور پر دہلی میں رہنے کی اجازت مل گئی،

۱۹۳۷ء کے اواخر میں لاڈلی بیگم اور سائل حیدرآباد آئے اور لاڈلی بیگم نے اپنی تنخواہ منصب اپنے بچوں کے نام منتقل کرانے کی کوشش کی اتفاق سے یہاں پہنچ کر سائل نے گر کر کولہے کی ہڈی توڑلی اور مدت تک یہیں لیٹے رہے، اس زمانے میں سائل سے میری ملاقاتیں

اکثر ہوتی رہیں کیونکہ کاچی گوڑہ میں محسن گیٹ کے برابر والے مکان میں سائلؔ ٹھہرے ہوئے تھے اور گیٹ کے اندر مرزا حسین احمد بیگ، مرزا رفیق بیگ، مرزا رحمت اللہ بیگ، مرزا عصمت اللہ بیگ رہتے تھے روزانہ شام کو وہاں مرزا فرحت اللہ بیگ بھی آجاتے اور بڑی اچھی صحبت رہتی تھی میں بھی روزانہ جایا کرتا تھا، ہر دوسرے تیسرے سائلؔ مجھے بلوا لیتے اور میرے پہنچتے ہی رونے لگتے کہ تم نے مجھ غریب کو تنہا چھوڑ دیا ہے خبر تک نہیں لیتے بھائی تجلّی زندہ ہوتے تو ایک منٹ مجھ سے جدا نہیں رہتے یہ میری بدنصیبی ہے، چونکہ شروع ہی سے رقیق القلب تھے اس لئے جلد رو دیتے تھے مگر آدمی بڑے ہی نیک اور بھولے بھالے تھے، پرانی وضع داری اور رکھ رکھاؤ بھی ان میں تھا'

۲۸ اگست ۱۹۳۸ء کو اعلیٰحضرت حضور نظام نے ذریعہ نیم سرکاری پیشی مورخہ ۲ رجب ۱۳۵۷ھ کو حکم صادر فرمایا کہ

"میں نے سنا ہے کہ فصیح الملک مرحوم المخاطب داغؔ صاحب کی دختر کے نام جو اس ریاست سے منصب جاری ہے یہ ضعیفہ چاہتی ہے کہ یہ اس کے حینِ حیات اس کی اولاد کے نام منتقل ہو جو کہ خلاف قواعد وضوابطِ مجریہ ہے لہٰذا اس کو جواب دیا جائے کہ ایسا ممکن نہیں ہے ورنہ دوسروں کے لئے بری نظیر قائم ہو گی البتہ اس کی وفات کے بعد تحت قواعد مجریہ جو کچھ ممکن ہو گا گورنمنٹ کرے گی۔"

اس کارروائی کے ختم ہونے کے بعد جب ذرا سائلؔ ٹھیک ہوئے تو لاڈلی بیگم انہیں ساتھ لے کر دہلی واپس ہو گئیں، جہاں ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو سائلؔ اللہ کو پیارے ہو گئے، سائلؔ نے اپنا دیوان مکمل کر لیا تھا شعر

اتنے اچھے نہ کہتے تھے جتنی اچھی طرح پڑھتے تھے مشاعرہ میں گا کر غزل پڑھنے کی جدت سائل ہی نے شروع کی اور سب سے پہلے داغ کی غزل حیدرآباد کے ایک مشاعرے میں گا کر سُنائی اس کے بعد ہی سے شاعروں نے مشاعروں میں گلے بازیاں شروع کر دیں،

حیدرآباد کے بعض مشاعروں میں حضور کی غزل پڑھی جاتی تھی جسے خود داغ مشاعرے میں پڑھتے تھے اور اپنی غزل سائل سے پڑھوایا کرتے تھے، اور اُن مشاعروں میں بھی جن میں داغ شرکت نہ کر سکتے سائل ہی داغ کی غزل پڑھا کرتے تھے قُدرتاً آواز میں لوچ تھا پھر موسیقی سے واقفیت بھی تھی اس لئے ان سے غزل سُن کر لُطف آتا تھا، دیوان شائع نہ کر سکے چند شعر نقل کرتا ہوں ؎

نگہ کے تیر چھلنی کر دیا کرتے ہیں سینوں کو
جدھر وُہ دیکھ لیتے ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا

خموشی میں ہے عرض حال کیا کیا
کوئی سمجھے ہمارا مدعا کیا

برابر ہے جفا کیا ہے وفا کیا
جو دل آیا تو پھر اچھا بُرا کیا

کس کا کوچہ کس کی محفل کس کا وعدہ کس کا وصل
سب بلائیں ٹل گئیں جب دل پہ قابو ہو گیا

فقرے فریب دے کے دِل مُبتلا لیا
مجھ کو غریب جان کے تم نے بنا لیا

وُہ آشوب تجلی ہنس رہا ہے جو پس پردہ
مگر عکس تبسم آ پڑا ہے سارا چلمن پر

پیر مغاں نے تیز کیا نرخ مے اگر
میخانہ لُٹ ہی جائیگا فصل بہار میں

یہ بھی کوئی رونا ہے کہ دو اشک بھر آئے
آنکھوں میں لہو بن کے دل آئے جگر آئے

غم غلط شبہائے تنہائی کا ہو جاتا ہے کچُھ
دِل بہل جاتا ہے شغل نالہ و فریاد سے

لاڈلی بیگم

داغ کی ایک سالی اولیاء بیگم تھیں جو دہلی کے نام قدوس نامی کسی

شخص سے بیاہی گئی تھیں جن سے ایک لڑکی کلثوم بیگم تھی جو میر تصدق حسین نامی کسی شخص سے دہلی ہی میں بیاہی گئی تھی جن کی لڑکی لاڈلی بیگم تھیں،

قیام رامپور کے دوران میں داغ کو ایک لڑکا تولد ہوا تھا جو شیر خوارہی اللہ کو پیارا ہو گیا، اس کے ساتھ انتقال کا صدمہ داغ اور اُن کی بیوی کو بہت ہوا جسے دیکھ کر کلثوم بیگم نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کو داغ کی بیوی کی گود میں ڈال دیا اور انہوں نے بڑے لاڈ پیار سے ان کی پرورش و پرداخت کی داغ نے لاڈلی بیگم کی منصب کی اجرائی کے وقت ان کی عمر بیس[2] سال لکھائی ہے چونکہ تختۂ تقرر نو اجرائی منصب جنوری ۱۸۹۵ء میں مرتب ہوا ہے اس لئے ان کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء قرار پاتا ہے،

داغ نے گود لینے کے بعد سے لاڈلی بیگم کو اپنے پاس ہی رکھا اور اپنے ایک عزیز مرزا ممتاز الدین احمد خاں نبیرۂ مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں سے غالباً ۱۸۸۷ء میں شادی کر دی اور ۱۸۹۰ء میں ان کے بطن سے مرزا ناصر الدین احمد خاں تولد ہوئے کیونکہ تختۂ اجرائی منصب میں ۱۸۹۵ء میں داغ نے ناصر الدین احمد کی عمر پانچ سال لکھائی ہے، اکتوبر یا نومبر ۱۸۹۲ء میں ممتاز الدین احمد خاں نے انتقال کیا اور داغ نے لاڈلی بیگم اور ناصر کو حیدرآباد بلا لیا جنہیں سائل دہلی سے اپنے ساتھ لائے چونکہ لاڈلی بیگم جوان تھیں اور مرزا سائل بھی اپنی بیوی کو چھوڑ چکے تھے اس لئے داغ نے لاڈلی بیگم کا عقد ثانی ان سے کر دیا اور حضور نظام سے عرض کرکے تین سو[3] روپئے منصب جنوری ۱۸۹۵ء سے جاری کرا دی اور مرتے تک اپنے ساتھ ہی رکھا،

داغ کے انتقال کے بعد دو[2] ایک سال لاڈلی بیگم حیدرآباد ہی میں

رہیں پھر کبھی دہلی جاتیں اور کبھی یہیں آ کر رہ جاتیں اِس طرح گزارتی رہیں بالآخر ۱۹۰۸ء میں انہوں نے دہلی کے قیام کی اجازت لے لی اور مُستقل طور پر دہلی ہی میں رہنے لگیں چُنانچہ تقسیم ہند تک دہلی ہی میں اُن کا قیام رہا، تقسیم ہند کے بعد ان کے فرزند غلام قطب الدین احمد پاکستان چلے گئے جن کی وجہ سے مجبوراً لاڈلی بیگم بھی یہاں سے چلی گئیں اور لوہارو کے گزارے کے علاوہ حیدر آباد کی منصب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں پاکستان میں حیدرآباد ٹرسٹ فنڈ سے ایک آدھ سال تک ایک آدھ سَو روپیہ ماہوار ملتا رہا پھر یہ بھی بند ہو گیا اور اب وُہ بڑی ہی تکلیف اور عُسرت سے زندگی کے دِن پُورے کر رہی ہیں،

ناصرالدین احمد خاں،

داغ کے چہیتے نواسے تھے، ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے دو سال کے تھے کہ یتیم ہو گئے، داغ ہی نے پرورش پرداخت کی ۱۸۹۵ء میں چار سَو روپے ماہوار منصب جاری کرا دی اور شہزادوں کی طرح مدرسۂ عالیہ میں شریک کرایا، جوڑی کی بگھی میں مدرسہ بھجوایا کرتے تھے دو خدمتگار ساتھ ہوتے اور دو دو ٹیوٹر گھر پر مقرر تھے، لاڈلی بیگم کا غصّہ، سائل کی خفیف حرکتیں، داغ کی تیزی اور طباعی سب ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، خیر سے پندرھویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ داغ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، داغ کی بیجا نازبرداریوں کی وجہ سے اتنے شوخ ہو گئے تھے کہ لاڈلی بیگم اور سائل کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے داغ کے بعد خود مُختار ہو گئے تعلیم چھُوٹ گئی اپنے ہی ایک ٹیوٹر کی لڑکی جس کا نام غالباً مس کیری تھا کو گھر ڈال لیا مگر باوجود اس کے آوارگی جاری رہی پھر ذرا سنبھل کر نوکری بھی کر لی مگر طبیعت میں جہالت، آوارگی،

غیر ذمہ دارانہ پن بہت تھا بعض حرکات ایسی کیں کہ نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا پھر بھی رویہ درست نہ ہُوا تو حضور بندگانِ عالی نے ۷ ارشوال ۱۳۴۲ھ ہجری (۲۲ مئی ۱۹۲۴ء) کو منصب بھی مسدود فرمادی تاکہ انہیں سبق ملے مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہُوا یہاں سے دہلی چلے گئے اور اپنی کیری کو بھی جو ایک بچے کی ماں بن گئی تھی ساتھ لیتے گئے، ریاست لوہارو سے پچّاس روپیہ ماہوار گزارہ باپ کے انتقال کے بعد سے جو ملتا تھا اُسی پر گزر بسر کرتے رہے، کبھی نوکری بھی کی، چھوٹی موٹی تجارت بھی کی، مُختلف کاروبار کرتے رہے پھر کیری کو چھوڑ دیا وُہ بیچاری ابتداً لاڈلی بیگم کے پاس رہی پھر اس کا لڑکا نوکر ہو گیا تو وُہ الگ رہنے لگی اور ناصر نے خورشید عالم کی چھوٹی نواسی سے نکاح کر لیا جن سے تین بچّے ہوئے ایک تو بچپن ہی میں مر گیا اس کے بعد بیوی بھی انتقال کر گئیں اور دونوں بچّوں کو ساتھ لے کر ناصر حیدر آباد آگئے یا تو لاڈلی بیگم پہلے اور ناصر بعد آئے یا دونوں ساتھ ساتھ حیدر آباد پُہنچے بہر حال یہاں پہنچ کر ناصر نے اجرائی منصب کی کوشش شروع کی، نواب سالار جنگ مرحوم جو ناصر کے ہم درس رہ چکے تھے نواب منظور جنگ بہادر اور اکثر پُرانے دوستوں اور داغ کے شاگردوں نے ان کی خاصی مدد کی، منصب کی دوبارہ اجرائی کی کاروائی بھی شروع ہو گئی مگر انہوں نے پھر وہی حرکتیں شروع کر دیں جن کی وجہ سے منصب مسدود ہوئی تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ منصب اجرا نہ ہو سکی بلکہ ابھی کاروائی باب حکومت ہی میں تھی کہ حضور بندگانِ عالی نے ذریعہ فرمان مجریہ ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء حکم جاری فرما دیا کہ "اس کاروائی پر نظر ثانی ممکن نہیں"۔

لوہارو سے پچّاس روپیہ گزارہ جو ملتا تھا یہاں بھی وصول ہوتا رہا

اور ناصر نے بعض کمپنیوں میں مُلازمت بھی کرلی مگر کہیں ٹک نہ سکے تلوّن مزاجی اور وارستہ طبعی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا تھا، دو لڑکے جو یہاں ساتھ لائے تھے اُن میں سے ایک آوارہ ہو کر کسی طرف نکل گیا ایک لڑکا البتّہ ان کے ساتھ مصیبتیں جھیلتا رہا تقسیم ہند کے بعد لوہارو کا گزارہ بھی موقوف ہوگیا اور یہاں کے کاروبار بھی حسب دلخواہ نہ چلنے لگے تو ناصر نے ہجرت کی اور پاکستان چلے گئے اب وہیں ہیں،

ناصر میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ بہت ہی تیز اور بڑے ہی باہمت آدمی تھے کیمیا کی دُھن میں سونا رنگنا تو آگیا تھا، البتّہ بنا نہ سکتے تھے پھیکے سونے کو گہرا کر لیتے، موتی میں تیل اُتر جاتا تو صاف کر لیتے غرض بڑی خُوبیاں ان میں تھیں ہزاروں شعر یاد تھے بعض علّتوں میں مُبتلا نہ ہوتے تو بڑے کام کے آدمی تھے،

آخری مرتبہ حیدرآباد آنے کے بعد سے یہاں سے جانے تک مجھ سے مسلسل مُلاقاتیں رہیں جب کبھی فُرصت پاتے میرے پاس آجاتے اور گھنٹوں ٹھہرتے تھے، یُوں بہت ہی نیک اور پُرخلوص دوست تھے،

داغ کے معمولات

داغ بہت پابند مذہب حنفی المشرب تھے کسی سے بیعت نہ تھے مگر ہر ملا اور مشائخ کے معتقد تھے بزرگان دین سے بڑی عقیدت تھی ان بزرگوں کے ناموں کی ایک فہرست بنا رکھی تھی کوئی دن نہ جاتا جو کسی نہ کسی کا نیاز (فاتحہ)

نہ دلواتے ہوں، اِس فاتحہ کے لئے اپنے من بھاتے پکوان پکواتے خود کھاتے یار دوستوں کو کھلاتے تھے کوئی خاص پکوان نہ ہوسکتا تو بازار سے مٹھائی منگوا کر فاتحہ دلاتے مگر ناغہ نہ کرتے تھے،

محلہ سُلطان پورہ میں قبول پاشا قادری زرّین کُلاہ ایک بزرگ رہتے تھے انہوں نے "واردات باطن" کے نام سے ایک روزنامچہ حیدرآباد میں مُرتّب کیا تھا جس میں روزانہ آنے والے طالبان دُعا و استمداد کے نام لکھا کرتے تھے یہ روزنامچہ کُتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۰۸ھ میں داغ سیف الحق ادیب کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ہیں اور ان سے دُعا کی استدعا کی ہے،

شاگردی کی فاتحہ بھی بڑی پابندی سے دلوایا کرتے تھے، چاہے آٹھ آنے ہی کی مٹھائی کیوں نہ ہو مگر فاتحہ ضروری تھی، پوسٹ کے ذریعہ شاگرد ہونے والوں کو بھی فاتحہ دلانے کے لئے لکھا کرتے تھے اِس فاتحہ کی بھی کوئی تنگ نہ تھی،

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت نظامی گنجویؒ، حضرت شیخ سعدیؒ
حافظ شیرازیؒ، امیر خسروؒ، خواجہ میر دردؒ، شاہ نصیرؒ اور
اُستاد ذوقؒ"

کے ناموں کی فاتحہ کا لزوم تھا یہ ترتیب کن وجوہ کی بنا پر قائم ہوئی تھی اس کا پتہ نہیں کسی نے ان سے پوچھنے کی جُرأت نہ کی اور نہ خود انہوں نے وجہ بتائی،

نماز کے بچپن سے پابند تھے پانچوں نمازیں وقت پر پڑھا کرتے تھے مگر گھر ہی پر نماز کے عادی تھے مسجد جانے کا شوق نہ تھا چنانچہ مرنے تک

پابندی سے نماز ادا کی، روزے رامپور میں رہنے تک برابر رکھتے تھے کہتے تھے کہ وہیں سے خرابیٔ صحت کی وجہ سے روزے قضا ہونے لگے تھے مگر رمضان بھر مساکین کو کھانا کھلایا کرتے اور روزانہ افطار کا بڑا اہتمام کرتے اور دوست احباب اور شاگردوں کو افطار کرایا کرتے تھے، فطرہ اور زکوٰۃ کے بھی پابند تھے اور قربانی بھی بڑے اہتمام سے کرتے تھے،

صبح نماز فجر کے بعد باہر آجاتے سردیاں ہوتیں تو دھوپ میں ورنہ برانڈے میں کرسیاں بچھائی جاتیں وہاں وہیں بیٹھ کر شاگردوں کی غزلیں سنتے ڈاک دیکھتے اصلاح دیتے خطوط لکھواتے، گیارہ بجے اندر کے ہال میں آکر بیٹھ جاتے بارہ[12] بجے دسترخوان تیار ہوتا اور حاضر الوقت شاگردوں اور دوستوں کو ساتھ لے کر کھانا کھاتے پھر تھوڑی دیر تک بیٹھے حقہ پیتے رہتے اور حقہ ختم کر کے سونے کے کمرے میں جا کر قیلولہ کرتے پھر نماز ظہر پڑھ کر ایک دو[2] بازیاں شطرنج کی کھیلتے اور شاگردوں سے بات چیت کرتے یا غزل کہنے لگتے، نماز عصر پڑھ کر یا تو تفریح کے لئے باہر نکل جاتے یا کمپونڈ ہی میں بیٹھ جاتے اور پھر وہی غزل گوئی اصلاح اور خطوط نویسی کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو مغرب تک جاری رہتا نماز مغرب پڑھ کر گانا سنتے آٹھ بجنے تک گانا ہوتا پھر رات کا کھانا کھاتے رات میں عموماً شاگردوں اور دوستوں کی کھانے پر روک لیتے اور سب کے ساتھ کھاتے کھانا کھانے کے بعد حقہ پیتے اور پھر عشا کی نماز پڑھ کر شعر کہنے بیٹھ جاتے یا سو جاتے اور پھر رات میں اُٹھ کر تنہا بیٹھ کر حقہ پیتے جاتے اور شعر کہتے جاتے،

اس معمول میں بہت کم تغیر تبدل ہوتا ورنہ یہ پروگرام مسلسل پورا ہوتا رہتا ۔

شعر کہنے کا طریقہ

داغ شعر گوئی کے لئے کوئی اہتمام نہ کرتے تھے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے شعر کہتے رہتے، عموماً نئی زمین نکالتے کسی نہ کسی کو دوات قلم یا کاغذ پنسل دے کر بٹھا دیتے اور شعر لکھواتے جاتے قافیہ خود ڈھونڈھ لیتے جتنے قافیے ذہن میں آتے باندھ لیتے کوئی دیوان یا کتاب قافیوں کی نہ دیکھتے اور نہ کسی سے قافیہ پوچھتے، ہمیشہ پُورا شعر کہتے مصرع کہہ کر بعد کو دُوسرا مصرع بہت کم بہم پہنچاتے پہلے مطلع اور پھر درمیانی شعر کہتے بعض دفعہ غزل پُوری کر کے سوجاتے بعض دفعہ ادھوری چھوڑ کر پلنگ پر چلے جاتے کبھی کبھی نیند سے جاگ کر شعر کہنے بیٹھ جاتے حقّہ بھرواتے اور حلیم ختم ہونے تک شعر کہتے رہتے پھر سو جاتے مگر عموماً ایک ہی نشست میں غزل مکمّل کر لیتے تھے ۔

شعر پڑھنے کا طریقہ

داغ کے شعر پڑھنے کا طریقہ بڑا ہی نفیس اور بالکل قدرتی تھا چنانچہ قلعۂ معلیٰ کے مشاعروں میں اسی خصوصیت کی وجہ سے ذوق اپنی غزل داغ ہی سے پڑھواتے تھے کیونکہ خود ذوق کو جہاں پناہ (ظفر) کی غزل پڑھنی ہوتی تھی۔[1]

---

[1] انتخاب زرین مرتبہ راس مسعود صفحہ ۱۵۸ ۔

حیدر آباد کے بعض مشاعروں میں بھی اعلیٰحضرت حضور نظام اپنی غزل پڑھنے کے لئے سرفراز فرمایا کرتے تھے جسے داغ ہی پڑھا کرتے تھے،

والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "جب حضور کی غزل مشاعرے میں پڑھی جانے لگتی تو خود بانیٔ مشاعرہ یا کوئی اور ذمہ دار بزرگ کھڑے ہو کر اعلان کرتے کہ "کلام الملوک ملوک الکلام کی سماعت کا اعزاز حاصل کیجیئے" اس کے بعد صدر میں بیٹھ کر داغ حضور کی غزل سناتے معلوم یہ ہوتا تھا کہ واقعی کوئی بادشاہ اپنا کلام سنا رہا ہے بڑے ہی شاہانہ ٹھاٹھ اور شاہانہ وقار سے غزل سناتے لوگ داد دیتے تو ایک مربیانہ نظر ان پر ڈالتے اور پھر مصروف ہو جاتے حضوری غزل کے شعر مکرر بہت ہی کم سناتے تھے مگر لوگ زیادہ تقاضا کرتے تو بعض شعر سنا بھی دیتے تھے"۔

جس مشاعرے میں داغ حضور کی غزل پڑھتے اس میں اپنی غزل کسی اور سے پڑھواتے تھے چنانچہ شروع میں یعنے جب داغ نے حضوری غزلیں مشاعروں میں پڑھیں تو اپنی غزل مختلف شاگردوں سے پڑھوائی اور یہ سعادت زیادہ تر مستجاب خاں خلق کو نصیب ہوتی رہی کیونکہ وہ بھی داغ کے ہم قامت اور ہم جثہ تھے اور آواز بھی ان کے قریب پائی تھی اور پڑھنے کا انداز بھی انہیں کا اختیار کر لیا تھا مگر جب سائل دہلوی آگئے تو یہی داغ کی غزلیں مشاعروں میں پڑھنے لگے،

ریاستوں کے ملازمین ہمیشہ بڑی پابندیوں سے بسر کرتے رہے ہیں چنانچہ داغ بھی آنے جانے میں بعض طرح پابند تھے عام مشاعروں میں جانا خلاف اصول تھا اس لئے وہ نہ جاتے خاص خاص مشاعروں میں جانے کی البتہ ان کو اجازت تھی اور مخصوص مشاعروں میں بھی وہ شریک ہوتے تھے،

عام مشاعرے والے آکر مجبور کرتے تو داغ اپنی غزل بھیج دیتے یا پھر حضور سے اجازت لے کر شرکت کرتے تھے،

احسن مارہروی نے اپنے مضمون میں جو جون ۱۹۳۶ء میں نشرگاہ دہلی سے نشر اور علیگڈھ میگزین کے ستمبر ۱۹۳۶ء کے پرچے میں "داغ کی صحبت میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، لکھا ہے،

"مرزا داغ حیدرآباد کے عام مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے، جہاں شریک ہوتے وہاں مجمع کا یہ حال ہوتا کہ بلا مبالغہ تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی، اکثر یہ دیکھا گیا کہ زیادہ دیر ہوجانے کی وجہ سے شرکائے مشاعرہ بددل ہو کر اٹھ جاتے، کچھ وہیں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے، لیکن جب مرزا داغ کے پڑھنے کی نوبت آتی تو سب اُٹھے ہوئے بیٹھ جاتے اونگتے ہوئے چونک اٹھتے اور یہ معلوم ہوتا کہ مشاعرہ ابھی شروع ہوا ہے اور سب کے سب تازہ دم ہیں۔"

داغ مشاعرے میں غزل تحت لفظ پڑھتے تھے ترنم مطلق نہ ہوتا تھا اور نہ رُک رُک کر الفاظ پر زور دے کر الفاظ اور مصرعوں کو دُھرا دُھرا کر متاثر کرتے تھے سیدھے سادھے طریقے سے غزل سُناتے البتہ سیدھا ہاتھ ضرور بلند ہوتا رہتا، چاہے خود اپنے شعر سے متاثر ہوں یا کسی اور کے شعر سے زانو پر ہاتھ مارتے اور بس،

آواز میں ایک قسم کا وقار تھا اور ساتھ ہی ساتھ لوچ بھی، الفاظ پورے ادا کرتے اور رُک رُک کر پورا شعر ایک ہی وقت سُنا دیتے تھے، داغ کے مشاعرے میں غزل پڑھنے کی نقل مستجاب خاں خلق بڑی عمدہ کرتے تھے، ڈ

شعر سے متاثر ہو کر زانو پر ہاتھ مارنے کی نقل ان کا ملازم جمال صاحب خوب کرتا تھا۔

لباس

داغ دلّی والے تھے اور ان کی وضع ولباس بھی دلّی ہی کا تھا، البتہ وہ ٹوپی لوہارو وضع کی چوگوشیہ زرّین پہنتے تھے چنانچہ جب حیدرآباد آئے ہیں تو اسی لباس میں تھے، مگر یہاں آتے ہی انھوں نے یہیں کی وضع اختیار کر لی شیروانیاں حیدرآبادی وضع وتراش کی سلوائیں گرمیوں میں بنیان اور باریک ململ کے کرتے اور سردیوں میں فلالین کے قمیض اور پاجامے بھی کسی نہ کسی موٹے کپڑے یا فلالین ہی کے پہنتے تھے کیونکہ امراض کی وجہ سے پاؤں کو گرم رکھنا ضروری تھا، گھر پر عموماً دہلی کی وضع کی دوپلڑی یا ترُکی ٹوپی پہنتے مگر باہر جاتے تو عموماً منصب داری (دستار) پگڑی پہنتے تھے، کبھی کبھار رامپوری وضع کا شملہ بھی باندھ لیتے مگر بہت ہی کم، صبح وشام دو دفعہ غسل کرتے اور دونوں دفعہ کپڑے بدلتے تھے۔

عطر اور پھول کا شوق

عطر اور پھول کا بہت شوق تھا اور اس سے سہاگ اور خس اور قنوج

وغیرہ سے اگر، عنبر، شمامہ وغیرہ منگوایا کرتے، پہننے کے کپڑوں کے علاوہ پلنگ کی چادر، سرہانے کے تکئے، چھپرکھٹ کی مسہری کے پردوں پر تک عطر ملواتے، حقّے کی نئے بھی معطر کی جاتی،

داغ کو گل تکئے بہت پسند تھے چنانچہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت تکئے بنواتے ان میں ریشم بھرواتے اور رنگین ریشمی غلاف اور جھالر لگواتے اور عطر میں بسا کر گالوں اور گردن کے نیچے رکھا کرتے تھے،

پھول بھی بہت مرغوب تھے چنبیلی، موتیا بہت پسند تھے بچھونے پر عموماً پھول ڈلوا دیتے، حقہ کی نئے پر بھی پھولوں کا ہار لپیٹا جاتا، مکان کے ستونوں اور کھونٹیوں پر پھولوں کے تازہ گجرے لٹکتے رہتے، حقّہ بھی معطر ہوتا، خمیرہ ہمیشہ بڑھیا اور خوشبودار استعمال کرتے تھے جس کی بو سے کمرہ مہک اٹھتا تھا،

حقّہ کا شوق

داغ کو سوا حقّہ کے کسی اور چیز کی عادت نہ تھی حالانکہ پان بہت کھاتے تھے مگر اس کا نہ اتنا اہتمام ہوتا تھا اور نہ اتنی اہمیت تھی جتنی کہ حقّہ کی تھی، ہمیشہ نئی وضع کے سٹک پیچوان، کلی وغیرہ قسم کے حقّے خریدتے، چلموں کا بھی شوق تھا دور دور سے چلمیں آتی رہتی تھیں، خمیرہ خود بھی بنواتے اور لکھنؤ اور رامپور سے بھی منگوایا کرتے تھے،

جمال صاحب کے تفویض حقّہ اور خضاب دو ہی فرائض تھے، آگ خاص طور پر جلائی جاتی انگارہ خاص طور پر تیار کئے جاتے، پیچوان گلاب اور

کیوڑہ کے عرق سے تر کیا جاتا اس پر پھولوں کے ہار لپٹے جاتے غرض حقّے کی بڑی غیر معمولی آؤ بھگت ہوتی تب کہیں "بے جان بولتا تھا مسیحا کے ہاتھ میں"

کُتب خانہ

داغ کو مطالعہ کا شوق بھی تھا جو نئی کتاب شائع ہوتی خرید لیتے اور اسے پوری پڑھ کر رکھتے اساتذۂ اردو اور فارسی کے پورے کلیات اور دواوین ان کے کتب خانے میں موجود تھے، کتابوں کی جِلد قیمتی بنواتے اپنا نام ہر کتاب پر ڈلواتے اور الماریوں میں محفوظ رکھتے تھے، چار پانچ الماریاں کتابوں سے بھری تھیں اور ہر ایک الماری میں دو دو ڈھائی سَو کتابیں تھیں،

ان کے مطالعہ کا حال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دِلّی دربار کے زمانے میں مولوی عبدالرزاق مولف البرامکہ ان کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے البرامکہ کے متعلق گفتگو کی جس سے پتہ چلتا تھا کہ پوری کتاب کا مطالعہ غائر نظر سے کر چکے تھے،

کُتب خانہ کی فہرست مجلد تھی جس کی تنقیح ہر دوسرے تیسرے مہینے ہوتی اور کتابوں کا جائزہ لیا جاتا اگر کوئی کتاب کسی کے پاس رہ جاتی تو تقاضا کر کے منگوا لیتے اگر کوئی شاگرد یا دوست کتاب مستعار لے جاتا تو فہرست میں نوٹ کرا دیتے اور جب تک کتاب واپس نہیں ہو جاتی تقاضا جاری رکھتے تھے،

والد مرحوم نے ان کے کتب خانے کی فہرست بنائی تھی اور کئی بار اس کی

تنقیح اور کتابوں کا جائزہ لینا بھی انہیں کے تفویض رہا ہے ۞

نفاست پسندی

طبیعت میں بڑی نفاست تھی ہر چیز نفیس اور بڑھیا پسند کرتے تھے، کھانا، پینا، اوڑھنا، رہن، سہن، خرید و فروخت ہر بات میں نفاست تھی، تقرر ہوا اور پہلا بقایا ملا تو ایک بگھی (جوڑی) اور دو گھوڑے خریدے اور جب اضافہ ہوا اور اس کا بقایا ملا تو ایک سمپسن کارخانے کی ولایتی جوڑی کی گاڑی اور نفیس گھوڑے خریدے،

فرش فرنیچر اوڑھنا بچھونا تک نفیس سے نفیس تر تھا، سونے کا کمرہ دلہن کے کمرے کی طرح سجا ہوا رہتا تھا مسہری بھی دلہن کی مسہری کی طرح رنگین اور زرکار چوبی رہتی، سلمیٰ ستارا، گوٹا ٹھپّا ٹنکا ہوا انگوری بیل چڑھی ہوئی اور عطر سہاگ سے معطر،

سواری کا کرّوفر

داغ ہر دوسرے تیسرے جوڑی میں بیٹھ کر ہوا خوری کے لئے نکلتے عموماً سکندر آباد تک یا حسین ساگر کے کٹّے تک ورنہ کم از کم باغ عام کی تفریح ضرور کرتے، اندرونی سیٹ پر خود داغ بیٹھتے بازو حسن علی خاں امیر یا

وُہ نہ ہوں تو صاحب عالم کو بٹھا لیتے سامنے کی سیٹ پر بھی ایک آدھ شاگرد کو بٹھا لیتے، کوچوان کے بازو جمال صاحب خدمتگاری پگڑی باندھے کمربستہ پیچوان لیا ہُوا بیٹھتا جس کی نے داغ کے ہاتھ میں ہوتی راستہ بھر حُقّہ گڑ گڑاتے جاتے عطر اور خمیرے کی خوشبو سے راستہ مہک اُٹھتا، بگھی کے پیچھے ایک کرایہ کے تانگے میں بعض ضروری دوائیں، پاندان، خمیرے کا ڈبہ، کوئلے وغیرہ لئے ایک خدمتگار بیٹھا رہتا، یہ تانگہ محض حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھ رہتا تھا،

مولانا حالی حیدرآباد آئے ہوئے تھے انہیں نظام کلب میں ٹھہرایا گیا تھا نظام کلب اُن دنوں اُس عمارت میں تھا جہاں آج کل محبوبیہ گرلس کالج ہے سڑک پر مٹل بچھی ہوئی تھی، داغ کی سواری گزری تو گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اور عطر و خمیرے کی لپٹ ایک ساتھ اُن تک پہنچی سائیسوں کی ہٹو بچو کی آوازیں ربڑ ٹائر بگھی کا بے آواز گزرنا، گھوڑوں کے نعلوں کی مسلسل آواز نے انہیں سڑک کی طرف متوجہ کر دیا مگر فاصلہ اتنا تھا کہ صاف نظر نہ آتا تھا حاضرین میں سے کسی سے حالی نے پُوچھا کس کی سواری ہے تو کسی نے عرض کیا "نواب فصیح الملک داغ دہلوی ہیں،

داغ کا نام سُن کر حالی متاثر ہوئے فرمانے لگے خُدا سلامت رکھے اس ریاست ابد موت کو ایک شاعر کو اس نے یہ عزّت بخشی ہے، یہ جُملہ حالی نے داغ کے متعلق طنزاً تو نہیں کہا ہوگا صاف دلی ہی سے کہا ہوگا مگر ان کے دل میں داغ کی جگہ نہ تھی، داغ کی طرف سے کوئی خلش تھی، چنانچہ احسن اللہ خاں ثاقب نے امیر مینائی کے نام سے ایک مجموعۂ مکاتیب مرتّب کر کے شائع کیا جس میں داغ کے نام فرضی خطوط گھڑ کر شائع کئے اور

بزعم خود امیر کی سوانح عمری لکھتے ہوئے محاکمہ بھی کیا تو یہ کتاب حالی کے پاس بھی بھجوائی اور حالی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے دل کا بخار نکالا اور داغ کو داغ لگانے کی کوشش کی، حالانکہ ایک زمانہ میں حالی نے بھرے مشاعرے میں داغ کو "روشن چراغ" کہا تھا،

بخلاف اس کے جب یہی کتاب تبصرے کے لئے شبلی کے پاس پہنچی تو مولانا نے ثاقب کے لگائے ہوئے الزام جہالت کو یہ لکھ کر رد کر دیا کہ "اہلِ عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا اُسی قدر بڑا شاعر ہوگا یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے"!

مکاتیب امیر مینائی کی طبع ثانی میں مولانا حالی اور مولانا شبلی دونوں کے تبصرے طبع ہو گئے ہیں۔

خضاب

داغ کو خضاب کا بہت شوق تھا اور خضاب بھی نہایت ہی شوخ اور گہرا لگاتے تھے ہر تیسرے چوتھے روز خضاب لگایا جاتا، یہ کام بھی جمال صاحب کے تفویض تھا، جمال صاحب ہی خضاب گھوٹتا، ملتا اور اپنے ہاتھ سے لگاتا داغ آئینہ ہاتھ میں لئے بیٹھے رہتے جہاں کور کسر رہ جاتی ہدایت دیتے جاتے پھر ڈھاٹا باندھ کر بیٹھ جاتے خضاب لگاتے وقت عموماً اندر بیٹھتے باہر بیٹھ کر خضاب نہ لگاتے اور نہ اجنبیوں کو خضاب لگاتے وقت بلاتے مخصوص اور بے تکلف شاگردوں اور دوستوں کو البتہ اُس وقت بھی بلا لیتے

تھے، البتہ خضاب لگا کر ڈھاٹا باندھ لینے کے بعد کوئی اجنبی آ جائے تو بے تکلّف بُلا لیتے، معیّنہ وقت ختم ہونے کے بعد خضاب دھونا اور داغ کا مُنہ دُھلانا بھی جمال صاحب ہی کا کام تھا اور اس فن میں اسے مہارت تامہ حاصل ہو گئی تھی،

گھر کا ٹھاٹھ باٹھ

داغ طبعی اور فطری طور پر امیر واقع ہوئے تھے سیر چشمی اُن میں بہت زیادہ تھی اور ہر کام اپنے شایانِ شان کرتے تھے گھر کا ٹھاٹھ بالکل امیرانہ تھا زنانہ میں اننّا (مرحوم بیٹے کی انا جو لاڈلی بیگم کی کھلائی بھی تھی) لطیفن (ماما) سجن (ماما) چمپا (چھوکری) امیری اور صاحب (پرورده لڑکیاں) بطور مُلازم تھیں دِلّی کی دو چار بُوڑھیاں بھی آ گئی تھیں جو اندر ہی رہتی تھیں ایک بُڈّھی طوائف لطیف جان بھی انہیں میں تھی جو زنانی دروازے کے بازو ہی ایک کمرے میں بڑی ہی شان و شوکت سے رہتی تھی ساٹھ سال کی بُڑھیا تھی مگر نہایت نفیس مزاج کی اور حاضر جواب، زیادہ تر وقت داغ ہی کے پاس گزارتی تھی اس کے مصارف کے کفیل بھی داغ ہی تھے،

مُنشی جگناتھ پرشاد کارندے تھے اور منشی عبد الغنی خاں تحویلدار اور عبد العزیز منیجر تھے، غلام رسول کاتب دیوان تھے، عبد الحمید، جمال صاحب، چھوٹا محبوب، بڑا محبوب، سالار، مولٰنا، خدمتگار تھے، بگھی کا کوچوان تین چار سائیس، مالی مالن الگ مُلازم تھے، پہرہ دار البتہ سرکاری تھے جو نظم

جمعیت کے ملازم اور سرکاری طور پر متعین تھے،

قوال اور ایک جوتشی مہاراج بھی ملازم تھے ان کے علاوہ دلی سے آئے ہوئے دو تین پیر جی اور حافظ جی قسم کے بوڑھے ہمیشہ رہتے تھے اس طرح تیس ۳۰ آدمی اندر باہر تھے جو داغ ہی کے پاس کھاتے پیتے اور انہیں تنخواہیں یا مالی امداد داغ ہی دیا کرتے تھے،

عجیب بات ہے کہ داغ کے انتقال کے بعد عبدالحمید وطن چلے گئے، جمال صاحب اور عبدالغنی خاں نے کہیں ملازمت نہیں کی، البتہ عبدالعزیز صرفخاص میں ملازم ہو گئے تھے اور غلام رسول بعض مطابع سے کتابت کا کام لاکر گھر پر لکھتے تھے انہوں نے بھی کسی کی ملازمت نہیں کی منشی جگناتھ پرشاد نے دکان لگالی تھی، انتہا یہ کہ داغ کے قوال نے بھی ان کے انتقال کے بعد کہیں نوکری نہیں کی*

طوائف نوازی

داغ نے حیدرآباد آنے کے بعد تقرر ہوتے ہی صاحب جان کو نوکر رکھا یہ آگرے کی رہنے والی معمولی صورت شکل کی رنڈی تھی مگر گاتی خوب تھی، اس کے بعد میرٹھ کی رہنے والی عمدہ جان نوکر ہوئی جو نہ صرف حسین طرحدار اور حاضر جواب تھی بلکہ گانے میں بھی لاجواب تھی اس نے ایک شخص سے نکاح کر لیا تو داغ نے دوسری طوائفین سے دل بہلانا شروع کیا، چند روز تک الٰہی جان نظروں میں کھبی رہی، پھر امانی کی لڑکی جارن بائی بھی آتی جاتی

رہی اور حیدر آباد کی بھی بر بھی نظرِ عنایت رہی مگر مُستقل طور پر اختر جان سُورت والی دو سُو روپئے ماہوار پر مُلازم رہی، حجاب آئی اور چلی گئی مگر اختر جان کا اخترِ اقبال جگمگاتا ہی رہا اور یہ آخر عمر تک مُلازم رہی بیچ میں اور بھی طوائفیں آتی جاتی رہیں مگر کوئی مُستقل نوکر نہیں رہی،

اختر جان کو مَیں نے دیکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک عزیز کی شادی میں والدِ مرحوم کے ساتھ میں بھی گیا تھا عقد خوانی کے بعد گانے کے لئے طوائفیں آئیں تو اُن میں سے ایک طوائف نے والد کو سلام کیا اور بڑی بے تکلفی سے آ کر قریب بیٹھ گئی اور ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی ساری محفل حیران تھی کہ مولوی صاحب کی آشنائی رنڈی سے کیسی اور بھری محفل میں اِس طرح بات چیت کیا بات ہے چنانچہ خود مرحوم نے بھی اس کو محسوس کیا اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگے یہ وہی اختر جان ہیں جن پر اُستاد داغ جان چھڑکتے تھے چنانچہ میری جان پہچان بھی وہیں کی ہے، اِس تعارف کے بعد مَیں نے اکثر محفلوں میں اختر کو دیکھا اور سُنا ہے واقعی غیر معمولی عورت تھی باوجود ڈھلنے کے اس میں ایک بات تھی اور گاتی بھی خُوب تھی،

داغ کی طوائف نوازی صرف دِل لگی اور گانے کی خاطر تھی اس سے کوئی آوارگی یا اوباشی متعلق نہ تھی ورنہ یُوں وُہ پاکباز آدمی تھے اور لطیف جان جیسی کھوسٹ سے لے کر اختر جان جیسی جوان تک فقط اُن کا دِل بہلایا کرتی تھیں ورنہ جس طرح لطیف جان اُن کے لئے بیکار محض تھی اختر جان بھی ویسی ہی تھی،

مَیں سمجھتا ہوں کہ ان کی طوائف نوازی کا تعلق پبلیسٹی سے بھی تھا، دِن میں وہ جو غزل کہتے شام میں وہی غزل رنڈی کو یاد کرا دیتے خود دُھن بتلاتے، طرز

سکھاتے اور عمدگی سے گوا کر سُنتے، رنڈی یہ غزل اُسی رات اپنے گھر یا کوٹھے پر پہنچ کر دوسروں کو سُناتی دوسری رنڈیاں بھی یاد کر لیتیں اور شوقین بھی یاد کر لیتے نتیجہ یہ ہوتا کہ آج دوپہر میں داغ جو غزل کہتے وہ دوسری صبح سارے شہر میں مشہور ہو جاتی۔ اس پبلیسٹی میں قوال بھی برابر کے شریک تھے، رحمت اللہ قوال تو مُستقل ملازم تھا وہ چاہے نہ گائے مگر روزانہ حاضری دیتا اور تازہ غزلیں لے جاکر رنڈیوں اور قوالوں کو دیتا تھا اس طرح داغ کی غزلیں مشہور ہوتیں،

مگر اس شہرت اور ہردلعزیزی کی بنیاد صرف پروپیگنڈے ہی پر نہ تھی، اس میں کچھ داغ کی خوش قسمتی بھی شریک تھی، اکثر ایسا ہوتا کہ والد مرحوم یا کیفی وغیرہ سرِ مغرب داغ کے پاس سے واپس آتے اور وہ اسی روز کی کہی ہوئی تازہ غزل سُن کر آتے آٹھ نو بجے رات کو لوگ وہی غزل گاتے ہوئے راستوں پر سُنائی دیتے اور یہ لوگ حیران رہ جاتے،

داغ نے دو تین لڑکیاں پال رکھی تھیں، قحط میں گاؤں کے لوگ اپنی لڑکیوں کو شہر میں لاکر ذی مقدرت گھرانوں میں چھوڑ جاتے تھے تاکہ ان کی گزر بسر ہو جائے اور اچھی حالت میں رہیں ایسی ہی لڑکیاں داغ کے پاس لائی گئیں تو انہوں نے بھی پال لیا دو تین لڑکیاں تھیں جن کی عمر چھ چھ آٹھ آٹھ سال کی تھی داغ انہیں بڑی اچھی طرح رکھتے تھے،

داغ کے انتقال کے بعد یہ لڑکیاں لاڈلی بیگم کے پاس رہیں مگر جب انہوں نے مارنا پیٹنا شروع کیا تو ان کے پاس سے حسن علی خاں امیر کے گھر پر آگئیں اور مدتوں ان کے گھر پر رہیں،

بزمِ داغ میں ان لڑکیوں کی تیزی ذہانت اور طلاقت لسانی کی

بڑی داد دی گئی ہے معلوم نہیں یہ دروغ بافی جناب افتخار عالم نے فرمائی ہے یا احسن صاحب نے یا حضرت رفیق مارہروی نے بہرحال یہ سب غلط ہے جس طرح اور چھوکریاں گاؤں کی ہوتی تھیں ویسی ہی گھامڑ غبی سُست اور کُند لڑکیاں یہ بھی تھیں میں نے اور برادر عزیزم میر یاسین علی خاں نے انہیں مدّتوں دیکھا ہے اور خالہ صاحبہ (والدۂ یاسین علی خاں) بھی بیان فرماتی ہیں کہ حد درجہ کُند ذہن غبی اور سُست معمولی باندیاں تھیں، رہا داغ کا ان لڑکیوں سے ہنسنا اور مذاق کرنا اس سے ان لڑکیوں کی تیزی پر کیا روشنی پڑ سکتی ہے وُہ تو داغ کی اُفتاد طبع ہی تھی ہر ایک سے دِل لگی کرتے ہی رہتے تھے،

غرض نشاط طبع کے یہ سب سامان بہر کلام میں شوخی اور عشق و محبت کی چاشنی پیدا کرنے اور طبیعت کو شگفتہ رکھنے کے لئے یہ لوازمات ضروری تھے۔

داغ کی غذا

داغ کو کھانے کا بہت شوق تھا اور وُہ نہایت خوش خوراک تھے، والد مرحوم کو داغ کے گھر پر ان کے ساتھ کھانا کھانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے کیونکہ رات کے کھانے پر داغ اپنے اکثر شاگردوں کو روک لیا کرتے تھے اس لئے وُہ فرماتے تھے کہ اُستاد آدھ سیر کی روٹیاں ہر وقت کھایا کرتے تھے، سری پایوں کا بڑا شوق تھا، سردیوں میں ہمیشہ سری پائے پکواتے،

دلّی، رامپور اور حیدر آباد تینوں شہروں میں ذرے ذرے تغیّر کے ساتھ اس کا پکوان ہوتا ہے اس لئے باری باری سے ان تینوں طریقوں سے سری پائے پکواتے اور کھاتے تھے،

والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ راقم الحروف کی رسم عقیقہ میں تقریب ہوئی تو داغ بھی مدعو کئے گئے، دکنی سالن، بگھارے بیگن، دہی کی کڑی، چگر بھی دسترخواں پر تھے داغ نے خوب مزے لے لے کر ان سالنوں سے لطف اٹھایا کیونکہ وہ مرچ خوب کھاتے تھے البتّہ کھٹّے کے عادی نہ تھے، چگر بطور چٹنی انہیں بہت پسند آیا، یوں دوسری چیزیں ہانڈی کباب اور توتک بھی پسند کئے مگر چگر کی اکثر فرمائش کرتے اور کبھی کبھی ہانڈی کباب اور توتک کی فرمائش بھی کرتے اور منگوا کر مزے لے لے کر کھاتے تھے،

مئی اور جون ۱۸۹۵ء اعلیحضرت حضور نظام پاکھال کے جنگل میں مصروف شکار رہے اس سفر میں میرے خسر مولوی بہاء الدین بھی حضور کے ہمرکاب تھے چونکہ مولوی صاحب کے خاندان سے داغ کے مراسم تھے، اور مولوی صاحب کا خیمہ اور داغ کا ڈیرہ شکار گاہ میں ایک دوسرے کے برابر برابر تھے، داغ اعصابی امراض کی وجہ سے اپنے ڈیرے ہی میں رہا کرتے تھے اور مولوی صاحب کو بندوق بازی سے کوئی شغف نہ تھا اس لئے دونوں کیمپ ہی میں رہتے تھے مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ہمارے لئے میر خانۂ شاہی سے "خاصہ" آتا تھا مگر داغ روزانہ اپنی پسند کی چیزیں بھی پکوالیا کرتے تھے عموماً داغ مولوی بہاء الدین اور نواب محبوب یار جنگ ایک ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے خاصہ جو میر خانہ سے آتا تھا اس میں چپاتیاں نہ ہوتیں بلکہ پراٹھے ہوتے تھے اس لئے داغ اپنے

ذائقے کے دو ایک سالن اور چپاتیاں الگ پکوالیا کرتے تھے محبوب یار جنگ کے یہاں کوئی نہ کوئی چیز علیحدہ پکوائی جاتی تھی، مولوی بہاءالدین دہلوی باپ کے بیٹے تھے مگر ماں دکنی تھیں اس لئے ہندوستانی اور دکنی دونوں قسم کے کھانے مزے سے لے کر کھاتے تھے، داغ کا حال یہ تھا کہ دونوں بزرگ مل کر جتنی غذا کھاتے اکیلے داغ اس مجموعی مقدار سے دگنی غذا کھالیتے تھے،

نواب عزیز یار جنگ کی زبانی نوری نے اپنی کتاب داغ میں نقل کیا ہے کہ جب داغ کی بیوی کی حالت ابتر ہونے لگی اور زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو داغ باہر آکر ایک آرام کرسی پر لیٹ گئے اور لگے رونے اور عزیز نے صبر کی تلقین شروع کی اتنے میں اناجی زنانی دروازے پر آئیں اور عزیز کو بلا کر ایک رکابی چھلی ہوئی بونٹ کی دی کہ صبح سے گھر میں چولہا نہیں جلا ہے تمہارے اُستاد بھوکے ہیں انہیں کھلادو، عزیز نے داغ کو سمجھا منا کر بونٹ کھلادی اور ہائے وائے کرتے ہوئے داغ نے آدھ سیر بونٹ چٹ کردی،

۱۹۰۳ء میں دلی دربار کے موقع پر داغ دہلی پہنچے تو اُن کے چہیتے شاگرد بیخود دہلوی بھی ملنے گئے اور داغ نے کہا،

"میاں بیخود! ایک دفعہ تم نے ہرن کے کباب کھلائے تھے وہ اس مزے کی چاٹ تھی کہ آج تک ہونٹ چاٹ رہا ہوں، حیدرآباد میں ہرن دیکھنے کو نہیں ملتا[۱] اس کے گوشت کو جی ترستا ہے ایک دفعہ

---

[۱] یہ صحیح نہیں ہے ممکن ہے کہ داغ نے ہرن کے کباب نہ ملنے کی شکایت کی ہو، ہرن حیدرآباد میں بہت تھے چنانچہ حیدرآباد سے تین چار میل ہی کے فاصلے سے صحرائے محصورہ تھا جہاں ہرنیں سینکڑوں کی تعداد میں گھومتی پھرتی تھیں اور داغ اکثر سرور نگر کے کسی باغ کی اجازت لے کر ہفتہ دو ہفتے وہاں جا کر ٹھہرتے اور خوب ہرنوں کا گوشت کھایا کرتے تھے ان کے اپنے "جانور خانے" میں بھی ہرن پلی ہوئی تھی،

تو بیٹا پھر ویسے ہی کباب کھلا دے خدا کرے تیری طبع شوخ و شنگ میدانِ سخن میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرے[1]،،

داغ کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی خاص چیز پکوانے کو جی چاہتا تو فاتحہ کی فہرست دیکھتے اور فاتحہ کے بہانے فرمائش کرتے، عام طور پر جمعہ کے روز دوپہر کا کھانا پُر تکلف ہوتا تھا اور ایک دو اضافے ضرور ہوتے تھے اُس روز اکثر حاضر باشوں کو کھانے پر روک لیتے خود بھی کھاتے اور دوسروں کو بھی کھلاتے،

شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا داغ کے ایک شاگرد اور بڑے سلیقے کے بزرگ تھے ان کے پاس سے مٹھائیاں، اچار، پاپڑ، بڑیاں وغیرہ ہمیشہ تحفۃً آتی تھیں اور داغ بھی فرمائش کر کے حب کے لوز بڑیاں اور پاپڑ منگوا لیتے،

بعض اور شاگردوں اور دوستوں سے بھی فرمائش کر کے بعض چیزیں منگوایا کرتے تھے مگر یہ مخصوص شاگردوں اور دوستوں سے ہوتا تھا، سبھوں سے فرمائش نہ ہوتی تھی اِس معاملے میں داغ بہت غیور اور بڑے ہی رکھ رکھاؤ کے مالک تھے کسی کا اِس قسم کا احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

آم کا شوق

داغ کو آم کا بہت شوق تھا اور خوب مزے لے لے کر کھایا کرتے تھے

---

[1] رسالہ ساقی دہلی ماہ مارچ ۱۹۴۲ء مضمون "داغ کی شخصیت" از وحید الدین بیخود دہلوی،

چنانچہ کہا ہے ؎

آم تخمی پسند ہے ہم کو — اِس کو ہم پلپلا کے کھاتے ہیں

۱۸۹۳ء میں حیدر آباد میں آم کی فصل کچھ اچھی نہیں ہوئی تھی بازار میں آم بہت کم آرہے تھے داغ نے دو رُباعیاں کہہ کر حضور میں گزرانیں ؎

اچھے بُرے مل جاتے ہیں بازاری آم — اب تو نظر آتے ہیں بدشواری آم
مرغوبہ و دل پسند والفن اے داغ — سُنتا ہوں کہ باغوں میں ہیں سرکاری آم

اِس پانچ برس میں ہوئی ہر فصل تمام — لیکن نہ ہوا داغ کبھی شیریں کام
کونین میں بے مثل یہ دو میوے ہیں — فردوس کے سیب حیدر آباد کے آم

اِن رُباعیوں کو ملاحظہ فرما کر حضور نے آم سرفراز فرمائے، ہر قسم کے آم بافراط سرفراز ہوئے، اِس سرفرازی کے شکریہ میں داغ نے برطار سیلہ قطعہ کہہ کر پیش کیا ؎

شاہ نے دیں آم بھری کشتیاں — بحرِ سخا کیا ہی ہوا موج زن
کشتیوں میں آم جو ہیں رنگ رنگ — داغ کا گھر آج ہے رشکِ چمن
سُرخ میں ہے لالہ رخوں کی بہار — سبز میں ہے سبزہ خطوں کی پھبن
زرد میں ہے رنگِ گلِ زعفراں — کیسری پوشوں کی ہے اک انجمن
آم کے منہ پر ہے سیاہی کہ ہے — مردمکِ چشمِ بتِ سحر فن
الفن و مرغوبہ و عزالثمر[1] — ذائقہ میں غیرتِ شہدِ عدن
ایسے کہاں پریوں کے پر سبز سبز — ایسے کہاں حوروں کے سیب ذقن
طوطا پری، لال دیا، دِل پسند — کہتے ہیں نامی انہیں اہلِ دکن

---

[1] عزالثمر ایک مشہور آم تھا جو ان دنوں صرف شاہی باغوں میں ہوتا تھا، ۱۲

آم "ہرا جام" زمرد کی شکل — "لال دیا" صورت لعل یمن
سونگھ کے ہو جائے معطر دماغ — منہ پہ مگر اُن کے ہے مشک ختن
رنگ ہے وہ شوخ کہ جیسے پری — اور وہ خوشبو کہ معطر دہن
گر کبھی اِن آموں کا رس چوس لیں — ہونٹ بھی چاٹا کریں شیریں دہن
ابنۂ شیریں جو اُسے ہو نصیب — نام بھی شیریں کا نہ لے کوہکن
جنت دُنیا کے یہی تو ہیں آم — ان کا ہی مصلح ہے بہشتی لبن
ایسے رسیلے ہیں وہ نازک ہے پوست — جیسے کہ ہوں دلبر نازک بدن
سینکڑوں قسمیں اسی میوے کی ہیں — پھر ہے یہ افراط کہ لاکھوں ہی من
واقعی اِن آموں کی تعریف میں — کم ہے جہاں تک اہلِ سخن
قاش بنے اس کی جو اپنی زباں — قند کا کوزہ بنے اپنا دہن
دیکھئے شیرینیٔ گفتار پھر — نطق بھی چپکے دمِ عرضِ سخن
نام تو ہے گرچہ یہ معنی نہ ہوں — شرکت اسمی سے ہے شیریں دہن
مجھ کو یہ مصرع بہت آیا پسند — ابنتہ اللہ نباتاً الحسن
پھولے پھلے شاہ کا باغ مراد — اور ثمر یاب ہوں اہل زمن
فیض رساں شاہ یہ یارب رہے — خسرو محبوب نظام دکن

داغ شکار گاہ میں

داغ کے حیدر آباد آنے کے بعد ۱۳۰۹ھ (۹۰-۱۸۸۹ء) میں حضور شکار کو تشریف لے گئے تو داغ حیدر آباد ہی میں تھے اور جب بھی شکار کی اطلاع ملتی قطعہ

تاریخ کہہ دیتے تھے مگر ۱۸۹۴ء ۱۳۱۱ھ میں داغ کو حضور کے ساتھ شکارگاہ کو جانا پڑا، اس سفر کی تفصیل کہیں نہیں ملتی انشائے داغ میں ۲ دو خطوط ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ داغ اس سفر میں بہت پریشان رہے،

۱۸ شوال ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء کو بیخود دہلوی کو لکھا ہے،

"میں ماہ رجب سے سفر میں ہوں، شیر کا شکار ہو رہا ہے اس وقت جھاڑی میں نظام کا کیمپ ہے" یہاں کوئی بادشاہ تو کیا فقیر بھی نہیں آیا، موسم گرم، ویرانۂ محض، ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت"

دیوان کیسا اس جنگل سے تھوڑی سی وحشت کہو تو بھیج دوں"

(انشائے داغ ص۹۶)

۲۸ مئی کو محمود خاں محمود رامپوری کو لکھا ہے،

"میں تو پانچ مہینے سے سفر میں ہوں ہم رکاب بندگان عالی متعالی"

۱۸۹۵ء میں بھی حضور شکار کو تشریف لے گئے تو اس وقت بھی داغ ہمراہ تھے، افسر جنگ نے ایک "شکار نامہ" لکھا ہے جو طبع ہو چکا ہے مگر اس میں انہوں نے حضور کی تعریف اور اپنی بہادری کی تفصیل ہی لکھی ہے اس کے علاوہ اپنی سوانح حیات بھی "سوانح افسری" کے نام سے لکھی اور شائع کی ہے جس میں ان شکاروں کی تفصیل تو ہے مگر انہوں نے صرف ایک ہی شکار ۵ مئی ۱۸۹۵ء تا یکم جولائی ۱۸۹۵ء میں داغ کی ہمراہی لکھی ہے (ص۲۸۷-۴۰۲) اس میں صرف ۲ دو ہی جگہ داغ کا نام آیا ہے، شروع میں ہمراہیان حضور کی فہرست میں اور راستے میں گاڑی الٹنے کا ذکر جس میں داغ ہی سوار تھے، اتفاق سے اس سفر میں چونکہ میرے خسر مولوی بہاء الدین بھی ہمرکاب

رہے ہیں اِس لئے اُن سے اس سفر کی تفصیلات مجھے معلوم ہوئیں،

جیسا کہ داغ نے بیخود کو لکھا ہے یہ شکار گاہیں حد درجہ وحشت ناک اور ہیبت خیز ہیں خوش نصیبی یا بد نصیبی سے مجھے بھی دو بار ان وحشت ناک شکار گاہوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے نہ تو یہاں کوئی اچھی قسم کے درخت ہی ہیں اور نہ پُر فضا وادیاں ہی، گھنا اور ہریلے درختوں کا جنگل ہے، آب و ہوا نہایت غلیظ اور کثیف اور منظر بڑا ہی وحشت ناک، وہاں بھلا شعر و شاعری کیا ہو سکتی تھی، داغ نے وہاں جو نظم کہی ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی رُوکھی پھیکی اور روا روی میں کہی ہوئی ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے قصیدہ کہنا چاہا تھا مگر یہ قصیدہ نہ ہو سکا نہ نظم بن سکی انتہا یہ کہ آخر میں تاریخ بھی نہ نکل سکی تو سر فرازی گھڑی کی تاریخ کہہ کر جان چھڑا لی ے

شجاعت سخاوت ہمیشہ ہے تو اَم | وہ آصف میں پائی وہ آصف میں دیکھی
اِدھر شیر مارے اُدھر توڑے بخشے | خدا نے یہ جُرأت یہ ہمت عطا کی
عناں جب اُٹھائی تو پھر کون روکے | نہ ندی نہ نالہ نہ جنگل نہ جھاڑی
ہوا یہ کسے شوق صید افگنی کا | نہ برسات مانع نہ گرمی نہ سردی
بہت سے میرے سامنے شیر مارے | لگی شیر کے سر پہ یا دِل پہ گولی
دِل و دست جب تک قبضے میں ہونگے | لگے گی نہ ہر بار بندوق ایسی
اُڑائے رُوپئے پھینک کر آسماں پر | لگی پر رُوپئے کے نشانے پہ گولی
جو لی بائیں شانے پہ بندوق شہ نے | تو حیرت ہوئی چشم مردم پہ طاری
خصوصاً مجھے تھا تحیّر کا عالم | کہ حضرت لگاتے ہیں بندوق یُوں بھی
اُڑائے بہت اِس طرح بھی نشانے | کسی میں سُنی تھی نہ یہ بات دیکھی

یہ دل کیوں پریشاں ہو جب پئے بہ پئے ہو — ترحم، تلطف، تسلّی، تشفی
توجہ ہر اک پر خبر گیر سب کے — پھر اس پر خیالات مُلکی و مالی
مرے حال پر جو عنایت ہے اب تک — وُہ مشہور عالم ہوئی ہے کہانی
سراسر کرم ہے یہ شاہِ دکن کا — بھلا کیا ہوں میں اور کیا میری ہستی
سلاطین عالم سے کیا مجھ کو مطلب — کسی سے غرض ہے نہ پروا کسی کی
نہیں ہفت اقلیم سے کچھ تمنّا — کہ اپنے لئے ہے یہ سرکار عالی
ہوئی ابتدا اسے وطن ہی میں حاصل — نمک خوارئ شاہِ جم جاہِ دہلی
پس غدر تھا رامپور اپنا مسکن — مری قدر کی سب نے لیکن نہ ایسی
یہاں مجھ کو بخت رسا کیوں نہ لاتا — اب وجا ہوئے سب رئیس و سپاہی
ملا بادشہ قدر داں و ہنرور — بگڑ کر بنی ہے یہ قسمت کی خوبی
سعادت کا ہو اپنے طالع کو مژدہ — مبارک ہو بخت رسا کو ترقی
یہی آرزو ہے یہی ہے تمنّا — کوئی کام انجام ہو حسب مرضی
ادا ہو نہ حقِ نمک جب بھی ہرگز — تصدّق ہو سو جان سے گر یہ فدوی
کرم پر کرم ہے عطا پر عطا ہے — یہیں یا الٰہی رہے لطفِ شاہی
نمک خوار کی پرورش ہر طرح ہے — زہے دل نوازی زہے سرفرازی
گھڑی جب ملی مجھ کو میں نے یہ جانا — مرے بخت کی ساعت نیک آئی
ستاروں سے روشن وُہ ہیرے جڑے ہیں — کہ خورشید کی آنکھ بھی جس سے جھپکی
لکھ اس گھڑی داغ تاریخ زیبا — مرصع منوّر گھڑی شاہ نے دی

اِس نظم کے بعد داغ نے ایک اور نظم بھی شروع کی تھی مگر چند شعر سے آگے نہ بڑھ سکے۔

نظام دکن نے بہت شیر مارے — کہ اس بن میں آکر شکار آپ کھیلا

یہاں ایک تالاب پاکھال کا ہے
فقط نام سُنتے تھے اب آکے دیکھا

چھُپا اس کی شہرت سے آبِ بقا بھی
اسے دیکھ کر چشمۂ مہر سے دکھا

رہا پھر اگر دور یہ آبِ شیریں
تو ساحل بھی لب اپنے چاٹا کریگا

کنارہ پہ تالاب کے کرّ و فر ہے
ہوئی جب نصب بارگاہِ معلیٰ

دو رویہ ستادہ ہوئے سب کے خیمے
شریک ان میں داغ نمکخوار بھی تھا

ہر اک اس کا مصرع ہے تاریخ دیکھو
یہ مطلع زباں پر مرے دل سے آیا

اس کے بعد نہ تو مطلع ہی ہُوا اور نہ تاریخی مصرعے، وحشت نے سب بھُلا دیا اور قطعہ ناتمام رہ گیا۔

وطن کی محبّت

داغ کو اپنے وطن سے بڑی محبّت تھی، اگلے زمانے میں شمالی ہند والے دکن کو الگ تصوّر کرتے اور ہندوستان اور دکن کو جُدا سمجھتے تھے اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ تعصّب وطنی یا کسی اور جذبہ کے تحت ایسا کرتے تھے بلکہ فاصلہ اور جُغرافیائی علٰحدگی کی وجہ سے یوپی کو ہندوستان اور پنجاب، مدراس اور دکن کو علٰحدہ علٰحدہ ناموں سے پُکارتے تھے چنانچہ سر آسمانجاہ بہادر علیگڑھ تشریف لے گئے تو علامہ شبلی نے جو قصیدہ سُنایا اس کا ایک شعر ہے ؎

آسماں جاہ از سوئے مُلکِ دکن
جانبِ ہندوستاں آید ہمے

اسی طرح دکن والے بھی یوپی کو ہندوستان کہتے تھے چنانچہ داغ بھی آخر تک

یہی کہتے رہے،

۲۱ ذی الحجہ ۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء کو مشرف یار خاں شرف جاورہ کو ایک خط میں لکھا ہے،

"سب کچھ خدا نے دیا ہے کسی پردیسی کو ایسی عزت اس دربار میں نہیں ہوئی روٹی بھی پچّاس کو کھلا کر کھاتا ہوں مگر ہائے رے ہندوستان تیرا ارمان ..." (انشائے داغ ص ۱۰۷)

داغ اِس نُکتے سے واقف تھے کہ روم میں رہو تو روم والوں جیسے بن جاؤ چُنانچہ وُہ رہن سہن، بول چال سب میں دکنی بن گئے تھے یہی ہندوستان پر غور فرمائیے حیدرآباد والوں کے نزدیک ہندوستان سے مُراد شمالی ہند تھا، اِس پر اعتراض کرنا جھگڑا مول لینا تھا چنانچہ داغ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ خود بھی شمالی ہند کو ہندوستان بولنے لگے اور حیدرآباد والوں میں گھُل مِل گئے،

بخلاف داغ کے فانی بدایونی نے اس ہندوستان کہنے پر سخت اعتراض کیا ہے

فانی دکن میں آکے یہ عُقدہ کھُلا ہمیں ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دُور

نتیجہ یہ نکلا کہ فانی حیدرآبادیوں سے دُور ہوتے گئے اور وہ حیدرآباد میں مقبُول نہ ہو سکے، بات بالکل معمولی تھی ذراسی غلطی کا نتیجہ بہت ہی بُرا نکلا، داغ اِن باتوں کو سمجھتے تھے اِس لئے وُہ ہر جگہ کامیاب رہے،

داغ کا یہ حال تھا کہ دہلی کے نام پر بےچین ہو جاتے اور دہلی کا ذکر ہوتا تو گھنٹوں دہلئ مرحوم کا تذکرہ کرتے اور ساتھ ہی ساتھ عزیز و اقارب کے لئے بھی بےچین رہتے تھے

کس طرح یکجا ہوں داغ اپنے عزیز ہونے دیتی ہی نہیں تقدیر جمع

صرف عزیز و اقارب ہی نہیں احباب کے لئے بھی داغ بے چین رہتے تھے ؎

یاد آتے ہیں وہ اشخاص مصاحب منزل دو گھڑی جلسہ وہ احباب کے شامل اپنا
نہیں اکثر کا نشاں اور جو کچھ باقی ہے اُن سے ملنے کو تڑپتا ہے بہت دل اپنا

حیدر آباد سے اُنس

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے داغ حیدر آباد پہنچ کر حیدر آبادی بن گئے تھے شہر اور شہر یار اور یاران دکن سے انہیں اُنس اور دلی خلوص ہو گیا تھا اور وہ انہیں کے گُن گاتے تھے ؎

صد شکر پہنچ فخر زماں تک تو ہوئی معراج مجھے ایسے مکاں تک تو ہوئی
پستی سے فلک نما پہ آیا اے داغ اُونچی مری تقدیر یہاں تک تو ہوئی

ہے لاکھ لاکھ شکر کہ اے داغ آج کل آرام سے گزرتی ہے شاہِ دکن کے پاس

کی مری قدر مثل شاہ دکن کسی نواب نے نہ راجہ نے

شاہ میرا قدرداں احباب میرے مہرباں یوں دکن میں جب ہو اے داغ جنت میں ہو

شہر حیدر آباد انہیں اتنا پسند تھا کہ ہمیشہ اس کی تعریف کرتے رہتے

تھے ۵

دِلّی میں پھول والونکی ہے ایک سیرِ داغ — بلدے[1] میں ہمنے دیکھ لی سارے جہاں کی سیر

یُونہی گر حسینوں کی آمد رہے گی — دکن رشک کشمیر و لاہور رہے گا

نرگس باغ کو بھی ہم نے نہ دیکھا بیمار — حیدر آباد کی کیا آب و ہوا اچھّی ہے

شیوۂ راستی ایسا ہے دکن میں اے داغ — بل نہیں رکھتے مُسلمان سے ہندو دل میں

شہر ہے گُلزار یوں خلق ہے گُلرنگ یُوں — جیسے چمن در چمن باغ میں پھُولے گلاب

بلدہ[2] کا اک اک مکاں امن میں دارالاماں — شہر کی اک اک گلی جادۂ راہ صواب

حیدرآباد ہے جنّت سے سوا دار الامن — کھا کے گندم نہ یہاں سے کبھی آدم نکلے

کھُل جائیں آنکھیں دیکھتے ہی اس چمن کے پھُول — رضواں کو ہم دکھائیں جو باغ دکن کے پھُول

داغ کی شاعری کا راز

دِلّی دربار کے موقع پر شاہی کیمپ میں بیخود دہلوی نے داغ سے مُلاقات کی تو داغ نے کہا "بیخود! ہماری طبیعت کُند ہوئی جاتی ہے، بیخود نے کہا اُستاد! کیا فرما رہے ہیں، آپ کی طبیعت اور کُند یہ تو خنجر بُراں ہے تیغ آبدار ہے اس کو زنگ اور کثافت سے کیا کام؟ بولے تو تو جانتا ہے حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں یہ ٹھہرا کیمپ کا معاملہ یہاں پریوں کے بھی پر جلتے ہیں،

داغ کا یہ بیان ممکن ہے کہ لوگوں کو مبالغہ معلوم ہو مگر یہ بالکل حقیقت

[1،2] ۵ حیدرآباد میں مستقر حیدرآباد یعنے اندرون شہر پناہ کو بلدہ کہتے ہیں ۱۲

ہے داغ کا یہی عالم تھا حسینوں کو دیکھنے اور شعر کہتے تھے تاوقتیکہ ان کے سامنے کوئی کافرادا نہ ہو اُن کی شاعری میں حرکت پیدا نہ ہوتی تھی چنانچہ اسی لئے انہوں نے طوائفوں اور رنڈیوں کو لگا رکھا تھا اور یہ سلسلہ مرتے تک قائم تھا،

مولوی عبدالرزاق (مولف البرامکہ) نے اپنے ایک مضمون میں شبلی کا مشاہدہ نقل کیا ہے، لکھتے ہیں،

"میرے محترم دوست علامہ شبلی نعمانی نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ میں حیدرآباد میں عید کے دن داغ سے ملنے گیا، شاعرانہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ملاقات کے کمرے میں یکایک ایک پانزدہ سالہ نازنین آگئی جو قیمتی لباس اور مرصع زیورات سے جنت الفردوس کی حور معلوم ہوتی تھی وہ اس طرح بے محابانہ آئی کہ دوپٹہ کاندھے سے سرک گیا جس کا مقیاس الشباب پر بھی اثر پڑ رہا تھا اور اس پر ایسی بدحواسی چھائی کہ نقش دیوار بن کر رہ گئی، داغ بھی شرما گئے اور بولے "کم بختو! ذرا دیکھ تو لیا کرو کہ میرے پاس کوئی مولوی بھی بیٹھا ہوا ہے،" یہ سنتے ہی پھر ایک برق چمکی اور پردے میں غائب ہوگئی قدآدم آئینہ لگا ہوا تھا جس میں اس شوخ کا عکس پڑا اور داغ نے انفعالی حالت پر ایک شعر تصنیف کر دیا، افسوس ہے کہ وہ شعر میں بھول گیا ہوں ابو نواس کے ایک شعر سے ملتا جلتا تھا۔" (یادایام ص۲۶۱)

شبلی کی اس روایت کو نقل کر کے خود عبدالرزاق نے لکھا ہے،

"اس روایت سے ظاہر ہے کہ اُن (داغ) کے کلام میں شوخی

اور عشق و محبت کی چاشنی اس قسم کے لوازمات سے پیدا ہوئی تھی، داغ نے اپنے خلوت کدے کو جو پرستان بنا رکھا تھا یہ دلتمندی کا کرشمہ تھا غریب شعراء کو یہ سامان کہاں میسر ہو سکتا ہے، اس واقعہ کے بعد یہ بھی سن لیجئے کہ مولانا شبلی نے جو منظر عید کے دن دیکھا تھا داغ نے بچپن سے قلعہ معلی کی تباہی تک ایسے ہی ماحول میں پرورش پائی تھی اور یہی ان کی عاشقانہ شاعری کا راز تھا،

درحصل داغ ایک مصور تھے جو ہر ادا کی تصویر بر محل کھینچ لیتے تھے یہ بات دوسرے شاعروں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے"

(یادِ ایام ط ۲۶۱-۲۶۲)

مولوی عبدالرزاق نہ تو شاعر تھے اور نہ ماہر نفسیات مگر انہوں نے بات بڑی پتے کی کہی ہے، داغ کی شاعری کا یہی راز تھا، ان کی اس خصوصیت سے ان کے تمام شاگرد واقف تھے، یہی وجہ تھی کہ ۱۹۰۲ء میں نوح ناروی ان سے ملنے کے لئے دوسری بار حیدر آباد آئے تو ان کے لئے ایک تحفہ لیتے آئے یہ تحفہ کیا تھا؟ ایک نوخیز رنڈی کی تصویر تھی، یہ تصویر نذر کی تو داغ باغ باغ ہو گئے فوراً اسے ایک خط لکھوایا اور بڑے اہتمام سے بھجوایا اور اس رنڈی سے سلسلہ مراسلت شروع کر لیا مگر اسے حیدر آباد نہ بلا سکے کیونکہ حجاب حائل تھی،

کبرا نامی حیدر آباد کی ایک خانگی خورشید عالم کے پاس آتی جاتی تھی داغ اس پر بھی فدا تھے وہ بھی بڑی ہی چلتی ہوئی تھی تعلقات تھے خورشید عالم سے اور ریجھ رہی تھی داغ کو، بہرحال داغ ایک نہ ایک کو

ہمیشہ لگائے رکھتے تھے،

کبرا اور حجاب کی تصویریں مَیں نے دیکھی ہیں دونوں بڑی ہی خوبصورت تھیں، اختر جان کو بھی دیکھا ہے وُہ بھی بڑے ٹھسّے کی عورت تھی اور پُرانی رولس رائس کی طرح باوقار، حقیقت یہ ہے کہ داغ کی عاشق مزاجی ہی ان کی شاعری تھی ۰

داغ کی اصلاح کا طریقہ

داغ سب سے زیادہ دلچسپی شاہی غزل میں لیا کرتے تھے اور لینا بھی چاہئے تھا کیونکہ اسی کی وجہ سے ان کا سب ٹھاٹھ تھا، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ داغ غزلیں کہہ کر حضور میں بھجوا دیتے تھے جنہیں پسند کر کے حضور اپنے نام سے شہرت دیا کرتے تھے یہ بالکل غلط ہے، حضور غفران مکان شاعر تھے اور داغ کے حیدر آباد آنے کے پہلے سے شعر کہتے تھے، سرور الملک نے کارنامۂ سروری میں حضور کی شعری دلچسپی اور مشغلۂ شاعری کا ذکر کیا ہے، میرا خاندان بھی خانوادۂ آصف جاہی کا متوسل رہا ہے اِس لئے مَیں ذاتی طور پر واقف ہوں اور مَیں نے پُوری تحقیق کی ہے جس کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضور غفران مکان شاعر تھے اور خود شعر کہا کرتے تھے،

والد مرحوم نے ایک واقعہ سُنایا تھا کہ ایک دفعہ داغ بیمار تھے اور لیٹے ہوئے تھے کہ چوبدار آیا "سرکاری لفافہ" لے کر داغ نے کمرے کا دروازہ بند کرا دیا، لفافہ کھول کر سرکار کی غزل نکالی اور والد کو دے کر

کہا کہ ایک تختہ کاغذ کا لے کر اسے بیچ سے موڑ کر ایک طرف نقل کر دو چنانچہ والد نے ہر ایک غزل علیحدہ علیحدہ کاغذ پر نقل کر دی، داغ نے غزل پڑھوا کر سُنی اور اُسی نقل شدہ کاغذ پر اصلاح لکھوا دی اور پھر اس اصلاح کو اپنے قلم سے دُوسرے کاغذ پر لکھا اور زبان کی غلطیاں اور محاوروں کا استعمال جہاں جہاں ہُوا تھا اُن کی تشریح الگ لکھوا دی اور ان کاغذوں کو پھر لفافہ میں رکھ کر لفافہ پر مُہر کر کے بھجوا دی،

والد فرماتے تھے کہ اس لفافے میں تین غزلیں اور دس بارہ متفرق شعر تھے جنہیں داغ نے اصلاح دے کر واپس کیا، یہ واقعہ میں نے بچپن میں سُنا تھا، اس کے ایک مدّت کے بعد نواب میر حسن علی خاں امیر سے میں نے حضوری کلام کی اصلاح کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بھی ایسے ہی دو واقعے سُنائے، پھر سائل دہلوی کے قیام حیدر آباد کے زمانے میں اُن سے بھی دریافت کیا تو انہوں نے بھی دو واقعے ایسے ہی سُنائے اور حضور کے وہ تین شعر بھی سُنائے تھے جن کی اصلاح ہوئی تھی شاید ان تینوں کے علاوہ کسی شاگرد کو حضور کے کلام کی اصلاح دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا ورنہ اور حاضر باشوں اور بے تکلّف شاگردوں سے بھی میں نے دریافت کیا اور بعض لوگوں نے بھی استفسارات کئے مگر کسی نے بھی کوئی تفصیل نہیں بتائی،

حضور غفران مکان کا کلام موجود ہے ان کا رنگ ہی جدا تھا، داغ کا رنگ بالکل الگ تھا، داغ کی اصلاح کا طریقہ یہ تھا کہ صرف زبان اور محاورے کی غلطیاں درست کر دیتے اور کوئی عروضی یا فنّی سقم ہو تو دُور کر دیتے تھے، تخیّل کو وُہ بدلتے نہ تھے اسی لئے حضور کا اپنا رنگ نمایاں رہتا تھا خوش نصیبی سے نواب حسن علی خاں امیر کے ذخیرے میں سے ایک غیر اصلاح شدہ غزل

حضور کی مل گئی جو نقل کی جاتی ہے اس میں حضور کا اپنا رنگ نکھرا ہوا ہے چونکہ اِس پر داغ کی اصلاح نہیں ہوئی ہے اس لئے ایک خاص چیز ہے اس کے لئے میں برادر عزیزم میر یاسین علی خاں کا ممنون ہوں ؎

میں شکوۂ بیداد نہ زنہار کروں گا — اللہ کے آگے بھی تجھے پیار کروں گا
وہ آئے عیادت کو مری سب یہ کہہ کر — میں اور بھی بیمار کو بیمار کروں گا
کترا کے چلے مجھ سے عبث یہ بھی نہ جانا — کیا چھیڑ کی باتیں سر بازار کروں گا
اے نامہ بر آئینگے اگر وہ مرے گھر میں — جو عیش کا سامان ہے تیار کروں گا
وہ ہونگے بڑے لطف سے جب انجمن آرا — جام مئے گلرنگ سے سرشار کروں گا
وہ نشہ کی حالت میں جب آرام کرینگے — چپ بیٹھا ہوا دور سے دیدار کرونگا
کمبخت نہ مانے گا اگر ولولۂ شوق — میں پاؤں دبا کر انہیں ہشیار کروں گا
بے وجہ جو روٹھینگے مناؤنگا نہیں میں — مجھ سے جو خفا ہونگے تو میں پیار کرونگا
گالی ہو کہ جھڑکی ہو سنوں گا اسے خاموش — سن سن کے بہت ضبط بھی ناچار کرونگا
جو شرط وہ چاہینگے کرونگا اسے منظور — جو چیز وہ مانگیں گے نہ انکار کروں گا
منت سے خوشامد سے اطاعت سے ادب سے — جو بات ہے دل میں اسے اظہار کروں گا
اِس پر بھی جو وہ وصل سے انکار کریں گے — آصف ہوں تو پھر بات نہ زنہار کرونگا

نجو چچا (میر نجابت علی مرحوم) حضور غفران مکان کے وہ فی البدیہہ شعر بھی سنایا کرتے تھے جو حضور پتنگوں پر لکھ کر اڑایا کرتے تھے جن کے متعلق بعض مزیدار قصے بھی مشہور رہیں مگر بدنصیبی سے یہ شعر مجھے یاد نہ رہ سکے،

بہرحال میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ حضور کے شعر واقعی ان کے اپنے ہوتے تھے کسی اور کے نہیں اور داغ کی اصلاح ان پر ایسی ہی ہوتی تھی جیسی دوسرے شاگردوں کے کلام پر ہوا کرتی تھی، افسوس ہے کہ

حضور کا کلام شائع نہ ہوسکا ورنہ ہر دیکھنے والا محسوس کر لیتا کہ حضور کا کلام داغ سے کتنا مختلف تھا حضور کی سینکڑوں غزلیں گلدستہ پیام محبوب (اجرائی ۱۳۱۵ھ) مسدودی ۱۳۲۲ھ) گلدستہ دبدبۂ آصفی (اجرائی ۱۳۱۵ھ) گلدستۂ محبوب الکلام (۱۳۱۶ھ) گلدستہ نسیم دکن (۱۳۱۹ھ) وغیرہ میں طبع ہوئی ہیں اور منتخب غزلوں، سلاموں اور رباعیوں کے مختصر مجموعے بھی بعض لوگوں نے شائع کئے ہیں جو اب نایاب ہیں مگر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں،

داغ کی ایک اصلاح حضور کے شعر پر مل سکی جو نقل کی جاتی ہے حضور کا شعر تھا ؎

چہرے سے ان کے رنگ جو ٹپکا عتاب کا　　　کیا ہو چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

داغ نے اصلاح دی ہے ؎

چھپتا نہیں چھپائے سے چہرہ عتاب کا　　　ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

داغ کی سوانح عمریوں اور دوسری کتابوں اور بعض مضمونوں میں مختلف شاگردوں کے کلام پر دی ہوئی اصلاحیں بہت شائع ہوئی ہیں، چونکہ یہ سب مطبوعہ ہیں اس لئے میں انہیں پیش کرنا نہیں چاہتا، والد مرحوم اپنی غزلیں ایک بیاض میں لکھ کر داغ کے پاس لے جایا کرتے تھے اور داغ کو سنانے کے بعد اصلاح اسی بیاض پر بنا لیتے تھے، اس بیاض سے چند اصلاحیں نقل کرتا ہوں،

والد مرحوم نے ایک نظم شادی ردیف رکھ کر کہی تھی غالباً یہ نظم نواب مظفر جنگ کی شادی میں کہی گئی تھی، اس پر داغ کی اصلاح ہے ایک شعر خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہے، اصل شعر تھا ؎

براتی سب خوشی سے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں　　یقیں ہے بن گئی ہے آج کشتِ زعفراں شادی

شعر سن کر داغ نے کہا مصرع ثانی میں یقین کھٹک رہا ہے اسے بدل ڈالو، والد نے غور کیا مگر کوئی دوسرا لفظ اُس وقت ذہن میں نہیں آیا مجبوراً عرض کیا اُستاد! آپ ہی کوئی لفظ سرفراز فرمائیں، داغ نے کہا کہ گویا بنا دو ع

کہ گویا بن گئی ہے آج کشتِ زعفراں شادی

دیکھئے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا، اب شعر پڑھئے تو لطف آتا ہے ؎

براتی سب خوشی سے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں　　کہ گویا بن گئی ہے آج کشتِ زعفراں شادی

داغ کی ایک غزل پر والد مرحوم نے خمسہ کہا ہے اس پر جو اصلاح ہوئی ہے بجنسہٖ نقل کرتا ہوں ؎

دل تھامے ہوئے بہت خستہ جگر دیکھ رہے ہیں　　بے چین ہیں با دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں

یہ سب ہی محبت کا اثر دیکھ رہے ہیں　　سب لوگ جدھر ہیں وہ اُدھر دیکھ رہے ہیں

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

تو دیکھ نہ سکتی تھی اسے خوف سے صلا　　جی بھر کے مزے لوٹ کہ موقع ہے یہ اچھا

بے پردہ وہ بت سامنے ہے شکر ہے اس کا　　اک عمر کے بعد آیا ہے موقع بہت اچھا

دشمن سے مخاطب ہیں اُدھر دھیان ہے ان کا

ہاں اے دلِ مشتاق کدھر دھیان ہے تیرا　　اب اے نگہ شوق نہ رہ جائے تمنا

اس وقت اِدھر سے وہ اُدھر دیکھ رہے ہیں

کیا وجہ ہے کیوں لوگ کھڑے ہیں یہ اکٹھے

کیا بات ہے سب لوگ کھڑے کیوں ہیں اکٹھے　　یہ تذکرے کس کے ہیں یہاں کس کے ہیں چرچے

اے جان نکل چند قدم بڑھ یہ

اے دل تو بھی اب جا کے ذرا اسکی خبر لے　　آمد ہے کسی کی کہ گیا کوئی اِدھر سے

کیوں سب طرف راہ گزر دیکھ رہے ہیں

سینے پہ وہ زانو مرے اُس ترک کے بیٹھا
خنجر بھی بہت تیز ہے اور ہاتھ ہے ہلکا

ہے چار طرف خلق خُدا جمع ہوئے

اک حشر ہے ہے چاروں طرف خلق کا میلا
کچھ دیکھ رہے ہیں دلِ بسمل کا تڑپنا

کچھ غور سے قاتل کا ہنر دیکھ رہے ہیں

پر وہ انہیں مطلق اُسے ہے انہی پہ صورت
مصیبت پہ مصیبت

ٹالے سے بھی ٹلتی نہیں ہے ایسی مصیبت
تکلیف پہ تکلیف ہے زحمت پہ ہے زحمت

بھڑکا یا کسی نے جو نہیں رحم وہ

کیا خلق سے جاتی ہی رہی چشم مروت
پہلے تو سُنا کرتے تھے عاشق کی حقیقت

اب آنکھ سے وہ آٹھ پہر دیکھ رہے ہیں

چھوڑیں نہ کریں عشق کو کم

چھوڑیں نہ کبھی عشق صنم حضرت واعظ
جب تک تن خاکی میں ہے دم حضرت واعظ

کیوں جائیں سوئے دیر نہ

مجبور ہیں بس اس میں تو ہم حضرت واعظ
کیوں کفر ہے دیدار صنم حضرت واعظ

اللہ دکھاتا ہے بشر دیکھ رہے ہیں

نہایت ہی

ظاہر میں بہت یوں تو نظر آتے ہیں بھولے
لیکن بڑے چالاک قیامت کے ہیں پکے

چلتے ہوئے پرزے ہیں غضب کے ہیں نقرے

قاصد نے لفافہ دیا خط ہاتھ سے کھولے
خط غیر کا پڑھتے تھے جو ٹوکا تو یہ بولے

اخبار کا پرچہ ہے خبر دیکھ رہے ہیں

دلشاد ہیں خوش خوش ہیں مزے لیتے ہیں بیٹھے

کاری جو مرے سینے پہ ہیں وار لگائے — زخموں پہ وہ مرہم بھی لگانے نہیں دیتے

اندیشہ نظر ہونے کا ہے ساتھ ہی اس کے

اُف سنگ دل اللہ بنے بیٹھے ہیں کیسے — پڑھ پڑھ کے وہ دم کرتے ہیں کچھ ہاتھ پر اپنے

ہنس ہنس کے مرے زخم جگر دیکھ رہے ہیں

چیز ایک کی جائے تو یہ ہے قاعدہ اس کا — ہو دوسرا ہشیار کہ کچھ جائے نہ میرا

لیکن کبھی یہ وہم سنا اور

لیکن یہ تماشا تو کبھی ہم نے نہ دیکھا — میرا دل گم گشتہ جو ڈھونڈھا نہیں ملتا

وہ اپنا دہن اپنی کمر دیکھ رہے ہیں

ہر روز نئی ہوتی ہے اب ہم پہ مصیبت — ہر رات نئے ڈھنگ سے دیتے ہیں اذیت

زحمت

ہر لحظہ مصیبت ہے تو ہر آں ہے آفت — ہر چند کہ ہر روز کی رنجش ہے قیامت

ہم کوئی دن اس کو بھی مگر دیکھ رہے ہیں

ہو ہو

مشکل کبھی آساں کبھی آسان ہے مشکل — سیراب زمیں دور کی ہے خشک ہے ساحل

رہے ہو

رنجیدہ کو رنج اور ہے خوش دل اسے ہے خوش دل — نیرنگ ہے اک ایک ترا دید کے قابل

ہم اے فلک شعبدہ گر دیکھ رہے ہیں

اُلفت میں حسینوں کی نہیں فائدہ اصلا — رنج و غم و حسرت کے سوا کچھ بھی نہ پایا

اپنوں کی شکایت ہے نہ اغیار کا شکوا — اب تک تو جو قسمت نے دکھایا وہی دیکھا

آئندہ ہو کیا نفع و ضرر دیکھ رہے ہیں

دیدار دکھانا ہے تو حجت ہے یہ کیسی — کیوں رد و قدح ہوتی ہے کیوں بحث ہے اتنی
حیراں ہو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی — تکرار تجلی نے ترے جلوے میں کیوں کی
حیرت زدہ سب اہلِ نظر دیکھ رہے ہیں

ہوسِ زیست کی

جینے کی ہوا امید اگر دیکھئے مجھ کو — لیجئے نہ خبر آپ مگر دیکھئے مجھ کو
کیا سوئے تجلی ہے نظر دیکھئے مجھ کو — میں داغ ہوں مرتا ہوں ادھر دیکھئے مجھ کو
منہ پھیر کے یہ آپ کدھر دیکھ رہے ہیں

اب چند متفرق اصلاحیں نقل کرتا ہوں ؎

پیٹ کے ہلکے ہو تم خلق میں

راز دل میں نہیں کہتا نہیں کہتا ہرگز — آپ منہ پھٹ ہیں مرے راز کا چرچا ہوگا

میری مرقد پہ

فاتحہ پڑھنے کو آئینگے پری رو لاکھوں — قبر پر میری بڑی دھوم کا میلا ہوگا

نام خدا جوان ہوئے برق بن گئے

طفلی تری غضب کی تھی یہ تو شباب ہے — اب بجلیاں گرائے گا عالم شباب کا

جس کوچے میں ذلیل ہوا پھر وہیں گیا — یہ حال ہے مرے

جس جا ہوا ذلیل وہیں جا رہا ہے پھر گئے — دیکھو تو حال اس دل خانہ خراب کا

تجھے

وہ اٹھ گیا جو بزم سے اندھیر چھا گیا — جب تک وہ سامنے تھا تو آنکھوں میں نور تھا

جب تک کسی حسیں سے تعلق رہا ہمیں

کیا کیا نہ چوٹ کھائے ہیں الفت میں آپ کی — سنگِ ستم سے شیشۂ دل چور چور تھا

والد مرحوم داغ کی ایک اصلاح سنایا کرتے تھے معلوم نہیں شعر کس کا ہے مگر

اصلاح بڑی نفیس ہے ؎

بھبوکا رنگ ہے ابرو کشیدہ آنکھ کالی ہے
یہ بچپن ہے جوانی میں قیامت ہونے والی ہے

داغ نے مصرع ثانی کو یوں بدلا ہے،

بھبوکا رنگ ہے ابرو کشیدہ آنکھ کالی ہے
جواں ہو کر مرے قاتل نے کیا صورت نکالی ہے

داغ غزل کے شاعر تھے وہ تغزل سے ہٹ کر شعر کہنا وعظ سمجھتے تھے چنانچہ احسن مارہروی نے غزل بھجوائی تو دوسرے اشعار پر تو داغ نے اصلاح دی مگر اس شعر پہ نوٹ لکھا "آپ غزل کہہ رہے ہیں یا وعظ"

خدا پرسش کریگا حشر میں ساری خدائی سے
بھلائی کی بھلائی سے برائی کی برائی سے

مگر داغ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ غزل میں الحاد و دہریت کے مضامین باندھے جائیں چنانچہ نوح کے اس شعر ؎

سب خدا جانے کیا سمجھتے ہیں
ہم تو بت کو خدا سمجھتے ہیں

یہ نوٹ لکھا "دیکھو تم ایک شعر میں کافر ہوگئے، مرتد ہوگئے، مشرک ہوگئے،" حیرت ہے کہ داغ جیسے غزل گو نے اس شعر کو الحاد و دہریت پر محمول کیا کاش مومن زندہ ہوتے! وہ اس شعر کی داد دے سکتے تھے ۔

داغ کی نثر نویسی

داغ کو نثر نویسی کا شوق نہ تھا ان کے خطوط بھی بہت ہی کم ان کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں وہ زیادہ تر کہہ کر دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے انہیں بہت ہی کم لکھنے کا اتفاق ہوتا تھا اس لئے ان کے خطوط ان کی نثر نگاری کے

نمونے نہیں کہے جا سکتے، چند تقریظیں بھی انہوں نے لکھی ہیں، ایک تقریظ کسی مولوی صاحب کی انتخاب گلستاں پر لکھی تھی جو بمشکل ڈیڑھ صفحہ کی ہوگی یہ میری نظر سے گزر چکی ہے اور ایک آدھ تقریظ بھی ایک آدھ صفحہ کی کسی اور اسی شاگرد کے دیوان پر لکھی تھی جو دیوان کے ساتھ طبع ہو چکی ہے مگر اب مجھے نہ تو دیوان کا نام یاد ہے اور نہ شاعر کا، تقریباً چالیس سال ہوئے یہ تقریظ میں نے پڑھی ہے ان دو تقریظوں کے علاوہ تیسری تقریظ جو داغ نے لکھی یا لکھوائی ہے وہ ظفر علی خاں کی کتاب "پرشیا" پر ہے اس کے متعلق یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ داغ نے لکھی ہے یا لکھوائی ہے کیونکہ داغ کے سب سے معتبر سوانح نگار نے ایک جگہ لکھنا لکھا ہے اور ایک جگہ لکھوانا، چنانچہ ۳ فروری ۱۹۰۲ء کے روزنامچے میں احسن مارہروی نے لکھا ہے

"آج ظفر علی خاں صاحب جنہوں نے لارڈ کرزن کی کتاب پرشیا کا اردو ترجمہ کیا ہے اسے لے کر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرزا صاحب سے مستدعی ہوئے کہ اس پر تقریظ لکھ دیجئے مرزا صاحب نے اوّل تو ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب ظفر علی خاں نے بہت اصرار کیا تو مجھے حکم ہوا کہ لکھو مرزا صاحب بولتے جاتے اور میں لکھتا جاتا تھا دو صفحے کی نہایت اعلیٰ تقریظ مرزا صاحب نے بلا تکلّف لکھوا دی اور دستخط کر کے وہ کاغذ ظفر علی خاں کے حوالہ کر دیا،" (بزم داغ ص۱۸۴-۱۸۵)

اسی تقریظ کو احسن مارہروی نے انشائے داغ میں نقل کر کے اس پر ایک نوٹ لکھا ہے،

"مولوی ظفر علی خاں صاحب جب کہ حیدر آباد میں مترجم ہوم سکریٹری کے

عہدے پر فائز تھے کئی مرتبہ راقم کی موجودگی میں کبھی مولانا شبلی کے ساتھ کبھی تنہا مرزا داغ کے پاس آئے اور شاگرد ہوئے اسی زمانے میں انہوں نے یہ خواہش کی کہ مرزا صاحب اپنے دست و قلم سے خیابان فارس کا ریویو لکھیں، ان کی خواہش کے مطابق مرزا صاحب نے اپنے ہاتھ سے تقریباً دو ۲ صفحوں پر یہ تبصرہ لکھا۔"

(انشائے داغ صـ ۸۵)

فرمائیے ایک ہی شخص جب ایک تقریظ کو روزنامچے میں داغ کی لکھوائی ہوئی اور اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی لکھے اور انشائے داغ میں داغ کی خود اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی لکھے تو کس بات کو صحیح مانا جائے،

احسن مارہروی داغ کے ایک سوانح نگار اور شاگرد اور داغ کو بہت قریب سے دیکھنے والے تھے اُن کی ایسی متضاد تحریروں سے بڑی حیرت ہوتی ہے، اِس قسم کی دروغ بافیوں کو دیکھ کر ان کے حوالے سے کوئی عبارت نقل کرتے ہوئے ڈر رہا ہوں مگر مجبوری یہ ہے کہ یہی معتبر مانے گئے ہیں۔

داغ کی بدیہہ گوئی

داغ پیدائشی شاعر تھے موزوں طبعی ان کی فطری تھی اسی لئے وہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے شعر کہتے رہتے تھے ان کی بدیہہ گوئی کے ہزاروں واقعات مشہور ہیں، بشیر خاں بشیر رامپوری بیان کرتے تھے کہ جب حجاب سے داغ کی دلچسپیاں عروج پر تھیں اور حجاب نے کلکتہ سے اپنی تصویر بھجوائی تو

داغ نے تصویر دیکھ کر یہ رُباعیاں فی البدیہہ کہیں ؎

ہر عیب سے خالی ہے تمہاری تصویر
دُنیا سے نرالی ہے تمہاری تصویر
کس شکل مصوّر سے یہ پُوری کھنچتی
دِل کھنچنے والی ہے تمہاری تصویر

کیا خُوب مصوّر نے اُتاری تصویر
دیکھی نہ سُنی ایسی تو پیاری تصویر
خاموش جو ہو جاتی ہے اس کے آگے
کیا داغ سے ڈرتی ہے تمہاری تصویر

مغرور رہے تجھ سے بھی جو بڑھ کر تصویر
رکھتی ہی نہیں پاؤں زمین پر تصویر
چھیڑوں جو ذرا ایں تو کہاں پاسِ حجاب
ہو جائے ابھی جامے سے باہر تصویر

گو لاکھ کرے ناز تمہاری تصویر
میری تو ہے دم ساز تمہاری تصویر
کہہ دیتی ہے سب بھید تمہارا مجھ سے
لو بن گئی غمساز تمہاری تصویر

اس شکل کا دُنیا میں نہیں کوئی نظیر
صُورت ہے طبیعت کی طرح شوخ و شریر
اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

تُم تو فلک حُسن پہ ہو ماہِ منیر
سایہ کی طرح ساتھ ہے داغ بگیر
خال لبِ گلفام ہے شاہد اس کا
بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

یہ رُباعیات آفتاب داغ میں چھپ چکی ہیں جو اتفاق سے

بشیر رامپوری[1] کے سامنے کہی گئی ہیں،

---

[1] بشیر خاں بشیر رامپوری جمال شاہ خاں کے فرزند اور محمد شاہ خاں کاوش کے بھائی تھے، ریاست رامپور ہی کے متوسّل تھے ابتداً نظام رامپوری سے مشورہ کرتے تھے پھر داغ سے مشورہ کرنے لگے ان پڑھ شاعر تھے الف با تک سے ناواقف تھے مگر قدرت نے موزوں طبع اور شاعر پیدا کیا تھا بڑے اچھے شعر کہتے تھے، داغ کے قیام رامپور تک روزانہ کے حاضر باش تھے، داغ حیدرآباد آگئے تو بشیر بھی آگئے اور داغ نے مہاراجہ بہادر کی سرکار میں نوکر رکھا دیا چونکہ بشیر کو پیراکی میں کمال تھا اس لئے داغ نے حضور غفران مکان سے بشیر کے متعلق عرض کیا اور حضور نے جو محلہ میں راگ مالا کے حوض میں بشیر کی پیراکی کے کمالات ملاحظہ فرمائے اور بشیر نے پانی میں تابزانو کھڑا رہ کر یہ شعر عرض کیا ؎

ٹھہرنے دے اگر یہ دیدۂ پُر آب پانی میں
بجا لاؤں میں آصف جاہ کو آداب پانی میں

تو حضور نے اُسی وقت پانچ ہزار روپیہ نقد سرفراز فرمایا،

پانچ ہزار روپیہ لے کر بشیر رامپور چلے گئے اور جب رقم ختم ہوگئی تو پھر حیدرآباد آرہے تینچ محلہ کی سڑک پر شاہ جھاڑ ومستان کے تکئے کے پاس سابق جدہ بیگم رمغلپورہ کی کمان سے متصل ایک مکان لے کر رہنے لگے اور یہیں چھیاسٹھ سال کے سن میں ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا، بیوی بچّہ کوئی نہ تھا تنہا رہتے تھے، مرغ بازی اور بٹیر بازی کا شوق تھا، پُرخور اور خوش خور آدمی تھے، سپاہیانہ وضع کے بانکے تھے،

روزانہ صبح صبح اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر سماور رکھ کر بیٹھ جاتے آنے جانے والے ملاقاتیوں کو کٹ گلاس کی فنجانوں میں سادی چائے پلاتے

اور بیاض میں شعر بھی لکھوا لیتے، رات میں غزل کہتے (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۷۴)

مشہور مصوّر راوی ورما نے ایک ہندی صنمیاتی رنگین تصویر بنائی تھی جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳) تو کمر بند میں ایک ایک شعر کی ایک ایک گرہ لگا لیتے جب لکھوانے لگتے تو ایک ایک گرہ کھول کر ایک ایک شعر لکھوا دیتے اسطرح ایک ضخیم بیاض مکمل کر لی تھی، مشہور ہے کہ انہیں دو روپیہ کا دستِ غیب تھا، تیس روپیہ تنخواہ ماہوار اتِ خاص سے تھی تیس ہی روپئے ماہوار مہاراجہ بہادر سرفراز فرماتے تھے اُن دنوں ساٹھ روپیہ ماہوار ایک تنہا آدمی کو انڈے پراٹھے کھانے کیلئے کافی تھے اس لئے شاید یار لوگوں نے دست غیب کی شہرت دیدی اللہ بہتر جانتا ہے کہ واقعہ کیا ہے، مینے بشیر کو دیکھا ہے بارہا ان کے چبوترے پر بیٹھ کر چائے بھی پی ہے، غریب خانہ پر بھی بشیر اکثر آیا کرتے تھے کیونکہ والد مرحوم سے بھی مراسم تھے، کلام کا نمونہ یہ ہے،

اِس بُت کا عشق میری ہی قسمت میں تھا اگر | پتّھر کا دل بھی کیوں نہ دیا اے خدا مجھے
آج کیا حال ہے ہم سے تو چھپاؤ نہ بشیر | دونوں ہاتوں سے سنبھالے ہوئے کیوں دل آئے
ان کا وہ ناز سے کہنا کہ عبث رو رو کر | پانی کرنا تمہیں خوب اپنا لہو آتا ہے
تنہا لحد میں چھوڑ گئے آج وہ رفیق | ہوتے نہ تھے جو مجھ سے گھڑی بھر جدا کبھی
بُتوں کو بے وفا تو نے بنایا کیا وفا کم تھی | کمی کس کی تھی کیا شئے تیرے گھر میں اے خدا کم تھی
نگاہِ غور سے دیکھا تو یہ دونوں برابر تھیں | نہ فرقت تھی قضا سے کم نہ فرقت سے قضا کم تھی
بنایا آسماں اک اور بھی بہرِ ستم تو نے | الٰہی تیرے بندوں پر بُتوں کی کیا جفا کم تھی
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نے حال | مُشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا
پیشِ حق جائے گا وہ بُتِ کافر جس دم | اِک سڑک بن گئی ہنگامۂ محشر پھٹ کر
پانی پیا تھا نقشِ قدم پر اُتار کر | کہتے ہیں لوگ مجھ کو بلا تشنۂ نقشِ پا
خاک اُڑ رہی تھی اس دلِ خانہ خراب میں | حسرت نے آ کے اپنی بھی مٹی پلید کی
جھوم جاتے ہیں ہزاروں دیکھ کر اے مستِ ناز | ایک تیری چشمِ میگوں لاکھ ساغر کا جواب

۱۲×۱۰ اسائز پر جرمنی سے رنگین چھپی تھی، اور داغ کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں عام ہو چکی تھی، اِس تصویر میں ایک عاشق بے تاب کو پیش کیا گیا تھا جو ایک ہاتھ سے اپنی محبوبہ کا دامن تھامے ہوئے دُوسرے ہاتھ سے اپنا دل سنبھال رہا تھا، کسی نے یہ تصویر پیش کی اور فرمائش کی کہ اس کیفیت کو نظم کر دیجئے تو داغ نے فی البدیہہ کہا ؎

دِل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے ہاتھ مرے دونوں نِکلے کام کے

ایک دفعہ داغ کی چہیتی اختر جان خفا ہو کر چلی گئی۔ داغ نے اپنے مُلازم خاص جمال صاحب کو بھیجا کہ اسے سمجھا منا کر لائے مگر وُہ نہ آئی اور جمال صاحب نے واپس آ کر کہا حضور وہ تو کہتی ہے "میری بَلا بھی نہ آئے گی" یہ سُنتے ہی داغ نے کہا ؎

یہ کیا کہا کہ "میری بَلا بھی نہ آئے گی"؟ کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی!

ابوالحمید آزاد ایک دفعہ داغ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے پانی مانگا تو ایک نوجوان لڑکی اندر سے پانی لائی جُوں ہی اس نے جُھک کر پانی پیش کیا ڈوپٹہ سینے سے ڈھلک گیا اور اس نے دونوں ہاتوں سے اپنا سینہ چُھپا لیا داغ نے فوراً کہا ؎

بادِ صبا نے بھی نہ کیا اسکو بے حجاب سینے پہ ہاتھ آ گئے جب شانہ کُھل گیا

ایک روز داغ کی بیوی نے خوب آڑے ہاتوں لیا کہ اب تک تو آپ رنڈیوں کا گانا ہی سُنا کرتے تھے مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے تعلقات بھی پیدا کر لئے ہیں، داغ نے انکار کیا تو بیوی نے کہا "اور جو چوری پکڑ کر بتا دی" یہ سُن کر داغ اندر سے ہنستے ہوئے باہر آنے لگے اور بے ساختہ یہ شعر موزوں ہو گیا ؎

تُم کو ہے وصل غیر سے انکار! اور جو ہم نے آ کے دیکھ لیا؟

کسی شاگرد نے اِس طرح ہنستے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھ کر حیرت ظاہر کی تو داغ نے کہا مضمون تمہاری اُستانی کا ہے جسے میں نے نظم کر دیا ہے پھر سارا قصہ سُنایا،

رمضان میں ایک صاحب داغ کی مُلاقات کے لئے داغ بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے تھے کہ خدمتگار نے اطلاع دی خاصا تیار ہے، اُن صاحب نے حیرت سے داغ کی طرف دیکھا مطلب یہ تھا رمضان میں دوپہر کا کھانا کیسا؟ داغ نے فی البدیہہ کہا ؎

گرمی میں جو آیا رمضاں اب کی بار اے داغ گناہ اپنے ہونگے فی النار

دو روزہ کا ہر روزہ ملے اس موسم میں روزہ بھی ہوا ایک دن میں دوبار افطار

ایک مشاعرے کی طرح تھی ع

ہم کو رونا ہے خندۂ گُل کا

مشاعرہ قریب تھا داغ بیمار تھے منضج مُسہل چل رہے تھے شاگردوں نے اصرار کیا اُستاد غزل کہہ دیجئے بغیر آپ کی غزل کے مشاعرے میں لُطف نہ آئیگا جب بہتوں نے مجبور کیا تو داغ نے کہا لکھو اور لکھوایا ؎

ہم کو کیا لُطف ساغر مل کا کبھی کھچڑی ملی کبھی پُھلکا

سب شاگرد ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور داغ نے غزل کہنے کی جھنجھٹ سے نجات پالی،

نوح ناروی نے ایک دفعہ حیدرآباد آتے ہوئے الہ آباد کی ایک طوائف کی تصویر لا کر پیش کی، تصویر دیکھتے ہی داغ نے یہ رُباعی کہی اور ایک خط میں اِس طوائف کو لکھوا دی اور خط ایک رنگین پھولدار لفافے میں

بند کر کے اس لفافے پر یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر لکھوایا ؎

کیا بات ہے کیا گات ہے اللہ رے شریر — سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھُلا دِل کا حال — کھنچوائی ہے کیا سینہ چھُپا کر تصویر

لفافہ کا شعر یہ تھا ؎

شوق کھُلنے نہ دیا عشق کا پردہ رکھا — اس لئے ہم نے لفافے میں لفافہ رکھا

پھر اِس لفافے کو ایک معمولی لفافے میں رکھ کر پوسٹ کرا دیا،

ایک دفعہ داغ کے مرنے کی خبر اُڑی حکیم قمرالدین تاج پوری نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ یہ خبر غلط ہے، انہوں نے خط کے ذریعہ اس کی اطلاع داغ کو دی تو داغ نے ان کے خط کا جواب لکھواتے ہوئے دو شعر فی البدیہہ کہہ کر لکھوائے ؎

عمر کے دِن گزرتے جاتے ہیں — جیتے جی ہم تو مرتے جاتے ہیں
روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں — زندگی کا کوئی حساب نہیں

داغ شکار گاہ نرسم پیٹھہ (ورنگل) میں حضور کے ہمرکاب تھے اور ان کی چہیتی اختر جان اپنے دوستوں کے ساتھ شراب اور بھنگ کا لطف اُٹھا رہی تھی، کسی نے اطلاع دی تو اُسے یہ شعر لکھ بھیجا ؎

مجرا نہیں شراب بھی ہے اور بھنگ بھی — یہ آجکل کمانے کے اچھے ہیں ڈھنگ بھی

داغ سادات کا بہت احترام کرتے تھے سید افتخار عالم مارہروی اور سید احسن مارہروی چند سال تک ان کی خدمت میں مسلسل رہے ہیں ایک روز نقرس اور وجع مفاصل کی تکلیف میں مُبتلا تھے پاؤں پر دواؤں کا لیپ چڑھا ہُوا تھا، پلنگ پر پڑے لوٹ رہے تھے ایک پٹّی جو ذرا سرک گئی تو افتخار عالم نے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر پٹّی درست کر دی یہ دیکھتے ہی داغ

لرز گئے آنکھیں بھر آئیں اور چیخنے لگے مَیں گنہگار ہوں میرے ناپاک پاؤں اس قابل نہیں کہ تم جیسے سیّد زادے اس پر ہاتھ رکھیں، لِللہ معاف کر دو آئندہ سے کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اِس طرح مُعافی مانگ کر پھر لیٹ گئے اور کراہتے ہوئے یہ دو مطلعے فی البدیہہ کہے ؂

مَیں اگر خاطی ہوں وُہ غفّار ہے حق تعالیٰ کی بڑی سرکار ہے
گرچہ بحرِ عشق اک ذخار ہے ڈُوبنے والے کا بیڑا پار ہے

اسی علالت کے زمانے میں پڑے کوٹ رہے تھے کہ حاجی ابراہیم خانساماں مزاج پُرسی کو آئے اور کیفیّت پُوچھی تو آہ سرد کھینچ کر کہا ؂

جو گزُرتی ہے ہم کہیں کس سے تنگ آئے ہیں دردِ نقرس سے

خانساماں نے باتوں میں لگالیا تو تکلیف کا احساس ذرا کم ہو گیا اور پُرانے قصّے بیان ہونے لگے پھر تو "اندازِ گُل افشانیٔ گفتار" ہی بدل گئے اور ایک قصّہ سُناتے ہوئے فی البدیہہ کہا ؂

صُبح کو وُہ زُلفِ مشکیں کی مہک اور وُہ بُو باس باسی ہار کی

یہ شعر عبدالصمد واصفی نے مجھے اس قصّے کے ساتھ یُوں ہی سُنایا تھا اور بزمِ داغ میں بھی اسی طرح نقل ہُوا ہے مگر یادگارِ داغ میں یُوں ہے ؂

صُبح کو وُہ زُلفِ مشکیں کی بہار اور وُہ بُو باس باسی ہار کی

افضل گنج میں ایک مسلمان ساہوکار داغ کے پڑوسی تھے وُہ دیوالیہ ہو گئے تو سُنتے ہی کہا ؂

سودے میں نقدِ دل کے دِیوالہ نکل گیا بیوپار وُہ کیا تھا کہ جس میں بچت نہ تھی

اس شعر کے متعلق داغ کے بعض شاگردوں کا بیان ہے کہ عبدالرزاق شاد کلکتہ والے نے دیوالہ پیٹا اور اس کی اطلاع داغ کو ملی تو یہ شعر کہا،

واقعہ چاہے کچھ ہی ہو فی البدیہہ ضرور کہا ہے،

ایک بار داغ کے انتقال کی خبر پھر اُڑی اور اخباروں میں بھی شائع ہوئی کسی نے اخبار پڑھ کر سنایا تو داغ نے سنتے ہی کہا ؎

الٰہی کیا غم فرقت میں ہم مرمر کے جیتے ہیں ۔۔۔ کہ دنیا میں تو کوئی مر کے پیدا ہو نہیں سکتا

۱۹۰۱ء میں حضور غفران مکان نے داغ سے استفسار فرمایا کہ تمہارے شاگردوں میں سب سے تیار شاگرد کون ہے؟ داغ نے یہ استفسار سب شاگردوں کو سنایا اور شاگرد خیالی پلاؤ پکانے لگے بلکہ سائل دہلوی نے تو یہ یقین کر لیا کہ "چچا جان میرا ہی نام حضور میں بھیجیں گے" دو تین روز کے بعد شاگردوں نے پوچھا آپ کس کا نام بھیجنے والے ہیں؟ تو داغ نے جواب دیا میں نے اسی وقت جواب لکھ بھیجا ہے کہ میرے شاگردوں میں سب سے زیادہ تیار اور سب سے اچھی غزل کہنے والا حضور سے بہتر کوئی نہیں، پھر کہا ممکن ہے کہ میں وہی جواب دیتا جو تم لوگ سوچ رہے ہو مگر ایسا جواب بادشاہوں کے مزاج کے خلاف ہوتا، میں نے قلعۂ معلٰی میں پرورش پائی ہے، دربار رامپور میں بڑھاپا آیا، دربار آصفی میں دس گیارہ سال سے ہوں، حضور نے میرا امتحان لیا ہے اور یہ امتحان بہت سخت تھا خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہا پھر فی البدیہہ کہا ؎

دیکھا ہے دیکھنے کی طرح اک جہان کو ۔۔۔ گزرا ہے اک زمانہ ہماری نگاہ سے

والد مرحوم (تجلی) مولوی منش بزرگ تھے بچپن ہی سے انہیں لہو و لعب سے نفرت اور اخلاقی اور مذہبی پابندی کی عادت تھی طوائفین سے ملنا جلنا تو بڑی بات ہے جس محفل میں وہ ہوتیں وہاں پھٹکنے کے روادار نہ تھے، چنانچہ باوجود داغ سے اتنی محبت ہونے کے وہ شام کے وقت داغ کے

پاس اس لئے نہیں جاتے تھے کہ وہاں رنڈیاں ہوتی تھیں، ان کی اِس کمزوری سے داغ واقف تھے، اتفاقاً داغ کو نقرس کا دورہ پڑا اور اس کے بعد ذرا آرام ہوا تو داغ نے حضور سے سرور نگر کے ایک سرکاری باغ میں چند روز رہنے کی اجازت لی اور وہاں جا کر ٹھہر گئے اور انہیں بھی خصوصیت کے ساتھ بُلوایا،

عبدالصمد واصفی فرماتے تھے کہ وہ وہاں موجود تھے کہ والد مرحوم پہنچے داغ اُس وقت دو رنڈیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے چہل قدمی یا گلگشتِ چمن کر رہے تھے والد کو دیکھتے ہی قریب بُلا لیا اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر اِن رنڈیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ایک اِس طرف ایک اُس طرف" پھر مسکراتے ہوئے کہا، لو تجلّی! غزل لکھو، والد نے جیب سے کاغذ اور پنسل نکال کر لکھنا شروع کیا اور داغ نے سب سے پہلے مقطع لکھوایا ؎

اترا رہے ہے داغ کیا ہنگامِ گلگشتِ چمن ۔۔۔ رنگین قبا گل پیرہن ایک اس طرف ایک اُس طرف

اس کے بعد اختر جان کی طرف دیکھتے ہوئے مطلع لکھوایا ؎

کافر وہ زُلف پُر شکن ایک اس طرف ایک اُس طرف،
پھر اس پہ چشم سحر فن ایک اِس طرف ایک اُس طرف

اس کے بعد چند اور شعر لکھوائے ہی تھے کہ چوبدار شاہی لفافہ لایا اور داغ سرکاری کلام کی اصلاح میں لگ گئے یہ غزل ادھوری رہی جسے شام میں داغ نے مکمّل کرایا،

عبدالصمد واصفی فرماتے تھے کہ اُستاد (داغ) نے مولوی صاحب (تجلی) کو دو تین روز تک روک لیا اور اختر جان کو آنکھ دیدی جو نہیں چھیڑتی رہی انتہا یہ کہ روزانہ اختر جان ان کے بازو بیٹھ کر کھانا کھاتی

تھی اِس طرح داغ نے اپنے شاگرد کی وحشت دُور کی،

حیدر آباد میں ایک دفعہ سُورت کے ایک مولوی صاحب داغ کے پاس آئے اور کہنے لگے اپنی چند غزلیں دیجئے میں عربی میں اُن کا ترجمہ نظم کروں گا چنانچہ چند غزلیں نقل کرا دی گئیں پھر انہوں نے غزل سُننے کی خواہش کی تو داغ نے غزل سُنانی شروع کی ؎

اس کی چتون نظر میں پھرتی ہے ۔۔۔ اِک چھُری سی جگر میں پھرتی ہے
نہ ملے گا وُہ جُستجو سے داغ ۔۔۔ خلق کِس دردِ سر میں پھرتی ہے

اتفاق سے اُس روز داغ کے مکان میں سفیدی پھیری جا رہی تھی، داغ کی نظر اس طرف پڑی تو فی البدیہہ یہ کہا ؎

آمد آمد ہے آج کِس کی داغ ۔۔۔ یہ سفیدی جو گھر میں پھرتی ہے

پھر دیوان منگوا کر مقطع کا مصرعِ اوّل اِس طرح بنا کر اُسے شعر کر دیا ؎

نہ ملے گا وُہ جُستجو سے کہیں ۔۔۔ خلق کِس دردِ سر میں پھرتی ہے

اور فی البدیہہ کہا ہُوا مقطع غزل میں شریک کرا دیا،

ایک روز حجاب کا خط کلکتہ سے آیا اُس نے لکھا تھا "مجھے بھُول جائیے"، اس کا جواب لکھواتے ہوئے داغ نے یہ شعر لکھوایا ؎

تُو بھُولنے کی چیز نہیں خُوب یاد رکھ ۔۔۔ نادان کِس طرح تجھے دِل سے بھُلائیں ہم

پھر اس شعر کو مقطع کر دیا اور بقیہ شعر کہہ کر غزل مکمّل کر لی،

حج کو جاتے ہوئے یہ شعر فی البدیہہ کہا ؎

دیر سے کعبے کو ڈرتے ہوئے ہم جاتے ہیں ۔۔۔ دیکھ لیتا ہے جو کوئی وہیں تھم جاتے ہیں

حج کے بعد کعبۃ اللہ ہی میں بیٹھ کر یہ غزل فی البدیہہ کہی ہے جس کا مطلع ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تُونے   دِل سے سب کچھ بُھلا دیا تُونے

رمضان کے دنوں میں افتخار عالم پاس بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ داغ نے حُقّہ پینا شروع کیا اور انہوں نے ذرا منہ بنایا، اس پر ہنس کر داغ نے فی البدیہہ کہا ؎

عالم جلتے ہیں میرے حُقّے سے بہت   لگتی ہے انہیں آگ دیکھے سے بہت
روزے کے عوض توڑتے ہیں دل میرا   لیتے ہیں گناہ دِل کے توڑے سے عبث

اور پھر اپنے روزہ نہ رکھنے کے عذر میں یہ رُباعی کہی ؎

وُہ ضُعف ہے دم سے نہیں نکلا جاتا   دُنیا سے بھی اب تو نہیں اُٹھا جاتا
گھر میں تو بہت طاق ہیں لیکن اے داغ   روزہ کہیں ہم سے نہیں رکھا جاتا

دسمبر ۱۹۰۱ء میں مدراس میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے تھے جن میں شریک ہو کر اکثر حضرات حیدر آباد پہنچے چنانچہ خان بہادر عبدالقادر اڈیٹر پنجاب آبزرور (بعد کو سر عبدالقادر) ڈاکٹر غلام جیلانی (بعد کو زبدۃ الحکماء) مولوی بشیرالدین اڈیٹر البشیر (بعد کو خان بہادر) اور مولوی محمود علی بھی حیدر آباد پہنچے جب یہ لوگ داغ سے ملنے کے لئے آئے تو داغ نے بڑی عمدگی سے ملاقات کی، حیدر آباد آنے کا سبب پُوچھا جب ان لوگوں نے کہا کہ صرف آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں تو بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے مَیں بُڈھا آدمی ہوں ایک ہی شخص کا بار احسان اُٹھانا مُشکل ہے چار چار آدمیوں کی مہربانی کا بوجھ کس طرح اُٹھا سکوں گا، میری گردن ہی ٹوٹ جائے گی پھر فی البدیہہ یہ قطعہ سُنایا ؎

مجھ کو مہ صیام میں ہے عید کی خوشی   ملنے کو میرے آئے ہیں اصحاب ذی وقار
یہ داغ کی دُعا ہے کہ چاہوں میرے حبیب   اپنی مُراد پائیں بحق چہار یار

ایک روز داغ تنہا تھے کوئی شاگرد یا دوست نہ تھا آپ نے اپنی پروردہ لڑکیوں امیری اور صاحب ہی سے ہنسی دلگی کی باتیں شروع کیں اتنے میں افتخار عالم جا پہنچے انہیں دیکھ کر لڑکیاں بھاگ گئیں اور داغ نے یہ شعر کہا ؎

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے | جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

داغ کے پاس ایک شیخ جی رہتے تھے جو بڑے نمازی اور پرہیزگار اور متقی تھے رنڈیوں کا آنا انہیں بڑا ناگوار تھا ایک روز ایک طوائف سلام کو آئی تو شیخ جی بہت خفا ہوئے اور داغ کو نصیحت کرنے لگے کہ اب آپ بڈھے ہو گئے ہیں ان چڑیلوں کا پیچھا چھوڑ دیجئے اپنی عاقبت خراب نہ کیجئے اس طرح دیر تک شیخ جی نصیحت کرتے رہے جب سنتے سنتے داغ تنگ آ گئے تو اکتا کر کہا ؎

کیا ہے ناک میں دم واعظوں نے کیا کہئے | غضب ہے دین کا دنیا میں نام لیتے ہیں

جب حجاب حیدرآباد آئی اور چند روز کے بعد داغ سے ان بن ہو گئی تو داغ دیوان خانہ (مردانہ) ہی میں زیادہ رہنے لگے، ایک دن حجاب نے داغ کو بلوایا تو داغ نے یہ شعر فی البدیہہ کہا اور ایک شاگرد سے لکھوا کر بھیجا ؎

در پردہ تم جلاؤ جلاؤں نہ میں چہ خوش | میرا بھی نام داغ ہے گر تم حجاب ہو

حکیم امتیاز حسین حیدرآباد کے مشہور طبیب اور افسر الاطبا تھے جن کے مراسم داغ سے بھی خاص تھے ان کے پاس کوئی تقریب تھی جس میں داغ بھی مدعو تھے چنانچہ دعوت میں مقررہ وقت پر داغ حکیم صاحب کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کسی مریض کو دیکھنے ابھی ابھی گئے ہیں اور اب واپس آتے ہی ہونگے مگر داغ بگھی سے نہ اترے بلکہ کاغذ منگوا کر اس پر یہ شعر لکھ کر دیدیا اور واپس ہو گئے ؎

بے بلائے ہوئے غیر آتے ہیں ڈٹ جاتے ہیں　　ہم بلائے ہوئے آکے پلٹ جاتے ہیں

داغ کو واپس ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ حکیم جی لوٹ آئے اور داغ کا شعر پڑھا تو پھڑک گئے اور اُسی وقت بگھی میں بیٹھ کر داغ کا تعاقب کیا اور راستہ ہی میں جا لیا اور سمجھا منا کر واپس لائے،

کہیں میرٹھ کی ایک رنڈی کا مجرا تھا داغ بھی مدعو تھے مجرا ختم ہونے کے بعد رنڈی نے ایک مصرع دیا کہ استاد اس پر غزل کہہ دیجئے تو چار مجرے آپ کو مفت سناؤں گی، داغ نے فی البدیہہ یہ غزل کہہ دی جس کا مقطع تھا ؎

مئی و معشوق سے توبہ کریگا داغ تو توبہ　　تری نیت تو اے مرد خدا کچھ اور کہتی ہے

داغ کے لطیفے

غالب کے بعد داغ ہی غیر معمولی زندہ دل شاعر ہوئے ہیں ان کی زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی نے انہیں مغموم یا متفکر نہیں دیکھا اور نہ وہ کبھی غصّے کے عالم میں پائے گئے ہمیشہ خوش مسرور اور مطمئن نظر آتے تھے، وہ لوگ جنہوں نے سترہ اٹھارہ سال تک داغ کو نزدیک سے دیکھا ہے بیان کرتے ہیں کہ کبھی داغ ناخوش اور غیر مطمئن نظر نہیں آئے، ہمیشہ ہنستے بولتے خوش دل اور خوش طبع نظر آتے تھے، یہی وجہ تھی جو انہوں نے پچھتر سال عمر پائی اور اچھی طرح زندگی بسر کی، یہی زندہ دلی ان کی چال ڈھال بات چیت نشست برخاست سب میں رچ گئی تھی اور وہ بات بات میں لطیفے پیدا

کرتے تھے، اُن کے ہزاروں لطائف لوگوں کی زبان پر ہیں جن میں سے چند نقل کرتا ہوں،

بے نظیر کے میلے میں داغ بیٹھے ہوئے کسی سے بات چیت کر رہے تھے کہ علی اصغر خاں جنرل مرحوم اُدھر سے گزرے اور سلام کیا مگر داغ اتنے مُنہمک تھے کہ سُنا ہی نہیں جب انہوں نے دوبارہ سلام کیا تو بھی سُنا نہیں اس پر انہوں نے پکار کر کہا "اوہو نواب مرزا تمہارا تو مزاج ہی نہیں ملتا"، یہ سُنتے ہی داغ نے عرض کیا حضور وہ ایسا تیسا نہ ملے مَیں تو آپ کا تابعدار ہوں،

ایک روز ایک ضعیف العمر بزرگ جو عربی لباس پہنے ہوئے تھے داغ کے پاس آئے اور بیٹھے ہوئے گاتے رہے، چند شاگرد بھی اُس وقت آگئے اور انہوں نے بھی گانا سُنا، جب یہ بزرگ چلے گئے تو شاگردوں نے پُوچھا اُستاد! یہ کون بزرگ تھے؟ داغ نے کہا" ایں! کیا تم اِن سے ناواقف ہو؟ انہوں نے کہا جی ہاں، ہم انہیں نہیں جانتے داغ کہنے لگے میاں! یہ جنّت کے قوال تھے،

ایک صاحب داغ سے ملنے کے لئے آئے اس وقت داغ نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے دیکھا اور واپس چلے گئے داغ نے نماز ختم کرنے کے بعد پُوچھا تو معلوم ہوا واپس چلے گئے، فوراً آدمی کو دوڑایا کہ بلالاؤ، جب وُہ آگئے تو پُوچھا کیوں حضرت آپ واپس کیوں ہو گئے؟ انہوں نے کہا آپ نماز پڑھ رہے تھے اِس لئے واپس ہو گیا داغ نے کہا حضرت! مَیں نماز ہی پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا؟

نواب کلب علی خاں بہادر کے دربار میں سانس کی تذکیر و تانیث کی بحث ہو رہی تھی لکھنؤ اور دلّی والے گرما گرم بحث کر رہے تھے کہ داغ پہنچے، لوگوں نے کہا داغ اس کا فیصلہ کریں گے کہ سانس مونث ہے یا

مذکّر، داغ نے کہا میرے نزدیک مونث کی سانس مونث اور مذکّر کا سانس مذکّر ہے، اِس فیصلے پر ہنسی خوشی بات ختم ہوگئی،

مظفّر حسین بارق مضافات علیگڑھ کے باشندے اور مدّت سے دکن میں تھے داغ کے شاگرد اور قلعہ گولکنڈہ کے مدرسہ کے مدرس تھے ہر جُمعرات کی رات کو داغ کے گھر آجاتے نئی غزلیں لکھ لیتے اپنی غزلیں سُنا کر اصلاح لیتے اور داغ ہی کے پاس رات گزارتے داغ سے قُربت اتنی پسند تھی کہ ان کے پلنگ کے پاس ہی سو جاتے اور رات میں داغ جاگتے تو بات چیت کرتے رہتے، ایک روز داغ کے شعر کہنے کے طریقے پر انہوں نے حیران ہوکر پُوچھا اُستاد آپ اِتنی آسانی سے اور جلد جلد کس طرح شعر کہہ لیتے ہیں ہم سے تو ایسا نہیں ہوسکتا، داغ نے پُوچھا آپ کس طرح شعر کہتے ہیں تو کہا، ہم تو وقت خاص میں پلنگ پر لیٹ کر حُقّہ پیتے ہوئے فکر سُخن کرتے ہیں کبھی کروٹ لی کبھی اُٹھے کبھی بیٹھے کبھی لیٹے تب کہیں ایک آدھ شعر نکلتا ہے، داغ نے ہنس کر کہا تو پھر آپ شعر کہتے نہیں بلکہ شعر جنتے ہیں،

پروفیسر مولانا عبدالقدیر حسرت صدیقی اور ان کے بھائی مولوی عبدالمقتدر فضل داغ کی زندگی میں نوجوان تھے اور چونکہ شعر وسخن کا ذوق تھا اِس لئے داغ کے پاس اکثر آتے جاتے تھے اور کبھی کبھار اصلاح بھی لیتے، ایک روز عبدالمقتدر فضل ہرا عمامہ ہرا جُبّہ پہنے ہوئے داغ کے پاس آئے داغ نے یہ وضع دیکھی تو پان دئے اور پےدر پے کئی پان کھلائے جب ہونٹ خوب لال ہوگئے تو کہا "اب بنے میاں مٹھو"، مقصد یہ تھا کہ لباس تو ہرا تھا ہی صرف چونچ لال نہ تھی اب وُہ بھی ہوگئی،

دہلی کے ایک ہندو مطبع والے نے اپنے مطبع کے چھپے ہوئے قرآن مجید کے

دو نسخے ڈاک سے بھجوائے اور لکھا کہ ایک جلد آپ کی خدمت میں ارسال ہے دوسری اعلیحضرت حضور نظام کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے، خط پڑھتے ہی داغ نے اس کی پشت پر لکھوایا، کیوں صاحب! ایک قرآن شریف آپ نے مجھے رشوت میں روانہ کیا ہے؟ میں آپ کا بھیجا ہوا قرآن شریف اعلیحضرت کی خدمت میں پیش نہیں کر سکتا۔ پھر دونوں کلام مجید ڈاک سے واپس بھجوادئے،

محمد رضا خاں نامی ایک صاحب نے "جلوۂ خورشید" اور "زعفران زار رضا" نام کی دو کتابیں جو نظم تھیں ڈاک کے ذریعہ بھجوائیں ان کتابوں پر ایک چِٹ لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا "یہ کتابیں خاص مذہب اثنا عشری کی ہیں اہل سنت ملاحظہ نہ فرمائیں" داغ نے چِٹ دیکھتے ہی پارسل بندھوا دیا اور یہ خط لکھوا کر اس کے ساتھ واپس کر دیا "میں اہل سنت الجماعت سے حنفی المذہب ہوں آپ کی ہدایت کے بموجب آپ کی کتابیں نہ دیکھ سکا۔"

افتخار عالم اور احسن مارہروی حیدرآباد پہنچے تو داغ نے اپنے سب دوستوں اور شاگردوں سے ان کا تعارف کرایا، ڈاکٹر احمد علی فوج کے ڈاکٹر تھے اور اپنے آپ کو مرشد کہا کرتے تھے وہ آئے تو داغ نے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ دونوں مارہرے کے سادات اور پیرزادے ہیں اور چونکہ آپ مرشد ہیں اس لئے انہیں پیر و مرشد سمجھئے،

حضور غفران مکان نے اپنی غزل کے ایک شعر میں لفظ وِسکی استعمال فرمایا تھا داغ نے اصلاح دیتے ہوئے اسے بدل دیا اور وسکی کی جگہ اُس کی بنا دیا، اصلاح پہنچی تو حضور نے داغ کو یاد فرمایا اور پوچھا اس شعر میں آپ نے کیا اصلاح دی ہے داغ نے عرض کیا وسکی لفظ متروک ہے اب اس کی جگہ

اُس کی کہا جاتا ہے اِس لئے مَیں نے بدل دیا ہے، حضور یہ سُن کر بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمانے لگے یہ نہ پینے کی خوبی ہے، پھر فرمایا اُستاد یہ لفظ وسکی ہے جو ایک شراب کا نام ہے اردو میں بھی اِسے وِسکی ہی بولتے ہیں،[1]

قیام رامپور کے زمانے میں داغ لکھنؤ گئے تو بہادر حسین انجم کے ساتھ مشہور ڈیرہ دار طوائف مشتری کے پاس بھی پہنچے مشتری نے بڑی خاطر مدارات کی اور غزل سُنانے کی خواہش بھی کی، داغ نے غزل سُنائی تو اس شعر پر ؎

شبِ ہجراں کے جاگنے والے ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

بے خود ہو گئی اور دیر تک مزے لیتی رہی، پھر داغ نے اس سے غزل سُنانے کی خواہش کی تو وہ اپنی بیاض لینے کے لئے دُوسرے کمرے میں گئی، یہاں جو حُقّہ رکھا ہُوا تھا ایک صاحب نے حماقت سے چلم گرا دی اور سفید چادر جگہ جگہ سے جل گئی، خدمتگار فرش پر سے انگارے اُٹھا رہا تھا کہ مشتری بیاض لی ہوئی واپس آ گئی اور پُوچھنے لگی کیا ہوا؟ داغ نے کہا داغ لگ گیا، مشتری نے فوراً جواب دیا مُشتری تو بے داغ ہے،

داغ لگنے کے کئی لطیفے مشہور ہیں جناب راز یزدانی نے اپنی عنایت سے

---

[1] جن دنوں داغ حیدر آباد آئے ہیں شمالی ہند والے عام طور پر وِن کے کے یان، وِنکی، وُسکی، بولتے تھے چنانچہ جمال صاحب داغ کا ملازم خاص ہمارے پاس آتا اور ہم لوگ اُس سے داغ کے حالات پُوچھتے تو وہ بڑے مزے سے نقلیں کرتا چنانچہ جلیل اور اختر مینائی کی نقل وہ بڑی عُمدگی سے کرتا اور خصوصیت سے وِن کے کے یان سُنایا کرتا تھا اسی وجہ سے داغ نے بھی وِسکی کو بھی وُسکی سمجھ کر بدل دیا ہوگا، یہ لطیفہ سرامین جنگ بہادر مرحوم کی زبانی سُن کر نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے، ۱۲

داغ کے چند لطیفے بھیجے ہیں جو رامپور میں مشہور ہیں ان میں بھی ایک لطیفہ ہے کہ نواب صاحب رامپور کے دربار میں چلم گر گئی اور خدمتگاروں نے لپک کر انگارے اُٹھانے شروع کردئے تو نواب نے پُوچھا کیا ہُوا ؟ داغ نے عرض کیا داغ لگ گیا،

ایسے ہی لطائف حیدر آباد میں بھی مشہور ہیں،

داغ علالت کی وجہ سے روزے نہ رکھتے تھے مگر رمضان میں افطار کا اہتمام ہوتا تھا اور احباب کے ساتھ افطار ضرور کرتے تھے، ایک روز افطار کا اہتمام ہو رہا تھا داغ آرام کرسی پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے کہ اذان کی آواز آئی لوگ افطار کرنے لگے تو داغ بھی کرسی سے اُٹھ کر دستر خوان پر پہنچے اور افطار میں شریک ہو گئے کسی نے کہا اُستاد! آپ کا روزہ تو نہ تھا پھر افطار کیسے؟ کہنے لگے اس سے کیا ہوتا ہے روزہ چاہے نہ ہو مگر افطار تو ہے تم لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ میں روزہ نہ رکھوں تو افطار بھی نہ کروں اور پُورا کافر ہو جاؤں!

مولوی مُحبّ حسین اڈیٹر معلّم نسوان داغ کے شاگرد تھے ایک دفعہ وُہ آئے تو افتخار عالم نے پُوچھا مولوی صاحب! معلّم نسواں کیوں بند ہو گیا ابھی وُہ جواب دینے نہ پائے تھے کہ داغ نے کہا بند نہیں ہُوا عدّت میں بیٹھا ہُوا ہے،

ایک روز دوا رکھنے کے لئے بوتلوں کی ضرورت پڑی تو خورشید عالم نے کہا بوتلیں میرے پاس ہیں ابھی بھجواتا ہوں، چنانچہ وُہ اُٹھ کر اندر گئے اور چار بوتلیں بڑی ہی نفیس نوکر کے ہاتھ سے بھجوا دیں اِن بوتلوں پر چٹھی لگی ہوئی تھی داغ نے پُوچھا یہ چٹھی کا ہے کی ہے تو لوگوں نے کہا شراب کا نام اس پر چھپا ہوا ہے، داغ نے بوتلیں اُسی وقت واپس

کردیں اور نوکر سے کہا صاحب[1] سے کہو کہ میں خالی بوتلیں نہیں لیتا بھری ہوئی بھجوائیں،

راجہ بیدار کشن کوٹ کے رئیس اور داغ کے شاگرد تھے ایک دفعہ داغ کو انہوں نے لکھا کہ میں نے طیور و فواکھ کا دو آتشہ ماءاللحم تیار کرایا ہے جو نہایت ہی مقوی ہے فرمائیے تو چند شیشے بھجواتا ہوں، داغ نے جواب میں لکھا آپ دو آتشہ شراب تو بھجوا دیں گے مگر اس کے ساتھ دوسری چیز (معشوق چار سالہ) کون بھجوائے گا اس کا انتظام کر دیجئے تو شراب پیتا ہوں،

داغ کے پاس ایک ماما بڑی ہی تیز اور طرار تھی ایک روز گھر کے سامنے سے ایک بارات بڑی دھوم سے جا رہی تھی سب لوگ پھاٹک پر کھڑے بارات کا جلوس دیکھ رہے تھے اور یہ ماما بھی ایک طرف کھڑی ہوئی تھی داغ نے اس سے پوچھا کیا دیکھ رہی ہے گلشن؟ اس نے جواب دیا سرکار دولہا میاں کو عمر قید ہوئی ہے ان کا تماشا دیکھ رہی ہوں، داغ نے موجودہ لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ان لوگوں میں سے کسی کو پسند کر لے میں عمر قید کرا دیتا ہوں، گلشن جھینپ کر بھاگ گئی،

ایک روز مولانا شبلی اور ظفر علی خاں داغ سے ملنے کے لئے آئے باتوں باتوں میں شبلی نے افتخار عالم اور احسن مارہروی سے کہا عرب کے بڑے بڑے شاعر مثلاً لبید وغیرہ اپنے ساتھ ایک آدمی رکھا کرتے تھے جسے راویہ کہتے تھے آپ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کو فصیح الملک کے راویئے بننے کی سعادت حاصل ہے، داغ نے ہنس کر کہا آپ انہیں راویئے کہتے ہیں اور میں انہیں کراماً کاتبین سمجھتا ہوں،

---

[1] خورشید عالم کو داغ ہمیشہ صاحب پکارتے تھے، ۱۲

میر مردان علی داغ کے بے تکلّف دوستوں میں تھے جو صدر محاسبی (اکاؤنٹنٹ جنرل آفس) کے مددگار تھے ایک شام وہ آ کر کہنے لگے کل رات میں نے ناٹک میں ایک ایکٹر کو آپ کی غزل گاتے سُنا جب وہ اِس شعر پر پہنچا ؎

غنچۂ دل کے عوض تازہ ہوئے داغ جنوں　　کیا بہار آئی ہے دیوانہ بنانے کے لئے

تو کپڑے پھاڑ ڈالے، حاضرین اِس منظر کو حیرت سے دیکھنے لگے، داغ نے یہ سُن کر بڑی سادگی سے پُوچھا میر صاحب! آپ نے یہ بھی غور کیا کہ اس ایکٹر نے اپنا پاجامہ بھی پھاڑ لیا تھا یا نہیں؟ اِس پر ایک قہقہہ پڑا،

افضل گنج کا مکان جس میں داغ مدّتوں رہے وضع قطع کے لحاظ سے بھی عُمدہ نہ تھا اور نہ گنجائش ہی زیادہ تھی، ایک روز داغ کے ایک شاگرد مُستجاب خاں خلق نے کہا اُستاد! آپ کی اِتنی تنخواہ اور یہ عزّت و اقتدار پھر اِس تنگ و تاریک مکان میں رہایش بڑی حیرت کی بات ہے آپ کو چاہئے کہ ایک مکان اپنے مرتبہ کے موافق بنوائیں، داغ نے جواب دیا، شاید آپ کو معلوم نہیں کہ سُقراط جس مکان میں رہتا تھا وہ بھی ایسا ہی تنگ تھا دس پانچ آدمیوں سے زیادہ کی گُنجائش نہ تھی آپ کی طرح کسی نے اُس پر بھی اعتراض کیا تو سُقراط نے جواب دیا میں مُختصر مکان میں اِس لئے رہتا ہوں کہ اپنے دوستوں سے بھرا ہُوا دیکھوں اور اِس خیال سے خوش رہوں کہ میرا گھر میرے دوستوں سے بھرا ہُوا ہے، چُنانچہ مَیں نے بھی سُقراط کی تقلید کی ہے تا کہ آپ لوگ آئیں تو مکان بھر جائے اور مَیں خوش رہوں کہ میرے احباب سے گھر بھرا ہُوا ہے،

ایک روز داغ آرام کُرسی پر لیٹے حُقّہ پی رہے تھے کہ چاندنیوں پر

نظر پڑی جو ذرا میلی ہوگئی تھیں نوکر کو بلا کر کہا چاندنیاں بدل دو، نوکر نے کہا چاندنیاں دھوبی کے یہاں سے نہیں آئی ہیں اور آج ہندؤں کا تہوار ہے داغ نے پوچھا ہندؤں کے تہوار کو چاندنیوں سے کیا تعلق تو نوکر نے کہا، یہاں کے دھوبی اپنے تہوار کے موقع پر چاندنیاں باندھا کرتے ہیں، داغ نے ہنس کر کہا ہائے ہم ہندو نہ ہوئے،

جبیب کنتوری کے پاس مشاعرہ تھا۔ داغ بھی شریک تھے جبیب نے غزل سنائی جس کا قافیہ اور ردیف سفر سے پہلے حضر سے پہلے تھی اور جس شعر میں سفر قافیہ تھا اسے زور دے کر پڑھا اور کہا اگر کوئی ایسا شعر کہے تو خون تھوکنے لگے، داغ نے بڑی بے توجہی سے کہا ہم تو اس زمین پر تھوکتے بھی نہیں،

ایک روز ایک مدراسی شاگرد نے پوچھا استاد! آپ دہلی کے کونسے محلّے کے رہنے والے ہیں؟ داغ نے کہا دہلی کے دِل کا رہنے والا ہوں ترکمان دروازے کا نہیں لاہوری دروازے کا نہیں اجمیری دروازے کا نہیں، بلکہ چاندنی چوک کا شہدا ہوں،

منشی محمد الدین فوق (جو کشمیری میگزین کے اڈیٹر کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے) داغ کے شاگرد تھے انہوں نے پنجۂ فولاد نام سے ایک اخبار جاری کیا تو داغ کے پاس بھی بھجوانے لگے داغ نے پرچہ دیکھ کر کہا گزشتہ محرّم میں ایک رنڈی میرے سلام کو آئی تھی نام پوچھا تو کہا فولاد جان اس پر مجھے حیرانی ہوئی اب یہ پنجۂ فولاد نکلا تو معلوم ہوا کہ اسی فولاد جان کا یہ شوہر ہے،

کسی جلسہ میں ایک انگریز سے ملاقات ہوئی تو اس نے انگریزی میں

کچھ پوچھا داغ نے بھی اسی لب و لہجہ میں بے معنی سا جواب دیا جس پر حیران ہو کر اس نے اردو زبان میں پوچھا آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ داغ نے جواب دیا امریکہ کا باشندہ ہوں یہ سن کر اس نے گھور کر دیکھنا شروع کیا، داغ نے کہا آپ حیران نہ ہوں، میری روسیاہی پر نہ جائیں یہ جہاز کے دھوئیں سے رنگ کالا ہو گیا ہے، اس پر ایک قہقہہ پڑا،

ایک مدراسی بزرگ شریف تخلص کرتے اور شاعری کا شوق فرماتے تھے انہوں نے اپنے کلام کو اکٹھا کر کے چار جزو کا مجموعہ مرتب کر لیا اور نام کی فکر میں لگ گئے ایک دفعہ داغ کے پاس پہنچ کر لمبی چوڑی تمہید کے بعد نام کی خواہش کی داغ نے کہا کلام شریف رکھ دیجئے انہوں نے کہا صاحب! کلام شریف تو کلام اللہ کو کہتے ہیں، داغ نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے ہر شاعر اپنا کلام اپنے تخلص سے چھپواتا ہے چنانچہ مضطر خیر آبادی کا کلام کلام مضطر کے نام سے چھپا ہے آپ نے بھی دیکھا ہوگا یہ سن کر وہ مطمئن ہو گئے اور اپنے دیوان کا نام کلام شریف رکھ دیا، جب دیوان طبع ہو گیا تو لوگوں نے بڑی لے دے کی اور شریف صاحب پھر داغ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے لوگ مجھے ستا رہے ہیں کہ اپنے دیوان کا نام کلام شریف رکھ دیا داغ نے کہا واقعی آپ نے بڑی غلطی کی ایسا نام نہ رکھنا چاہیئے تھا شریف صاحب نے کہا آپ ہی نے تو کہا تھا، داغ نے کہا حضرت! میں نے اس خیال سے کہا تھا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ اپنے وطن یعنے مدراس کی صراحت بھی کر دیں گے اور "کلام شریف مدراسی" نام رکھیں گے اس پر کس کو اعتراض ہو سکتا تھا؟ بالآخر ان بزرگ نے

سرورق بدل دیا اور کلام شریف مدراسی اس پر چھپوا ڈالا،

ڈاکٹر احمد حسین مائلؔ حیدر آباد میں ایک بزرگ تھے جو داغؔ کے مُنہ آتے تھے انہوں نے میر تقی میرؔ سے لے کر داغؔ تک سبھوں کی غزلوں پر غزلیں کہی تھیں شاعر تو نہ تھے متشاعر ضرور تھے مشق خاصی تھی قافیہ پیمائی کرتے تھے، ایک دعوت میں داغؔ سے مُلاقات ہوگئی تو انہوں نے اپنا کہا ہُوا اسرا پا سُنایا جو نعت میں تھا داغؔ نے بڑی عقیدت سے سُنا اور خُوب داد دی، مائلؔ نے خوش ہو کر پُوچھا فرمائیے حضرت! مَیں کیسے شعر کہتا ہوں داغؔ نے کہا جناب آپ بڑے اچھے شعر کہتے ہیں خصوصاً آپ کی نعت کا تو مَیں قائل ہوں، پھر انہوں نے پُوچھا اُستاد! میری غزل کے متعلق آپ کا خیال کیا ہے تو داغؔ نے کہا، جناب! نعت گو جیسی غزل کہہ سکتا ہے ویسی غزل آپ بھی کہتے ہیں مَیں اس کا گواہ ہوں، اِس کو مائلؔ نے اپنے لئے سندِ فضیلت سمجھ کر بہت شکریہ ادا کیا،

دُوسرے روز جب مائلؔ نے لوگوں کو یہ قصّہ سُنایا تو لوگوں نے کہا مائلؔ صاحب! داغؔ نے آپ کو نعت گو مانا ہے البتّہ غزل میں وُہ آپ کے قائل نہیں چنانچہ اُن کا یہ کہنا کہ "نعت گو جیسی غزل کہہ سکتا ہے ویسی غزل آپ بھی کہتے ہیں، صاف ظاہر کر رہا ہے کہ وُہ آپ کو نعت گو ہی سمجھتے ہیں ٭

داغ کے خلاف پروپیگنڈا

داغ کے خلاف سب سے پہلے لکھنؤ والوں نے محاذ بنایا اور اودھ پنچ میں داغ کے خلاف ہنگامہ شروع ہوا، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی نے "گلدستہ پنچ" کا دیباچہ لکھتے ہوئے لکھا ہے،

"تیسرے ہنگامے کی رونق داغ کی شاعری سے ہے اودھ پنچ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کبھی تسلیم نہیں کی اس کا ظاہری سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اودھ پنچ کے ظریفوں کے دل میں لکھنؤ اور دلی کی قدیم رقابت کا زخم ہرا تھا اور دوسری جانب داغ کے شاگرد اپنے اُستاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ شاگردوں کی بدمزاقی کا خمیازہ غریب اُستاد کو اُٹھانا پڑا اور اودھ پنچ کے صفحوں سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصہ تک اُڑا کیں جن کا رُخ داغ کی شاعری کے علاوہ اس کے حسب نسب اور صورت و سیرت کی طرف بھی تھا، اِن اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانہ تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا"[1]

اودھ پنچ نے سرسید، خواجہ حالی، رتن ناتھ سرشار اور داغ

[1] دیباچۂ گلدستۂ پنچ، مرتبۂ کشن پرشاد کول مطبوعۂ ہندوستانی پریس لکھنؤ، طبع اول ۱۹۱۵ء

سب کے خلاف ہنگامے برپا کئے، دُنیا جانتی ہے کہ اودھ پنچ کی حیثیت ایک پڑھے لکھے بھانڈ سے زیادہ نہ تھی، نہ تو سرسیّد کی تحریک کو نُقصان پُہنچا نہ حالی کی عزت میں کمی ہوئی نہ سرشار کا وقار گھٹا نہ ہی داغ کا کچھ بگڑا، گو اودھ پنچ نے خوب کیچڑ اُچھالی داغ کی والدہ کو بے نقاب کیا اور داغ کو ذلیل کرنے کی کوشش امکان بھر کی مگر داغ اُتنے ہی اُبھرتے گئے،

والد مرحوم اودھ پنچ کے خریدار تھے اِس لئے ہمارے کُتب خانے میں اودھ پنچ کے مکمّل فائل تھے پُورے مضامین مَیں نے دیکھے ہیں یہ سب سے پہلا پروپیگنڈا تھا جو داغ کے خلاف شروع ہُوا، اس کے بعد ایک منظم پروپیگنڈا امیر مینائی کے شاگردوں نے شروع کیا جو اب تک جاری ہے، جہاں بھی موقع ملتا ہے یہ لوگ داغ کو گرانے ان میں کیڑے ڈالنے اور انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں،

امیر مینائی کے ایک شاگرد احسن الثاقب نے امیر مینائی کے خطوط جمع کرکے "مکاتیب امیر مینائی" کے نام سے شائع کئے ہیں اس کے مقدمے میں امیر و داغ کا موازنہ کرکے داغ کو گھٹانے اور اُنہیں جاہل ٹھہرانے کی کوشش کرنے کے علاوہ امیر کے خطوط میں جا بجا ایسے جُملے اور فقرے اضافہ کردئے ہیں جن سے داغ کی سُبکی ہو،

یکم اگست ۱۸۹۳ء کا لکھا ہُوا ایک خط امیر مینائی کا داغ کے نام نقل کرتے ہوئے اس میں یہ فقرہ اپنی طرف سے اضافہ

کر دیا ہے،

"پیارے داغ! افسوس ہے کہ میں نے حمید سے کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف مشغولی کی نہ سُنی..... پیارے داغ! میرے لکھنے کا بُرا نہ ماننا خوشامد کرنے والے سینکڑوں ہیں مُلامت کرنے والوں میں ایک مجھی کو رہنے دو" (صہ ۲۸۳)

اِس طرح جگہ جگہ داغ پر الزام تراشا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ داغ میں صرف ایک بُرائی (اگر وُہ بُرائی سمجھی جا سکے) تھی کہ وُہ رنڈیوں کا گانا سُنا کرتے تھے اِس کے علاوہ کوئی بُرائی اُن میں نہ تھی جس پر اُنہیں اُنگشت نما کیا جا سکے، داغ نماز کے بے انتہا پابند تھے مَرنے تک انہوں نے نماز پڑھی ہے، روزوں کے بھی وُہ پابند تھے البتہ بعد میں بعض امراض کے سبب مجبوراً وُہ روزے قضا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ داغ کے مُلازم حمید نے داغ کی نماز کا حال کہا ہی ہو گا، پھر امیر کِس طرح لِکھ سکتے تھے کہ "کوئی ساعت آپ کی خُدا کی طرف مشغولی کی نہ سُنی"۔

امیر مینائی کے ایک شاگرد ممتاز علی آہ نے "امیر مینائی" کے نام سے اور ایک دُوسرے شاگرد عبدالحکیم عالم گنجی نے "دبدبۂ امیری" کے نام سے امیر مینائی کی سوانح عمریاں لکھی ہیں ان دونوں بزرگوں نے بھی امیر کو بڑھانے اور داغ کو گھٹانے کی امکانی کوشش کی ہے اور بیشتر واقعات غلط سلط لکھے ہیں اور جھوٹ کا ایک طُومار باندھا ہے مثلاً یہ کہ حاجی ابراہیم خانساماں نے خطوط لِکھ کر امیر کو بنارس بُلوایا، اور حضور نظام سے ملایا، حضور نے بنارس میں امیر کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کیا اور امیر ٹال گئے پھر حضور نے مجبور کر کے حیدرآباد

بُلایا اور حیدر آباد میں امیر کی علالت کے زمانے میں مہاراجہ کشن پرشاد اور افسر جنگ حضور نظام کی طرف سے مزاج پُرسی کے لئے آیا کرتے تھے وغیرہ،

اتفاق سے امیر مینائی کی وُہ سوانح عمری جو فصاحت جنگ جلیل نے لکھی ہے مجھے نہ مِل سکی معلوم نہیں جلیل نے کیا کیا لکھا ہے مگر آہ، حکمت اور ثاقب نے تو غضب کر دیا ہے اِن تصانیف کو دیکھ کر شرم آتی ہے کہ ہم ہندوستانیوں کی تصنیف و تالیف کا معیار کتنا گرا ہوا ہے اور ایمان داری کے خلاف بغیر جانے بُوجھے محض وہم و قیاس سے دُور از واقعات بیانات تصنیف کر دینا حد درجہ شرم ناک ہے، کہاں تک ان لوگوں کی دروغ بافیاں بتاؤں صرف ایک واقعہ کا انکشاف کرتا ہوں،

ثاقب نے امیر مینائی کے دیباچے میں لکھا ہے،

"مہاراجہ کشن پرشاد وزیر بھی کئی بار مزاج پُرسی کے لئے تشریف لائے" (مکاتیب امیر مینائی صہ ۲۵)

حکمت عالم گنجی عظیم آبادی نے لکھا ہے،

"مہاراجہ کشن پرشاد شاد کئی بار مزاج پُرسی اور عیادت کے لئے تشریف لائے" (دبدبۂ امیری صہ ۸۲)

ممتاز علی آہ نے اور زیادہ تفصیل سے یہ کیفیت لکھی ہے در اصل وہی اِس "گپ" کے مولف ہیں:-

"حسب الارشاد اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں طاب ثراہ عالی جناب سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شاد اور

افسر جنگ وغیرہ حضرت کی بیماری میں برابر عیادت کو آتے رہے جس کے شکریہ میں حضرت نے بستر رنجوری پر پڑے پڑے حسرت کے عالم میں چند رباعیاں کہی تھیں جو یقیناً اُن کا آخری کلام ہے"۔ (سوانح امیر مینائی ص۱۳۸، ۱۳۹)

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ کے انتقال کے بعد ان کی سوانح عمری کی ترتیب کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی اور نواب مہدی نواز جنگ بہادر سابق معتمد بابِ حکومت اور حال وزیر اندھرا پردیش نے اپنی نگرانی میں اِس سوانح عمری کو شائع کرایا تھا اس میں مہاراجہ بہادر کے چند خطوط بھی شائع ہوئے ہیں،

ایک خط مہاراجہ نے امیر مینائی کو اُس وقت لکھا ہے جب امیر حیدر آباد آکر بیمار ہو گئے تھے اور پھر ذرا افاقہ ہوا تھا،

"آپ کے آنے کے قبل ہی میری آنکھوں کو انتظار اور کانوں کو اشتیاق تھا کہ آپ کو دیکھوں اور آپ کا کلام سُنوں انشاءاللہ تعالیٰ اب وُہ وقت قریب آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے عاجلہ عطا فرمائے،

(مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات ص۲۷۵)

امیر کی وفات کے بعد مہاراجہ نے لطیف احمد مینائی (اختر یار جنگ) کو لکھا ہے،

"مجھے مرحوم کی وفات نے بہت صدمہ پہنچایا افسوس ہے کہ صُورت بھی نہیں دیکھنے پائی"،

(مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات ص۲۷۵)

اب غور فرمائیے کہ شاگردانِ امیر کتنے متاثر واقع ہوئے ہیں،
حقیقت صرف اتنی ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی اُن دنوں مہاراجہ کی سرکار میں ملازم تھے، امیر مینائی جس روز حیدر آباد پہنچ رہے تھے اُس روز داغ نے مہاراجہ بہادر کو لکھا کہ چند بگھیاں امیر مینائی کے ہمراہیوں اور سامان کے گھر لانے کے لئے اسٹیشن پر بھجوانے کا حکم دیا جائے، چنانچہ مہاراجہ نے گاڑیاں بھیجنے کا حکم دیا اور ان گاڑیوں کے ساتھ سرشار بھی اسٹیشن پہنچے اور شریک استقبال رہے، امیر کی علالت کے دوران میں سرشار روزانہ انہیں دیکھنے کے لئے خود جایا کرتے تھے اور وہاں جانے کی اجازت مہاراجہ بہادر سے لیتے تھے چونکہ مہاراجہ خود شاعر ادیب اور شاعر نواز تھے اِس لئے انہوں نے بھی دو تین دفعہ خیریت پوچھی اور سرشار نے امیر کو مہاراجہ کی دلچسپی اور پرسشِ احوال کا حال سنایا تو انہوں نے چند رباعیاں کہہ کر سرشار کے ذریعہ مہاراجہ کے پاس بھجوائیں اس لئے مہاراجہ نے یہ دونوں چٹھیاں امیر مینائی کو لکھیں اور سرشار کے ہاتھ بھجوائیں ورنہ نہ تو مہاراجہ نے امیر کی ملاقات کی نہ عیادت یا مزاج پرسی کے لئے تشریف لے گئے،
آہ نے حیدر آباد سے باہر بیٹھ کر امیر کی سوانح عمری لکھی ہے اس لئے یقین ہے کہ یہ تفصیل ہمراہیانِ امیر ہی نے انہیں سنائی ہوگی اور ظاہر ہے کہ جس نے بھی یہ تفصیل تصنیف کی وہ جھوٹ ہی کہا ہے،
حیدر آباد میں انہیں ہمراہیانِ امیر نے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی کہ داغ نے امیر کو زہر دے کر مارا، اِس طرح یہ لوگ ہر معاملہ میں داغ کو مطعون کرنے کی کوشش کرتے رہے پھر لطفِ خاص یہ کہ

داغ کو اپنا ملجا و ماوا بنا کر کام بھی نکال لیا، چنانچہ لطیف احمد اخترؔ مینائی اور حافظ جلیل حسن جلیلؔ ابتداً داغؔ ہی کے پاس رہے پھر داغؔ ہی نے اُن دونوں کو مہاراجہ کے پاس مُلازم رکھا دیا چنانچہ ان کے متعلق مہدی نواز جنگ بہادر نے لکھا ہے،

"جلیل حسن صاحب (فصاحت جنگ جلیلؔ) اور اختر یار جنگ مینائی کے حیدر آباد آنے کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے طویل عرصہ تک ان کی سرپرستی فرمائی اور اپنے اسٹیٹ سے دونوں کو معتد بہ ماہوار دیا کرتے تھے، جلیلؔ صاحب سے شاعری میں اور اخترؔ مینائی سے تالیفات میں مشورہ کیا جاتا تھا، رسالہ دبدبۂ آصفی و محبوب الکلام بھی ان سے متعلق کیا گیا" (مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات ص ۲۲۸)

مَیں یہیں تک پہنچا تھا کہ سوانح امیرؔ مینائی مؤلفہ فصاحت جنگ جلیلؔ (مطبوعہ مطبع سیدی حیدر آباد ۱۳۴۷ھ) مل گئی اِس میں بھی جلیلؔ نے جگہ جگہ زہر افشانی کی ہے، ظہیرؔ دہلوی کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

"ظہیر دہلوی تلمیذ ذوقؔ جب حیدر آباد آئے اور حضرت داغؔ سے ملے مَیں اُس وقت موجود تھا جناب ظہیرؔ نے اپنی تازہ غزل سُنائی، سُننے کے بعد حضرت داغؔ نے ظہیرؔ سے فرمایا کہ تم نے غزل بڑی فکر سے کہی ہے اور معلوم ہوتا ہے بہت زور لگایا ہے مگر قسم لو جو مَیں ایک شعر بھی سمجھا ہوں، اِس سے ناظرین اندازہ لگالیں کہ ظہیرؔ دہلوی کی شاعری سے جو دلی کے

رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی داغ کو کس قدر بیگانگی تھی" (ص۲۹)
غور فرمائیے گویا داغ دلّی کے رنگ کو بھول ہی گئے تھے کیونکہ انہیں نہ تو اردو سے ربط تھا نہ دلّی سے تعلق وہ غالباً تلنگی مرہٹی کے شاعر تھے، اس طرح جلیل نے داغ کو دلّی کے رنگ سے بیگانہ کر دیا اور پھر لکھا ہے،

"مرزا داغ کو زمرۂ شعراء میں نہیں رکھا گیا بلکہ ریاست کے بعض کارخانوں پر مامور فرمایا تھا" (ص۳۰)

مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ آخر میں ایک فقرہ لکھ دیا کہ امیر مینائی کے انتقال کے وقت

"جناب داغ نے تیمارداری اور علاج میں دلسوزی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا" (ص۱۶)

خاندان امیر مینائی کی ایک یادگار نے چند جعلی اور فرضی خطوط تصنیف کر کے رسالہ فاران کراچی میں چھپوائے ہیں جن کی نقل مجلۂ نگار لکھنؤ میں نومبر ۱۹۵۸ء میں چھپی ہے یہ خطوط اسی لئے گھڑے گئے ہیں کہ داغ کی سُبکی ہو، ان خطوط پر حضرت نوح ناروی اور حضرت شاد میرٹھی وغیرہ نے خوب لے دے کی ہے اور انہیں رفیق مارہروی نے "زبان داغ" میں (ص۱۱۵-۱۴۶) بھی نقل کیا ہے، اور ان کے متعلق بحث کی ہے،

یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور جہاں بھی امیر کے خاندان والوں اور شاگردوں کو موقع ملتا ہے داغ کے خلاف کچھ نہ کچھ زہر اُگل ہی دیتے ہیں، چنانچہ مجلۂ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر جلد دوم میں امیر مینائی پر مقالہ لکھتے ہوئے امیر کے پوتے اسمٰعیل احمد مینائی نے لکھا ہے،

جب داغ دوسری بار حیدر آباد جانے لگے تو امیر مینائی سے ملنے رام پور آئے، جلال کو خبر پہنچی تو وہ بھی لکھنؤ سے آ گئے امیر ہی کے یہاں ٹھیرے روانگی سے پہلے شام کو ایک مختصر سی صحبتِ شعر و سخن منعقد ہوئی جلال کے بعد داغ نے غزل شروع کی رُسوائی کا شیدائی کا، جب یہ مصرعہ پڑھا ع

ہو گیا پرتوِ حُسن سے کچھ اور ہی رنگ

تو جلال نے جھوم کر کہا واہ مرزا خاں واہ کیا مصرعہ کہا ہے،

ہو گیا پرتوِ حُسن سے کچھ اور ہی رنگ

پھر ارشاد ہوا اللہ اعجاز ہے اعجاز، تعریف نہیں ہو سکتی، داغ ایک لمحہ کے لئے دم بخود ہو گئے جلال نے کبھی اُن کے اچھے سے اچھے شعر کی اتنی تعریف نہیں کی تھی، تھے بلا کے طباع اور ذہین آدمی پرتوِ حُسن کے نقص کو فوراً پا گئے مگر جلدی میں اس کو دُور کرنے کا پہلو نہ سوجھا، امیر مینائی نے کسی تامل کے بغیر مصرعہ دہرایا ع

ہو گیا پرتوِ رُخسار سے کچھ اور ہی رنگ

ہاں میاں نواب مرزا، پھر تو پڑھنا، داغ نے ان کو متشکر نظروں سے دیکھ کر شعر پڑھ دیا ؎

ہو گیا پرتوِ رُخسار سے کچھ اور ہی رنگ
میں نے منہ چوم لیا تیرے تماشائی کا

(نقوش لاہور شخصیات نمبر ۲، صفحہ ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

سُن لیا آپ نے ساٹھ سال کا بوڑھا داغ جس کی پچاس سال کی

مشق تھی اور جو تیس سال سے اُستادی کا ڈنکہ بجا رہا تھا ایک مصرع تک موزوں نہ کر سکتا تھا اور ایسے معیوب شعر کہتا تھا!

داغ حیدر آباد سے دہلی واپس ہوئے اور سات آٹھ مہینے دہلی ہی میں رہے[1] انہوں نے دہلی کے باہر قدم ہی نہیں رکھا وہاں سے سیدھے حیدر آباد ہی واپس ہوئے، یہ بھی تحقیق شدہ امر ہے کہ داغ رامپور سے نکلنے کے بعد سے پھر رام پور گئے ہی نہیں یہ شعر جس غزل کا ہے وُہ رامپور میں کہی گئی ہے اور غالباً مشاعرے کی ہے اِس غزل کے ساتھ امیر مینائی کی غزل بھی موجود ہے یہ غزل گلزار داغ میں[2] صفحہ ۵۳-۵۴ پر طبع ہو چکی ہے اور گلزار داغ، داغ کے قیام رامپور ہی کے زمانے میں امیر مینائی کے سامنے ہی طبع ہو چکا تھا پھر وُہ مصرع جو امیر مینائی کی اصلاح کے بعد

ہو گیا پرتو رُخسار سے کچھ اور ہی رنگ

بنا، گلزار داغ میں اِس اصلاح کے ساتھ کس طرح طبع ہو سکتا تھا جو برسوں پہلے طبع ہوا ہے اس سے خود اسمٰعیل احمد مینائی کی جھوٹ کا پول کھل جاتا ہے،

مجھے اسمٰعیل احمد اور اسرائیل احمد پر حیرت ہے کہ یہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس قسم کی حرکات کیوں کر رہے ہیں نومبر ۱۹۵۷ء میں مجلہ نقوش لاہور کا مکتوبات نمبر شائع ہوا تو حسب عادت دروغ بافانِ خاندان مینائی نے اِس میں بھی چند فرضی اور جعلی خطوط چھپوا دئے،

جہاں تک مَیں واقف ہوں شاگردان داغ نے کبھی امیر مینائی کی ذاتی مخالفت نہیں کی اور نہ اُن کے خلاف پروپیگنڈا کیا مگر اس

---

[1] ۱۸۸۸ء ؛ [2] گلزار داغ مطبوعہ ۱۸۷۸ء

خانوادۂ محترم نے بُغضِ داغ کو جزوِ ایمان بنا لیا ہے اور داغ پر تبرّا کرنا باعث نجات تصوّر کرتے ہیں چُنانچہ مجلہ آج کل دہلی بابتہ ماہ جنوری ۱۹۵۸ء میں علی احمد جلیلی نے ایک مقالہ "جلیل حیدر آباد میں" لکھا تو اس میں بھی خواہ مخواہ داغ پر چھینٹے اُڑائے ہیں،

جاوید قصری نامی کوئی بزرگ کانپور میں تھے انہوں نے ایک مضمون ہندوستانی ادب حیدر آباد دکن اکتوبر ۱۹۴۱ء میں شروع کیا جس کا بقیہ حصّہ اسی پرچے کے ستمبر ۱۹۴۴ء میں طبع ہُوا ہے اِس مضمون میں جاوید قصری نے چرکھاری ریاست کی زینت محل زُلفی کو داغ پر عاشق کرا دیا ہے اور چند خطوط اور غزلیں زُلفی کی اس مضمون میں شائع کی ہیں شاید اس کے بعد وُہ داغ کے خطوطِ زُلفی کے نام شائع کرتے مگر معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ انہوں نے کرم نہیں فرمایا،

حیران ہوں کہ ان دیوانگیوں کے متعلق کیا کہوں، بہرحال داغ کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے اور معلوم نہیں کب تک جاری رہے گا۔

شاگردانِ داغ

ہندوستان بھر میں داغ ہی ایک ایسے خوش قسمت تھے جن کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی، داغ کے حصّے میں یہ خصوصیت بھی آئی تھی کہ اُن کے شاگردوں میں بادشاہ سے لے کر فقیر تک عالم سے لے کر جاہل تک ہر قسم کے لوگ تھے، ہندوستان کے ہر شہر میں داغ کے

شاگرد تھے اور کثرت سے تھے خصوصاً پنجاب میں داغ کے بڑے تیار شاگرد موجود تھے علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولوی محمد الدین فوق مشاہیر پنجاب سے تھے یُوپی میں سینکڑوں شاگرد ممتاز گزرے ہیں جن میں سیماب صدیقی، اطہر ہاپوڑی، بیخود دہلوی، آغا شاعر، متین مچھلی شہری، نوح ناروی، گوہر رامپوری، وغیرہ بڑے مستند شاگرد تھے،

حیدر آباد میں داغ کے آتے ہی لوگوں نے شاگردی اختیار کی اور جب داغ اُستادِ شاہ بن گئے تو پھر ہزاروں شاگرد ہو گئے، اگر شاگردانِ داغ کا کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے تو کئی جلدیں درکار ہونگی، مَیں نے چاہا تھا کہ داغ کے جو شاگرد اب زندہ ہیں اُن کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ اِس کتاب میں درج کردوں مگر افسوس ہے کہ سوا حضرت نوح ناروی، متین مچھلی شہری، جوش ملیسانی اور رعد گوالیاری کے کسی اور نے توجہ نہیں کی باہر کے شعراء تو خیر دُور تھے حیدر آباد میں حضرت زین الدین کنج نشین سجادہ اور صاحبزادہ آفتاب علی خاں قہر نے امروز فردا پر ٹالا انتہا یہ کہ ترتیبِ کتاب کے دَوران میں حضرت قہر اور تسوید کے زمانہ میں حضرت سجادہ اللہ کو پیارے ہو گئے اس لئے اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا،

مَیں نے خوش نصیبی سے داغ کے سینکڑوں شاگردوں کو دیکھا ہے اور بیشتر حضرات سے خاصے مراسم رہے ہیں علامہ اقبال، ظفر علی خاں، بیخود دہلوی، آغا شاعر، سیماب صدیقی، گوہر رامپوری، سائل دہلوی، احسن مارہروی، ضیا دہلوی، الم حیدر آبادی، رنج حیدر آبادی، یار ابوالحمید آزاد، حسن علی خاں آمیر، جالب دہلوی، مستجاب خاں خلق، محفوظ

حیدر آبادی، صولت حیدر آبادی، صولت جنگ عاید، محمد علی خاں ناظم، عبد الصمد واصفی، وارث علی وارث، عبد الوالی فروغ، عزیز جنگ ولا، عزیز یار جنگ عزیز، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، رضی الدین حسن کیفی، آفتاب علی خاں قہر، زین الدین سجادہ، منتجب الدین تجلی، جگر مرادآبادی، مودود احمد تشنہ، غلام محمد زعم، امراؤ مرزا نادان، مولوی محب حسین، مولوی عبد المقتدر فضل، مولوی عبد القدیر حسرت وغیرہ بزرگوں سے مجھے نیاز حاصل رہا ہے، حضرت تجلی میرے والد تھے، کیفی اور ناظم کی شاگردی کا مجھے فخر حاصل ہے اس لئے میں چاہتا تھا کہ بعض خاص خاص شاگردوں کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ اس کتاب میں شریک کروں مگر مجبوری یہ ہے کہ کتاب ضخیم ہو گئی ہے اس لئے صرف چند شاگردانِ داغ کو پیش کرتا ہوں،

آصف

اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ نہم (غفران مکان) خسرو دکن، نواب افضل الدولہ بہادر والئی دکن نظام ہشتم کے فرزند بلند اقبال تھے ۱۸۶۶ء میں ولادت ہوئی اور ڈھائی سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں تخت نشین ہوئے، سر سالار جنگ اور شمس الامراء امیر کبیر نے تعلیم و تربیت کی نگرانی کی ۱۸۸۴ء میں باقاعدہ تخت نشینی ہوئی، تخت نشینی کے بعد ہی آپ نے بجائے فارسی کے دفاتر کی سرکاری زبان اردو قرار دی اور اردو کی سرپرستی فرماتے رہے، فارسی اردو کے بیشتر شعراء کو دربار میں جگہ دی اور ان کی تنخواہیں مقرر فرمائیں، قدر بلگرامی، گرامی جالندھری، ترکی پانی پتی، فضل رب عرشی، عبد الجبار خاں آصفی، رامپوری وغیرہ کی سرپرستی فرمائی،

۱۸۸۰ء سے فکرِ سخن فرمانے لگے اور ۱۸۸۷ء سے داغ سے مشورہ فرمانے لگے اور داغ کو اتنا نوازا کہ کسی اُردو شاعر کو یہ اعزاز نصیب نہیں ہوا، حضور کی غزلیں داغ ہی مشاعروں میں سُنایا کرتے تھے۔ نہایت ہی موزوں طبع پُرگو اور لطیف مزاج بادشاہ تھے، سخاوت، بُردباری، متانت اور حوصلہ مندی میں آپ اپنی نظیر تھے،

داغ نے ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا تو حضور نے غزل گوئی ترک فرمادی البتہ کبھی کبھی سلام اور رباعی فرمایا کرتے تھے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے معروضہ پر سلام اور رباعیاں جلیلؔ کے پاس بغرضِ مشورہ روانہ فرمانے لگے ۲۸ اگست ۱۹۱۱ء کو جنّت کو سدھارے دو تین دیوان مردف موجود ہیں مگر شائع نہ ہوسکے، چونکہ گذشتہ اوراق میں حضور کا ذکرِ جمیل خاصا ہو چکا ہے اس لئے اب صرف چند شعر نموناً نقل کئے جاتے ہیں ؎

آباد کریں آپ جو کاشانہ کسی کا
عشرت کدۂ خُلد ہو غم خانہ کسی کا

سَو بار غرض ہو تو پئے مانگ کے واعظ
محتاج نہیں ساقیٔ میخانہ کسی کا

آنکھوں سے کروں زُلف گرہ گیر میں کنگھی
زیبا ہے یہ مژگاں جو بنے شانہ کسی کا

دعویٰ ہے غلط شیخ و برہمن یہ تمہارا
مسجد ہی کسی کی ہے نہ بُتخانہ کسی کا

آصفؔ کا ہے یہ قول کہ جو ہے صاحبِ غیرت
احسان نہ لے ہمّتِ مردانہ کسی کا

سوزِ دل سے نالۂ پُرسوز آتشناک تھا
بُجھ گئی جب آگ پھر کچھ بھی نہ تھا کیا خاک تھا

عاشق و معشوق کے دل کی لگی میں ہے یہ فرق
شمع گھلتی ہی رہی پروانہ پَل میں خاک تھا

وہ بھی کیا دن تھے ہمیں غم سے سروکار نہ تھا
دِل کو ارمان نہ تھا جان کو آزار نہ تھا

مُنصفی شرط ہے تنہا یہ کرم غیر ہی تھے
مَیں ترے جور و ستم کے بھی سزاوار نہ تھا

ادا سے ناز سے پاس آ کے اس نے
کہا آصفؔ سے آصفجاہ تو ہے؟

رخصت کے وقت ہائے اس انداز کے نثار — انگڑائی لے کے اس نے کہا دیکھنا مجھے!
وصل کے بعد جو پوچھا کہ ارادہ کیا ہے؟ — جھک کے آنکھوں نے کہا پھر یہ تقاضا کیا ہے؟
جھگڑے تو ہزاروں ہیں مگر بات ہے اتنی — ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں
مجھ سا نہ ہوگا کوئی دو جاں رکھنے والا — اک جان میرے تن میں اک جان سامنے ہے
عرصۂ حشر کے مانند تھی نفسی نفسی — اس کی محفل میں کسی کا بھی کوئی یار نہ تھا
عاشق زار تمہارا تو وہی آصف ہے — میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا
سرخیٔ رخسار دونی ایک بوسے سے ہوئی — دیکھئے تعریف کے قابل ہے یہ تقصیر بھی
شب وصال وہ گھبرا کے صبح تک مجھ سے — یہ پوچھتے ہی رہے کوئی پیار باقی ہے
کبھی نہ دب کے ملینگے ہم ان سے اے آصف — وہ شاہ حسن سہی شہریار ہم بھی ہیں

عثمان

اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ نظام دہم، حضور کی ولادت باسعادت ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ م ۵ اپریل ۱۸۸۶ء کو ہوئی، چونکہ اس وقت داغ حیدر آباد کو نہیں پہنچے تھے اس لئے انہوں نے تاریخ ولادت نہیں کہی، البتہ حضور کی عمر شریف چار سال چار ماہ چار دن کی ہوئی تو "بسم اللہ" کا جشن منایا گیا اور "تسمیہ خوانی" کی رسم ادا ہوئی جس کی تاریخ داغ نے کہی ہے ؎

شہزادہ ہوا ہے زیب مکتب — سبحان نہ ہو ثانیٔ ولیعہد
سورۃ اقراء کی آج سن لی — سلطاں نے زبانیٔ ولیعہد
اللہ کرے کہ شاہ دیکھے — پیری و جوانیٔ ولیعہد
اس رسم کی داغ تو بھی تاریخ — لکھ تسمیہ خوانیٔ ولیعہد
۱۳
اس کے بعد ہی کلام مجید کی تعلیم کا آغاز ہوا اور رجب حضور نے

کلام اللہ پڑھ لیا تو "ہدیہ" کی رسم ہوئی اِس تقریب میں داغ نے تاریخ کہی سہ

یہ ہوئی ہدیۂ سی پارہ کی شادی ایسی ۔۔۔ جس سے لوگوں کو ہزاروں کا بٹا ہے انعام
نذر کر مصرع تاریخ یہ کہہ کر اے داغ ۔۔۔ کیا شہزادہ فلک جاہ نے سی پارہ تمام

اس کے بعد "ختنہ" کی تقریب ہوئی تو پھر داغ نے تاریخ کہی سہ

یہ شادی مبارک ہو مسعود ہو ۔۔۔ ادا ہو گئی سنتِ مصطفےٰؐ
یہ برجستہ لکھ داغ مصرع سال ۔۔۔ ولیعہد صاحب کا ختنہ ہوا

بلوغ کی رسم شاہان مغلیہ بھی کیا کرتے تھے اور شاہان آصفیہ بھی یہ رسم بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے چنانچہ حضور کی مونچھوں کا کونڈا ہوا تو داغ نے یہ قطعہ کہا سہ

خوب شادی کا یہ منڈھا چھایا ۔۔۔ نور کا جس کو آسماں کہئے
چترا قبال کیجئے تحریر ۔۔۔ ابر رحمت کا سائباں کہئے
تختۂ گلستاں اسے لکھئے ۔۔۔ چادر مہتاب ہاں کہئے
لالہ کہئے ہر اک کنول کو اگر ۔۔۔ چوب کو شاخِ زعفراں کہئے
بٹ رہا ہے طعام کوسوں تک ۔۔۔ وہیں موجود ہو جہاں کہئے
عطر بزم طرب کی خوشبو کو ۔۔۔ نگہت گلشن جناں کہئے
یہ سلیماں کا تخت ہے دوستو ۔۔۔ سبز پریاں ہے بیگماں کہئے
بینڈ باجے کی ہے صدا دلکش ۔۔۔ ایسے نغمے کو دلستاں کہئے

اس تقریب سعید پر چونکہ سہرا بھی باندھا جاتا ہے اس لئے داغ نے سہرا بھی کہا ہے سہ

سب نے جانا کہ یہ چلتا ہے زمین پر خورشید ۔۔۔ رُخ نوشہ سے جو سر کا سر توسن سہرا
شجر طور کے کیا پھول گندھے ہیں اس میں ۔۔۔ ہم نے دیکھا نہیں اس طرح کا روشن سہرا

یہ کہتی ہیں کھل کھل کے پھولوں کی کلیاں — ہمیں فخر ہے یہ ہمارا ہے سہرا
گہر لعل و یاقوت ہیرا زمرد — جواہر لگا کر سجایا ہے سہرا
خط کہکشاں سے جو بالا ہے بدہی — تو عقد ثریا پہ طرّا ہے سہرا
حُور کو بھی یہ تمنّا تھی کہ مالن بنتی — اس میں یہ شرط ہے گوندھے گی سُہاگن سہرا

حضور بندگان عالی کی تعلیم نہایت باقاعدہ ہوئی شعر و سخن کا ذوق فطری تھا کم سنی ہی سے حضور نے شاعری سے دلچسپی لینی شروع کی اور داغ کا کلام مُلاحظہ میں رہنے لگا چُنانچہ اساتذہ کے دواوین فراہم کیئے داغ کے دیوان کی نقل حاصل فرمائی اور مشاعرے میں داغ جو غزلیں پڑھتے وہ بھی طلب کر لی جاتی تھیں،

نواب حسن علی خاں امیر کے ذخیرے میں حضور کا ایک مکتوب داغ کے نام محفوظ رہ گیا ہے جس کی نقل پیش ہے،

کنگ کوٹھی

حضرت!

یہاں کے تمام مطبعوں میں اُن دواوین کی تلاش کی گئی کوئی ہمدست نہیں ہوا کیا آپ نے ہر جگہ دواوین کے لئے لکھ بھیجا ہے؟ یا مَیں اپنے یہاں سے مطبعوں کے نام لکھ بھیجوں؟ اطلاع دیجئے! اب آپ کا مزاج کیسا ہے اطلاع کی جائے، کیا کوئی نئی غزلیں تیار ہوگئی ہیں اگر تیار ہیں تو آج سہ پہر میں سوار واسطے لانے کے روانہ کروں گا، آج سہ پہر میں پانچ بجے دیوان چہارم جس میں کہ غزلیں نقل ہو رہی ہیں میرے دیکھنے کے لئے روانہ کیا جائے انشاءاللہ کل بروز

چہارشنبہ علی الصباح آپ کے پاس واپس روانہ کردونگا فقط

عثمان

غرۂ جمادی ۲ ۱۳۲۱ھ سہ شنبہ

(۱۷ ستمبر ۱۹۰۳ء)

اسی زمانے میں حضور نے اپنا کلام داغ کو دکھانا شروع کیا چنانچہ داغ جو اصلاح دیتے اس کے متعلق حضور عموماً بحث مباحثہ فرماتے اور محاورات و زبان کے متعلق استفسارات ہوتے رہتے کیونکہ حضور کو کم سنی ہی سے تحقیق و تلاش اور کاوش و جستجو کا شوق رہا ہے، حسن علیخاں امیر بیان کرتے تھے کہ داغ کے انتقال سے دو روز پہلے بھی حضور کے پانچ لفافے داغ کے پاس آئے تھے،

داغ کے انتقال کے بعد حضور غفران مکان نے اپنا کلام جلیل کو دکھانا شروع کیا اور داغ کی ایک ہزار تنخواہ کی بچت سے شاید تین چار سو روپئے ماہوار جلیل کے نام جاری فرمائے تو حضور نے بھی جلیل سے مشورہ فرمانا شروع فرمایا اور جلیل کی تنخواہ پانچ سو روپئے ماہوار مقرر فرمائی مگر جلیل کے انتقال کے بعد سے کسی سے مشورہ نہیں فرمایا اور فکر سخن بدستور جاری رہی، چنانچہ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں حضور کا کلام موجود ہے اردو کے دو دواوین شائع ہو چکے ہیں جو عام نہیں ہوئے مگر ان دواوین کے علاوہ حضور کا کلام اس قدر ہے کہ اور دو تین دیوان مردّف اور شائع ہو سکتے ہیں، حضور نے اپنے کلام بلاغت نظام کی اشاعت کے لئے ایک ٹرسٹ بنا دیا ہے، انشاء اللہ قریب میں اشاعت دواوین کا کام شروع ہوگا،

نظم کے علاوہ نثر نگاری میں بھی حضور کو خاصا ملکہ ہے اور بڑی صاف اور سلیس نثر تحریر فرماتے ہیں راقم الحروف حضور کی نظم و نثر کا ایک انتخاب کر رہا ہے جو انشاء اللہ قریب ہی میں منظر عام پر آئیگا، چند شعر تبرکاً نقل کئے جاتے ہیں ؎

محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی
ابھی حصے میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی
گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی
شب دو شنبہ کی بد مستیاں میں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گراں باقی
زبان شمع سے سنتا ہوں قصہ سوز الفت کا
شب آخر ہو گئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
خدا ہی کشتیٔ دل کا ہے حافظ بحر الفت میں
نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادباں باقی
سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یاران رفتہ کا
غنیمت ہے جواب تک ہے نشان کارواں باقی
سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

چمن دہر عنادل سے کب آباد ہوا — جو نوا سنج ہوا قیدی صیاد ہوا
اے صبا پوچھ نہ بربادیٔ تربت میری — تودۂ خاک بھی صد حیف کہ برباد ہوا

دیکھ کر چہرہ ترا ماہ درخشاں کی قسم — پھنس گئے دام میں ہم زلف پریشاں کی قسم

دیکھ اے قیس اسے جامہ دری کہتے ہیں — تار باقی نہ رہا جیبؔ و گریباں کی قسم
داغِ غم اشک کے چھینٹوں سے مٹائے نہ بنے — چند قطروں سے لگی دل کی بجھائے نہ بنے
حُسن کے رعب سے اے یار شبِ خلوت میں — شمع کی لو ہے وہ لرزاں کہ بجھائے نہ بنے

شاؔد

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنۃ بہادر، آپ راجہ چندو لال[۵۱] کے پوتے راجہ نرندر بہادر کے نواسے اور جانشین تھے، ۲۸ جنوری ۱۸۶۴ء کو تولد ہوئے تعلیم و تربیت نہایت اچھی ہوئی علوم رسمیہ سے بقدر ضرورت واقف تھے ادب اور شعر کا ذوق تھا عنفوانِ شباب سے انتقال تک برابر ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی فرماتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رکھا اپنی سرپرستی میں کئی ایک رسائل (دماہوار) جاری کئے اور سینکڑوں کتابیں تصنیف تالیف اور شائع کیں،

حیدرآباد کی علمی ادبی ترقی میں ہمیشہ کوشاں رہے سرشار، ظہیر دہلوی، اختر مینائی (اختر یار جنگ) جلیل مانک پوری (فصاحت جنگ) نجم الدین ثاقب، سہا، ترکی، فانی، ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) وغیرہ اسی سرکار کے ملازم رہے پھر مہاراجہ ہی نے ان میں سے اکثر کو سرکاری ملازمت دلوادی، جوش ملیح آبادی سے ساغر تک تمام شعراء کی رقمی امداد کرتے رہے شاید ہی کوئی بدنصیب شاعر یا ادیب ایسا ہو جو حیدرآباد آکر مہاراجہ سے متمتع نہ ہوا ہو،

داغ پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے تو مہاراجہ سے بھی ملاقات ہوئی

---

[۵۱] مدارالمہامی ۱۲۴۸ھ استعفیٰ ۱۲۶۰ھ وفات ۱۲۶۱ھ

دوبارہ آنے کے بعد زیادہ آمدورفت ہوگئی، مہاراجہ نے داغ کی کچھ مالی امداد کرنی چاہی تو داغ نے خوش اسلوبی سے ٹال دیا، مگر چند ہی روز کے بعد مہاراجہ نے اصلاح کے لئے غزل بھجوائی اور غزل کے ساتھ نذر اور فاتحہ کی رقم بھی بھجوائی اور ہمیشہ عطر کے کنٹر، ہمرو، مشرو اور کمخواب کے تھان شال وغیرہ تحفۃً بھجواتے رہے، عیدین میں بھی کشتیاں بھر بھر کر تحفے اور نذرانے بھجواتے رہے جب داغ کی تنخواہ جاری ہوگئی تو داغ نے عرض کیا آپ کی بروقت امداد سے میں نے اپنی مصیبت کے دِن کاٹ دئے ہیں اب اللہ کا فضل ہوگیا ہے اِس سلسلہ کو مسدود فرمادیجئے ضرورت ہوتو مَیں خود عرض کروں گا مگر مہاراجہ آخر تک تُحفے تحائف بھیجتے رہے،

ظہیر دہلوی بڑی بے سروسامانی سے آئے تھے داغ نے مہاراجہ سے کہہ کر انہیں کی سرکار میں مُلازم رکھوا دیا، امیر مینائی کے انتقال کے بعد اختر مینائی اور جلیل کی سفارش بھی داغ نے کی اور مہاراجہ نے دونوں کو اپنے پاس نوکر رکھ لیا،

مہاراجہ نے اپنی خودنوشتہ سوانح عمری میں اپنی شاعری اور داغ کے متعلق بڑے مزے سے لکھا ہے،

"۱۳۰۰ھ سے اِس (شاعری) کا شوق ہُوا مگر خُفیہ طور سے کچھ کہہ لیا کرتا تھا کیونکہ میرے جدّامجد اس کے لئے منع فرماتے تھے مگر بمصداق ع شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست! شگون خالی نہ جانے پائے مَیں نے یہ سوچ کر پہلے بچّو لال صاحب تمکین سے جن کا ذکر قبل ازیں ہوا ہے اصلاح سُخن کی بُنیاد ڈالی، چونکہ حیدرآباد میں اس وقت تک اُردو کا زیادہ رواج نہ

تھا اور رنگل مُہرے اس بساط کے فارسی گو تھے یہاں تک کہ معمولی چھوٹے چھوٹے منصب کے لوگ اور کم استعداد والوں کا طوطی بھی گویا بُلبل شیراز کی ہمسر کاری کا دم مارتا تھا، فارسی ہی میں مَیں نے شعر گوئی شروع کر دی نوشت و خواند میں اس وقت مشّاق ہونے کے علاوہ گفتگو بھی اچھی کر لیتا تھا چنانچہ میرا پہلا مطلع فارسی کا یہ ہے ؎

گفت کنزاً مخفیاً آمد ندائے عندلیب ہست برخوانِ حقیقت این صدائے عندلیب

علاوہ فارسی کے اُردو میں بھی ابتدا انہیں سے کی، افسوس ہے کہ تمکین صاحب کی عُمر اسّی سے متجاوز ہوگئی تھی اور بہت تھوڑے سے زمانے کے بعد ان کی صحبت سے ہمیشہ کے لئے جُدائی ہوئی اس کے بعد مَیں نے بہت دنوں تک شعر گوئی ترک کر دی مگر جب مدرسۂ عالیہ میں شریک ہُوا اس وقت میر عبد العلی والہ[1] سے مشورہ سخن رہا، اگرچہ اِس حساب سے سنہ ۱۳۱۱ھ سے مَیں نے اِس فن کا آغاز کیا ہے تا دم تحریر اکیس[2] برس کی مشق ہے مگر برائے نام، اِس سے مشق کا سلسلہ قائم نہیں رہا اور مَیں محمد مظفر الدین صاحب معلّی کو غزل دکھایا کرتا تھا یہ سرکار عالی کے پٹہ خانہ کے مددگار تھے اب نوکری چھوڑ دی ہے وظیفہ پاتے ہیں نہایت برگزیدہ فقیر منش

---

[1] والہ مدراسی بزرگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے دیوان غالب کی مختصر و مفید شرح لکھی ہے اسی شرح نے علی حیدر نظم (حیدر یار جنگ) طباطبائی کو مفصّل شرح دیوان غالب کی طرف توجہ دلائی، ۱۲

صاحب مذاق عارف باللہ ہیں،

حیدر حسین خاں حیدرؔ[1] جو میرے جدّا علیٰ چندو لال کے زمانے میں اہلِ وطن کے شعراء میں لاجواب شاعر تھے ان کے شاگردانِ رشید سے ایک ہمارے معلیؔ صاحب بھی ہیں، مشقِ سخن نے اس قدر استعداد کی کھڑکی کھلائی تھی کہ اُستاد سے تحسین کا خلعت پایا، اِس عرصہ میں حضرت داغ سلمہ کا آفتاب دکن میں چمکا، ان کے کلام کی دھوم ہوئی چو طرفہ انہیں کے کلام کے نقارے بجنے لگے در و دیوار سے انہیں کے کلام کی صدائیں بلند ہونے لگیں، اِس میں شک نہیں کہ جو کچھ اس فن کے متعلق حضرت داغ کی تعریف میں کوئی رطب اللساں ہو بیجا نہیں بلکہ اس نے دادِ سخن دی ایسی سادگی و پرکاری شعر گوئی میں دُوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتی، محاورہ ان کے گھر کی باندی ہے تو

---

[1] حیدر حسین خان حیدر شیخ حفیظ دہلوی کے بیٹے تھے، شیخ حفیظ شاہ نصیر اور ذوق کو مہاراجہ چندو لال نے حیدرآباد بُلایا تھا، ذوق تو نہ آسکے مگر شیخ حفیظ اور شاہ نصیر آگئے اور دونوں نے یہیں زندگی گزاری اور یہیں سپردِ خاک ہوئے، حیدر اپنے وقت کے اُستاد تھے جن کے سینکڑوں شاگرد تھے. فیض حیدرآبادی سے ان کے معرکے مشہور ہیں، معلیؔ انہیں کے شاگرد تھے انعام دارانِ دکن سے اور بڑے عالم فاضل بزرگ تھے مہاراجہ نے انہیں مختلف طریقوں سے نوازا تھا اور ان کے پُورے خاندان کو مُلازمتیں دیں اور تنخواہیں مقرر کر دیں، افسوس ہے کہ معلیؔ کے خاندان میں ان کی سی صلاحیتیں کسی میں پیدا نہیں ہوئیں، ۱۲

روزمرّہ لونڈی ہے، جو کہا بے مثل کہا۔ اس میدان میں انہیں کا جھنڈا علم ہوا ہے۔ یہاں ان کے زمرۂ شاگردی میں شمار کئے گئے بالآخر قسمت کا ستارہ اوج پر کمال آفتاب مشرف میں تھا، حضور تک ان کا کلام پہنچا مبارک عہد مبارک وقت میں کلام پسند آیا، قبولیت کی عزّت ملی اور اس آفتاب سلطنت کی شاگردی[1] کی عزّت داغ کو نصیب ہوئی، مدارج عزّت پایہ بہ پایہ بڑھنا شروع ہوئے میں نے بھی ابتدا میں انہیں کے سر استادی کا سہرا باندھا اس عرصے میں میری مشق اُردو میں ایک حد تک اُستاد کے اطمینان کے لائق ہو گئی تھی اتّفاقاً میں نے ایک وقت اپنی غزل پیش گاہ ظلِ سبحانی میں پیش کی، حضور نے اس کو ملاحظہ فرما کر اظہار خوشنودی فرمایا اور ایک شعر میں فاحش غلطی تھی اپنی خطاپوش نظر سے اس کی اصلاح فرمائی میں نے قدم چومے اور سرفرازی کی نذر پیش کی اور متمنی ہوا کہ شاد کو (شاد تلمیذ حضرت آصف) لکھے جانے کی عزّت ملے الحمدللہ و المنۃ کہ مدّعا مقرونِ اجابت ہوا۔"

(مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات ص۸۱، ۸۲)

عہد غفران مکان میں مہاراجہ ابتدا موروثی عہدۂ پیشکاری سے سرفراز ہوئے پھر وزیر فوج ہوئے اور پھر وزیراعظم ہوئے، حضور بندگانِ عالی کے

---

[1] شاہان مغلیہ اور آصفیہ کے دربار میں یہ طریقہ تھا کہ بادشاہ کا اُستاد شاگرد کہلاتا تھا چنانچہ داغ نے کہا ہے

آپ اپنے کو جو شاگرد کا شاگرد کہے ۔۔۔ داغ سا ہم نے تو انساں نہ دیکھا نہ سنا

عہد میمنت میں اوّلاً مدارالمہام اور آخر میں مدّت تک صدر اعظم باب حکومت رہے اور ۱۳؍ مئی ۱۹۴۰ء کو انتقال کیا، کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

فنا کہتے ہیں کس کو موت سے پہلے ہی مرجانا
بقا ہے نام کس کا اپنی ہستی سے گزر جانا

جو روکا راہ میں حُر نے تو شہ عبّاسؑ سے بولے
مرے بھائی نہ غصّے میں کہیں حد سے گزر جانا

کہا اہلِ حرم نے رو کے یوں اکبرؑ کے لاشے پر
جواں ہونے کا شاید تم نے رکھا نام مرجانا

بقا میں تھا فنا کا مرتبہ حاصل شہیدوں کو
وہاں اس پر عمل تھا موت سے پہلے ہی مرجانا

نہ لیتے کام گر سبطِ نبی صبر و تحمّل سے
لعینوں کی نگاہ خشم سے آسان تھا مرجانا

دکھائی جنگ میں صورت اُدھر جا پہنچے کوثر پر
یہ اصغرؑ ہی کی تھی رفتار ادھر آنا اُدھر جانا

یہاں کا زندہ رہنا موت سے بدتر سمجھتا ہوں
حیاتِ جاوداں ہے کربلا میں جا کے مرجانا

خیال اتنا رہے اے شادؔ دبر پا جب قیامت ہو
غمِ سبطِ نبی میں پیشِ داور نوحہ گر جانا

گھر خدا کا تھا مگر بُت اس میں آکر بس گئے
اب مرقع ہے حسینوں کا ہمارا دل نہیں

انقلابِ دہر نے اُلٹا زمانے کا ورق
اہلِ محفل وہ نہیں وہ رونقِ محفل نہیں

ہند میں چلنے لگی ہے اب ہوائے انقلاب
شادؔ سچ ہے یہ جگہ رہنے کے اب قابل نہیں

مضمر ہے بقا ہستئ عالم کی فنا میں
اک جلوۂ وحدت بھی ہے کثرت کی فضا میں

نیرنگئ انداز نظر دیکھ رہا ہوں
ڈوبی ہوئی ہے شوخ نظر شرم و حیا میں

امیر

میر حسن علی خاں نام تھا آپ کے اجداد عالمگیری امراء سے تھے جو دکن آکر جاگیرات و مناصب سے معزّز ہوئے، سلطنت آصفیہ کے قیام کے بعد آپ کا خاندان خانوادۂ آصفی سے متعلق ہوگیا اور عہد نظام علی خاں بہادر میں آپ کے جد مرشد زادۂ آفاق نواب سلیمان جاہ کے متوسل ہو گئے، امیر کی ولادت ۱۲۷۰ھ میں ہوئی، حیدر آباد ہی میں تعلیم و تربیت پائی، بچپن سے شعر و سخن کا شوق

تھا شاعری یا کبوتر بازی اور پتنگ بازی میں مصروف رہتے تھے،

داغ کے حیدر آباد آنے کے بعد خورشید عالم بھی حیدر آباد آگئے تو پتنگ بازی کے سلسلہ میں اُن سے بھی دوستی ہوگئی اور ان کی وجہ سے داغ سے بھی ملاقات ہوئی اور آمد و رفت میں دونوں کے مراسم اس قدر بڑھ گئے کہ داغ اور امیر کی دوستی ضرب المثل بن گئی، چونکہ فارغ البال اور نوکری چاکری سے بے نیاز تھے اس لئے صبح سے شام تک داغ ہی کے پاس رہتے تھے اور داغ کے انتقال تک ان کے مشیر و مددگار رہے،

امیر نہایت ہی وضع دار، شریف اور نیک بزرگ تھے اُن کے فرزند میر آصف الدین مرحوم سے میری خالہ بیاہی گئی تھیں جن کے فرزند میر یاسین علی خاں، بی اے (علیگ) انکم ٹیکس آفیسر ہیں اسی وجہ سے میری آمد و رفت امیر کے پاس بھی اور مجھ پر بزرگانہ شفقت فرمایا کرتے تھے ماہ صفر ۱۳۵۴ھ میں انتقال کیا، برادرم یاسین علی خاں دیوان مرتب کر رہے ہیں ممکن ہے کہ قریب میں طبع ہو جائے، چند شعر نقل ہیں ؎

ہمیشہ ہم ٹھہر سکتے نہیں ہیں دیر و کعبہ میں — وہیں جانا پڑیگا ہم کو رہتے تھے جہاں پہلے

رندوں کی پھر کشاکش رندانہ دیکھئے — بند ایک دن اگر در میخانہ رہ گیا

جنگل ہو کوئے یار ہو یا ہو کوئی مقام — دل لگ گیا جہاں وہیں دیوانہ رہ گیا

رُخ پہ چلمن نقاب کی دیکھو — ان کو سوجھی حجاب کی دیکھو

جوشِ مستی میں محتسب سے ہم — پوچھتے ہیں کدھر ہے میخانہ

دن گزرتا ہے بیقراری میں — رات کو کب قرار آتا ہے

کعبے کی جو عظمت ہے مرے دل کی وہی ہے — اِس گھر کا مکیں اور نہ اُس گھر کا مکیں اور

اٹھو امیر بت نے دیا ہے کہیں جواب — کیا بیٹھے باتیں کرتے ہو پتھر کے سامنے

تجلّی،

سیّد منتجب الدین نام تھا، آپ کے اجداد اورنگ بخارا کے متوطن اور وہاں کے سادات کرام سے تھے، آصف جاہ نے دکن پر تسلّط پانے کے بعد اورنگ سے آپ کے جد کو بلایا اور سیّد یار جنگ خطاب اور دُوسرے لوازمات سے سرفراز کیا، آپ کے والد میر سیادت علی خاں ناظم دیوانی بلدہ تھے، آپ کی ولادت ۱۲۸۶ھ میں حیدر آباد کے محلہ مُغلپورہ میں ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی اپنے چچا حاجی حافظ نواب سیّد بُرہان الدین خاں ناظم دیوانی بلدہ سے (جو بعد کو ہجرت کر کے مدینۂ طیّبہ جا رہے تھے) ادب اور حدیث، مولانا عبد الصمد سمرقندی سے، تفسیر، فقہ اور منطق مولوی محمد اسمٰعیل سے صرف و نحو پڑھی اور مدرسۂ دار العلوم سے تکمیل کی، پھر سلسلۂ ابو العلائیہ میں حضرت آغا داؤد رح سے بیعت کی، ابتداً فارسی شعر کہنے لگے اور آغا شوستری سے تلمذ اختیار کیا ان کے انتقال کے بعد ترک علی شاہ ترکی سے مشورہ کرنے لگے، اردو کلام ابتداً بیکش تھانوی کو دکھاتے رہے پھر داغ کے شاگرد ہوگئے داغ کے بعد مرزا منیر الدین ضیا گورگانی دہلوی سے بھی مشورہ کیا،

ابتداً مالگذاری میں کار آموز اور موعود الخدمت تحصیلدار ہوئے پھر صوبہ داری گلبرگہ میں مُلازم ہوئے اور جلد ہی ضلع رائچور کے صدر خزانہ دار (ڈسٹرکٹ ٹریژری آفیسر) ہوگئے جہاں سے ضلع عثمان آباد تبادلہ ہُوا اور پھر ضلع گلبرگہ آگئے اور وہیں ۱۶ ار اگست ۱۹۲۷ء کو اللہ کو پیارے ہو کر خواجہ بندہ نواز کے پائین میں سپردِ خاک ہوئے، راقم الحروف کے علاوہ سیّد رفیع الدین اور سیّد رشید الدین دو اور فرزند یادگار ہیں،

مرحوم کو ادب اور شعر سے خاصا لگاؤ تھا، ۱۹۰۸ء تک حیدر آباد میں

مستقل سکونت رہی اور مشغلۂ شعر و سخن جاری رہا، داغ حیدرآباد آئے تو
اُن کے پاس آمد و رفت رہی ابتداً طالب علمانہ حیثیت سے اور پھر
شاگردانہ حیثیت سے ملتے رہے، غلام حسین داد، عبدالحی بازغ، محی الدین
محفوظ، نادر علی برتر، رضی الدین کیفی، قطب الدین تسلی، غلام محمد زعم،
پاشا محی الدین وجودی وغیرہ آپ کے ساتھی تھے جو حیدرآباد میں علمی
جد و جہد اور ادبی تحریکوں کا آغاز کرتے رہے، ملازمت کی وجہ سے ۱۹۰۸ء
سے ۱۹۲۷ء تک اٹھارہ اُنیس سال تک اضلاع میں علمی تحریک کرتے
رہے چنانچہ رائچور، عثمان آباد اور گلبرگہ میں سینکڑوں شاگرد تھے اور
گلبرگہ کی موجودہ علمی فضا زیادہ تر مرحوم ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے،
تین دیوان مکمل ہیں جن کا انتخاب مَیں نے کیا ہے اگر وقت مساعد ہوا
تو انشاءاللہ شائع بھی کردوں گا، بطور نمونہ چند شعر نقل کئے جاتے ہیں

ہر وقت یہ فرماتے تھے اُستاد تجلی
یہ مری زباں ہے یہ اُڑا یا ہے مرا رنگ

جواں ہوتے ہو جتنے اس قدر جوہر نکلتے ہیں
تمہارے پاؤں کیا کیا پیٹ سے باہر نکلتے ہیں

عدو سے بزم میں سرگوشیاں دیکھی نہیں جاتیں
تمہارے گھر سے ہم اشکوں سے مُنہ دھو کر نکلتے ہیں

بھلا کس واسطے منت پذیر برق و باراں ہوں
ہمیں پہلے نہ کیوں برباد اپنا آشیاں کرلیں

دل و جاں کھو کے بیٹھا ہوں حسینوں کی محبت میں
اُٹھائے نفع کے بدلے بہت نقصان اُلفت میں

کچھ تو بُتوں کے عشق میں دیکھا جو کھوئے ہوش
دیوانہ میں نہیں ہوں بڑا ہوشیار ہوں

ولولۂ وحشتِ دِل خاک نکالے اپنا
یاں گریباں ہی گلے میں نہیں دامن کیسا

ہوا تقویٰ مرا برباد ان مخمور آنکھوں سے
ملائیں ہائے کیوں آنکھیں تری مشہور آنکھوں سے

اب نہیں سوا تیرے کوئی اے خُدا اپنا
آشنا وہ غیروں کا بن گیا جو تھا اپنا

دیکھیے بنے کیسی جان پر محبّت میں
آنکھ جنگ جو ان کی، دِل بگھڑیا اپنا

دِل آغشتۂ خوں فالتو اِک آبلہ سا ہے
انہیں یہ فکر کیا لینا مجھے یہ شرم کیا دینا

مٹا کے قبر بھی دِل کا غُبار باقی ہے
خلش یہ ہے کہ نشانِ مزار باقی ہے

وُہ جاتے جاتے کہتے ہیں مُشتاق دید کو
ہم عید کے ہیں چاند پھر آئیں گے عید کو

رسا

مرزا غلام مصطفیٰ نام ہے حیدر آباد کے شرفا سے ہیں یہیں ولادت ہوئی تعلیم و تربیت بھی یہیں پائی، ابتدا سررشتۂ امور مذہبی میں مُلازم ہوئے پھر مالگزاری میں منتقل ہو کر چند سال کے بعد محکمۂ کروڑ گیری (کسٹم) میں مُنتقل ہوئے اور مہتمم کی خدمت سے نائب نظامت کے

عُہدے تک پہنچے اور پچپن سالہ عُمر کو پہنچ کر چند سال توسیع حاصل کی پھر وظیفہ (پنشن) پر سبکدوش ہوگئے اور وکالت کرتے رہے اب کبر سنی کی وجہ سے خانہ نشین ہیں،

نہایت ہی کم سنی سے شاعری شروع کی اور داغ کے شاگرد ہوئے، حاجی ابراہیم خانساماں کے توسط سے حضور غفران مکان تک بار پایا اور تقرب حاصل ہوگیا مگر بدقسمتی سے بعض ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے کہ ڈیوڑھی کی آمد و رفت ترک کرنی پڑی، البتہ مہاراجہ بہادر کے دربار سے ہمیشہ منسلک رہے اور مہاراجہ نے آخر عُمر تک سرپرستی فرمائی،

والد مرحوم سے آپ کے مراسم بہت پُرانے اور پُرخلوص تھے جس کی وجہ سے مجھے بھی بچپن سے نیاز حاصل ہے اور مجھ پر بزرگانہ شفقت و عنایت فرماتے ہیں، پہلے رُسوا تخلص کرتے تھے بعد میں رسا تخلص اختیار کیا، شاگردان داغ میں حیدرآباد میں آپ ہی باقی رہ گئے ہیں، بڑی اچھی طبیعت پائی ہے ایک مجموعہ خیالاتِ رنگین ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوچکا ہے جس میں کلام کا انتخاب ہے اسی سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ؎

شوخی سے بچا دِل تو پھنسا دام حیا میں
سو طرح کے انداز ہیں ظالم کی ادا میں

میں وصل کا خواہاں وہ مری مرگ کے طالب
اب دیکھئے ہوتا ہے اثر کس کی دُعا میں

وحشت صیّاد و خوفِ باغباں رکھتے نہیں
ہم وہ بلبل ہیں چمن میں آشیاں رکھتے نہیں

جنکے دل گویا ہیں انکے لب پہ ہے مُہرِ سکوت
کہتے ہیں سب کچھ مگر مُنہ میں زباں رکھتے نہیں

سجلوہ سے پہلے فدائے جلوۂ جانانہ تھا
شمع سو پردوں میں تھی میں شمع پر پروانہ تھا

ناامیدی سے تباہی خانۂ دل کی ہوئی
ورنہ ارمانوں سے کیا آباد یہ ویرانہ تھا

وصل ہر چند ستمگر تجھے منظور نہیں
پر خدا چاہے تو وہ دن بھی بہت دُور نہیں

وصل کی کوئی تو تدبیر نکالی ہوتی میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں
ہر چند حُسن پر تمہیں زیبا غرور تھا ہم سے غرور شیوۂ اُلفت سے دُور تھا
دِل میں نہ تھی جو تاب و تحمّل تو اے رسا جانا ہی بزمِ غیر میں پھر کیا ضرور تھا
ان تک تو رسائی نہیں کہنے کو رسا ہے کم بخت نے یہ نام بھی بدنام کیا ہے

زعم

سیّد غلام محمّد نام حضرت مشکل آسان سیّد علی سانگڑے سُلطان کے خاندان سے تھے، ۵ محرّم ۱۲۹۵ھ کو ولادت ہوئی، مدرسۂ نظامیہ میں تعلیم پائی مولانا عبدالکریم افغانی سے تفسیر، مولوی محمد یعقوب ہندی سے فقہ، مولانا عبدالوہاب نقشبندی سے حدیث پڑھی، بچپن سے شعر و سخن کا ذوق تھا اپنا کلام میر تراب علی زور کو دکھاتے رہے اور اُستاد کے تخلّص کی رعایت سے زعم تخلّص کرنے لگے،

الفریڈ ناٹک کمپنی حیدر آباد آئی تو نوجوانانِ دکن نے ڈراما نگاری کی طرف توجہ کی اور دال منڈی میں ایک ناٹک کمپنی قائم کی گئی اس کے لئے زعم نے بھی ڈرامے لکھے اور شاید عملی حصّہ بھی لیا مگر بہت جلد ان خرافات سے نفرت ہو گئی اور کردہ و گزاشتہ کے تحت تائب ہو گئے اور نہ صرف ان خرافات کو بلکہ مُلازمت کو بھی ترک کر دیا اور ۱۳۲۳ھ سے سلسلہ رفاعیہ و نقشبندیہ میں بیعت و خلافت لے کر تبلیغ و رُشد و ہدایت شروع کر دی اسی سلسلہ میں اضلاع ممالک محروسہ سرکار عالی کے علاوہ مختلف مقامات ہند و بیرون ہند کا سفر بھی کیا، نہایت پابند اوقات بزرگ تھے، والد مرحوم سے بڑے پُر خلوص مراسم تھے اور مجھ پر بڑی عنایت تھی،

ابتداً غزل، نظم، ٹھمری سبھی کچھ کہتے رہے اور غزل کی اصلاح داغ سے

ہوتی رہی مگر آخر میں غزل گوئی ترک کر دی تھی صرف نعت کہتے تھے اپنی شاعری اور نظم نگاری سے چونکہ نفرت سی پیدا ہو گئی تھی اس لئے سارا کلام تلف کر دیا تھا، نہایت ہی مرنجان و مرنج بزرگ تھے، ۱۸ صفر ۱۳۶۱ھ کو وصال ہوا اور آپ کے لائق فرزند ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے مسلم پل کے پاس آپ کی پسندیدہ جگہ دفن کر کے ایک بڑی نفیس گنبد بنوا دی جہاں ہر سال ربیع الاوّل کے پہلے ہفتے میں بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا ہے، حضرت زعم نے خود اپنے پوتے سید شاہ تقی الدین سلمہ فرزند ڈاکٹر زور کو اپنا جانشین بنا دیا تھا اس لئے وہی سجادہ نشین ہیں، ڈاکٹر زور نے درگاہ میں ایک اسلامی کتب خانہ بھی قائم کر دیا ہے جس میں صرف مذہبی کتابیں ہیں، ہر سال عرس کے سلسلہ میں مشاعرہ بھی ہوتا ہے جس کا گلدستہ بھی شائع ہوتا رہتا ہے،

مرحوم کے کلام کے لئے ڈاکٹر زور کا ممنون ہوں کہ انہوں نے فراہم کر دیا جس سے چند شعر نقل ہیں ؎

چلنے مقتل کو وہ تیار ہوئے ہیں کہ نہیں
قائل شوق دل زار ہوئے ہیں کہ نہیں

شیشہ و جام و مئے و نقل و چمن بے ساقی
آپ ہی دیکھئے بیکار ہوئے ہیں کہ نہیں

یا میرے گھر میں وعدہ فراموش آ کبھی
یا اپنی بزم ناز میں مجھ کو بلا کبھی

افسوس ایک حال پہ اپنا نہیں مزاج
یہ خوش رہا کبھی تو رہا بدمزا کبھی

واقف نہیں رقیبوں کی عیاریوں سے آپ
یہ جو فروش ہیں کبھی گندم نما کبھی

ہوتا نہیں نوشتۂ قسمت کا انقلاب
مٹتا نہیں لکھا ہوا تقدیر کا کبھی

پٹی پڑھائی ہو گی کسی دن رقیب نے
آگے مزاج آپ کا ایسا نہ تھا کبھی

ممنون چارہ گر نہ ہوا درد شکر ہے
اچھا ہوا کہ میں جو نہ اچھا ہوا کبھی

کیا واقعی وُہ آئیں گے یا طنز سے کہا قاصد نے ایسا مژدہ سُنایا نہ تھا کبھی
ہم نے بھی زعم ان کو سزا دی تھی ایک دن باندھے تھے ہاتھ ان کے لگا کر حنا کبھی

زعم کا ایک خمسہ ظفر کی غزل پر بہت مشہور ہوا جس کا ایک بند یہ ہے ؎

کیا ہے چاک وحشت نے ہمارے جیب و داماں کو ملایا آرزو نے خاک میں عشرت کے ساماں کو
نہ پایا ہم نے جب اس غیرت شمع شبستاں کو جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہ سوزاں کو
جگر کو سینہ کو پہلو کو دل کو جسم کو جاں کو

سجادہ

حضرت شاہ زین العابدین کنج نشین، نام تھا ۱۲۹۹ھ میں بیدر میں تولد ہوئے بیدر کے مشہور بزرگ حضرت شاہ زین العابدین کنج نشین عبیدی کی اولاد سے تھے، حیدرآباد کے مشہور بزرگ چندا شاہ صاحب آپ کے چچا تھے آپ نے مولوی عبد الحلیم اعظم گڑھی سے صرف و نحو، اصول فقہ اور مولوی عبد القادر صوفی سے اصول و حدیث پڑھی اور پھر ۱۳۲۰ھ میں یوپی پہنچ کر مولانا نذیر حسین دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی سے استفادہ کیا اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے صحاح ستہ بھی پڑھی،

بچپن سے شعر و سخن کا ذوق تھا اٹھارہ سال کی عمر ۱۳۱۷ھ میں داغ کے شاگرد ہوئے اور داغ کے انتقال تک اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا، حیدرآباد میں دو لڑکیاں بیاہی تھیں اس لئے ان سے ملنے اکثر آتے رہتے تھے نہایت زندہ دل، نیک نفس، سادہ مزاج، پابند شرع بزرگ تھے، تین ایک سال ہوئے مجھے نیاز حاصل ہوا اور چار چھ بڑی تفصیلی مُلاقاتیں رہیں نہایت ہی منکسر مزاج اور سیدھے سادھے بزرگ تھے، داغ کے

خطوط آپ کے پاس بہت تھے جو ضائع ہو گئے پانچ خطوط میں نے "زبانِ داغ" میں چھپوائے ہیں، موصوف کے کلام پر داغ کی اصلاحیں نگار کے داغ نمبر میں شائع ہو چکی ہیں، دیوان مکمل ہو چکا ہے مگر شائع نہ ہو سکا،

اِس کتاب کی ترتیب کے سلسلہ میں حضرت نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور داغ کے اپنے حالات لکھ کر بھیجنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا میں اس وعدے کا انتظار کر رہا تھا کہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۵۶ء میں اطلاع ملی کہ بیدر شریف میں حضرت کا وصال ہو گیا، خداوند عالم کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، نمونتہً چند شعر پیش ہیں

ڈھٹائی دیکھئے انکی مرا دل لے کے کہتے ہیں
سوا اس لوتھڑے کے آپ نے مجھ کو دیا کیا تھا

تمہیں سے پوچھتے ہیں ہم تمہیں انصاف سے کہدو
نہ تھا دِل میرا مٹھی میں تو پھر تم نے لیا کیا تھا

آنکھوں آنکھوں میں وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں
کچھ نئی طرز سے وہ جلوہ دکھا دیتے ہیں

حضرت عشق کی نیرنگیاں اے دِل ہیں نئی
گاہ خوش کرتے ہیں اور گاہ رُلا دیتے ہیں

انہیں کیوں دیکھ کر سجاد تیرا دم نکلتا ہے
ارے وہ ہیں حسیں کیسے جو تیرا دل مچلتا ہے

بیان ہجر ہے جانکاہ ہم سنتے نہیں اس کو
تری باتوں سے سجاد ہمارا دِل مچلتا ہے

مثالِ حشمِ مجنوں پریشاں حال پھرتے ہیں
کبھی ہم گھر میں آتے ہیں کبھی باہر کو جاتے ہیں

سر پہ قرآن گلے میں مرے زنار رہا
زاہدا دیکھ مجھے میں ہوں مسلماں ایسا

گھر سے باہر کہیں نکلو یہ تماشا دیکھو
دِل کو تھامے ہوئے اِک عاشق ناشاد آیا

اِس کو خندان دیکھ کر خندان رہا جام شراب
شیشۂ گریاں مرے گریہ پہ گریاں رہ گیا

پہلے جو رازداں تھے گئے ان کو آپ بھول
اب رازداں بنے ہیں مری جاں نئے نئے

زیب بدن وہ دیکھ کے اسکی قبائے چست
ہوتے ہیں روز چاک گریباں نئے نئے

عزیز

نواب عزیز یار جنگ ابن نواب مشرف جنگ فیاض، آپ کا خاندان قدیم اور صاحب اقتدار رہا ہے آپ کے والد حیدر آباد کے بڑے اچھے شاعر اور شمس الدین فیض کے ارشد تلامذہ میں تھے، آپ کی ولادت ۱۲۹۰ھ میں حیدر آباد میں ہوئی اور تعلیم و تربیت بھی یہیں ہوئی، بچپن سے شاعری کا شوق تھا، چونکہ داغ کا رنگ بہت پسند تھا اس لئے ان کے شاگرد ہو گئے اور اپنے آپ کو اُستاد کے رنگ میں رنگ لیا، داغ افضل گنج میں تھے کہ عزیز نے شاگردی اختیار کی اور اُستاد کی خدمت میں بہت آنے جانے لگے، جب داغ تُرپ بازار میں منتقل ہوئے تو عزیز چونکہ ان کے گھر کے پیچھے اپنے خُسر آصف نواز الملک کے گھر میں رہتے تھے اس لئے زیادہ وقت اُستاد کے پاس گزارنے لگے، اور اُستاد سے بہت فائدہ اُٹھایا، داغ بھی انہیں بہت چاہتے تھے،

نہایت ہی پُر گو اور خوش گو تھے تین چار دیوان ایک واسوخت طبع ہو چکی ہے ڈاکٹر زور نے ایک انتخاب بھی بڑا ہی عمدہ شائع کیا ہے، ہمارے خاندان سے چونکہ قدیم مراسم اور والد مرحوم سے پُرانی دوستی تھی اس لئے مجھ پر بہت مہربان تھے، مجلہ مکتبہ حیدر آباد میں ایک صاحب نے آپ کی واسوخت شائع کرنی چاہی تو آپ کے خط کا نمونہ شائع کرنے کے لئے مجھ سے آپ کا ایک عنایت نامہ جو میرے اپنے نام تھا مانگ لیا اور اس مضمون میں اس طرح شائع کیا گویا انہیں کے نام یہ خط ہے یہ مضمون اکتوبر ۱۹۲۸ء کے مجلۂ مکتبہ میں طبع ہوا جسے دیکھ کر آپ مجھ سے خفا ہو گئے کہ یہ خط میں نے تم کو لکھا تھا تمہارے خاندان سے جو مراسم میرے ہیں ان کے

اور تمہارے تعلق سے یہ بے تکلفانہ تحریر تھی اسے کسی اجنبی نے اس طرح شائع کیا ہے کہ گویا اسی کا موسومہ ہے، اب تم اس رسالہ میں اعلان کردو کہ یہ خط اس شخص کے نام نہیں بلکہ تمہارے نام لکھا گیا تھا میں نے بڑی ہی ترکیب سے غصہ فرو کیا،

آپ نہایت ہی شریف الطبع نیک نہاد اور مرنجان مرنج بزرگ تھے آخر عمر میں یورپ کا سفر بھی کیا تھا ۱۸ فروری ۱۹۴۹ء کو انتقال کیا،

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

کچھ تواضع کچھ عنایت چاہیئے — آدمی اچھے سے اچھا کیوں نہ ہو

خموشی سے میری بہت کام نکلے — سمجھتا نہیں کوئی کیا چاہتا ہوں

وضع داری گلا دباتی ہے — منہ سے نالے نکل نہیں سکتے

کچھ اس طرح مرے لب پر خدا کا نام آیا — ہوا یہ شور کہ موسیٰ کا ہم کلام آیا

محبت تیری کیا تیری وفا کیا — ذرا پھر تو کہو تم نے کہا کیا

مٹ جائے دل سے لذت آزار جھوٹ جھوٹ — ٹل جائے سر سے ہجر کی آفت غلط غلط

نالۂ دل ہمنوائے لحن مرغ نخل طور — سیل اشک دیدۂ تر آبشار نغمہ ہے

کیا خبر کیا کہتی پھرتی ہے گلستاں میں صبا — پھول کی ہر پنکھڑی مست بہار نغمہ ہے

راہ منزل گم اگر ہو جائے گی — خود طبیعت راہبر ہو جائے گی

جائے گی کیونکر محبت کی خلش — نوک مژگاں نیشتر ہو جائے گی

سرد آہیں دم بدم اچھی نہیں — آہ دل کی تیز تر ہو جائے گی

کر چکے پامال فتنے اٹھ چکے — بیٹھ بھی جاؤ نظر ہو جائے گی

جھوٹے وعدے پر تھی اپنی زندگی — اب تو وہ بھی آسرا جاتا رہا

کیفی

سید رضی الدین حسن نام تھا مولوی نظام الدین احمد کے فرزند حیدرآباد کے قدیم اور شریف خاندان سے تھے ۱۴ شعبان ۱۲۹۷ھ کو ولادت ہوئی مدرسۂ دارالعلوم میں تعلیم پائی مگر تیزیٔ طبع نے تکمیل کی مہلت نہیں دی مولوی نادر الدین، شیخ ابوبکر بن شہاب، مولوی جمال الدین نوری، مولوی عبدالقدیر حسرت جیسے اساتذہ کی شاگردی سے مشرف تھے،

بچپن سے شعر و سخن کا ذوق تھا محلّہ مغلپورہ شروع ہی سے شرفا اور اہل علم کا مسکن تھا کیفی بھی اسی محلّہ میں پیدا ہوئے والد مرحوم سے ہم محلّہ ہونے کی وجہ سے دوستی ہوگئی اور اتنے مراسم بڑھے کہ دونوں ساتھ ساتھ رہنے لگے اور شاعری بھی ہونے لگی، کیفی نے ابتدا حفیظ الدین پاس کو غزل دکھانی شروع کی پھر میکش تھانوی کے شاگرد ہوگئے میکش ہی نے اپنے تخلّص کی رعایت سے کیفی تخلّص دیا اور یہ میکش کی وفات تک انہیں کو غزل دکھاتے رہے، ابتدا نظم جمعیت، پھر پولس میں ملازم ہوگئے مگر جلد ہی نوکری چھوڑ دی انتقال سے ۲ دو سال پہلے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں تقرر ہوا جہاں بڑی ہی بددلی سے کام کرتے رہے اور دوسرے ہی سال اجمیر شریف کے عُرس میں جاکر ۲۵ مارچ ۱۹۲۰ء (۱۵ رجب ۱۳۳۸ھ) کو اللہ کو پیارے ہوگئے اور اجمیر ہی میں سپرد خاک ہوئے، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ۲ دو دلی دوست دو خواجگان کے قربت میں ہیں تجلّی خواجہ بندہ نواز کے قریب گلبرگہ میں اور کیفی خواجہ غریب نواز کے قریب اجمیر میں آسودہ ہیں، کیفی کے انتقال کے وقت ان کے والد زندہ تھے جو اکلوتے بیٹے کی وفات سے بُزدل ہوکر ہجرت کرکے مکّہ معظمہ

چلے گئے اور وہیں ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو وفات پائی،
کیفی کے ایک صاحبزادے میرے ہم عمر سید شمس الدین علم ہیں جو نہایت لاوبالی آدمی ہیں،
کیفی عجیب و غریب طبیعت کے بزرگ تھے نہایت ہی وضع دار، شریف، ملنسار، متواضع، خلیق اور منکسر مزاج مگر ساتھ ہی ساتھ حد درجہ لاوبالی، متلوّن ذہانت و طباعی کے باوجود حد درجہ کاہل اور غیر مآل اندیش نہ تو اپنی زندگی عمدگی سے بسر کی اور نہ اولاد کی تربیت کی، طبیعت میں خود روپن بہت تھا، والد مرحوم نے آخری زمانے میں داغ کا شاگرد کرا دیا تھا تقریباً دو سال تک داغ کو اپنا کلام دکھاتے رہے اور داغ کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی، غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی، ہر صنف میں کہتے اور خوب کہتے تھے پُر گو تھے جس کی وجہ سے بے اعتدالی پیدا ہو گئی تھی، مشاعرہ کا طرحی مصرع آتا تو تینتیس چالیس شعر کی غزل کہہ کر شاگردوں کو دیدیتے کہ گیارہ شعر ہمارے لئے چھوڑ کر بقیہ تم لوگ لے لو، شاگرد اچھے شعر چُن لیتے اور بھرتی کے شعر آپ کے حصّے میں آتے اسی وجہ سے شاگردوں کی طبیعت بھی صلاحیت پذیر نہ ہوتی تھی چند ہی شاگرد اچھے نکلے ورنہ بیشتر شاگردوں کی شاعری کیفی کے ساتھ ختم ہو گئی، بہبود علی صفی اور نگ آبادی نے آخری زمانے میں شاگردی اختیار کی اور سال ڈیڑھ سال بھی اصلاح نہ لی تھی کہ کیفی کی موت نے یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا مگر صفی مرنے تک کیفی کی شاگردی پر نازاں رہے، میں نے بھی ابتداءً کیفی ہی سے مشورہ کیا ہے ان کے انتقال کے بعد البتہ نواب محمد علی خاں ناظم کو غزل دکھاتا رہا،

اگر کیفیؔ زیادہ عمر پاتے تو بہت اُبھرتے ان میں بڑی صلاحیت تھی افسوس ہے کہ ترپن چوّن سال سے زیادہ عمر نہ پائی، ایجوکیشنل کانفرنس نے دیوان کی طباعت کے لئے ایک رقم دی تھی مگر ان کے ایک شاگرد نے دیوان کو کھٹائی میں ڈال دیا اور پندرہ سال کے بعد منتشر اوراق تقسیم ہوئے، سردار علی مرحوم نے چند انتخاب اور ڈاکٹر زور نے ایک انتخاب شائع کیا ہے، یہی ان کا سرمایۂ شعری منظرِ عام پر آیا، چند شعر نمونتہً نقل کئے جاتے ہیں ؎

جیسے کہ سونے والا ہے کوئی ہمارے پاس — بستر پہ لیٹتے ہیں جگہ چھوڑ چھوڑ کر
میں ہوں کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں — ہر چیز رکھ کے بھول گیا ہوں مگر کہیں
کیفیؔ شراب خانہ ہی نکلا نصیب سے — رستہ سمجھ کے آئے تھے ہم خانقاہ کا
تم غیر کو دیکھو جو محبت کی نظر سے — تڑپے کہ نہ تڑپے کوئی ترسے کہ نہ ترسے
کون اس برسات میں آتا ہے کیسا انتظار — سو رہو کیفیؔ کہ آدھی رات کی نوبت جھڑی
چمن کا پھول میخانہ کا شیشہ چرخ کا تارا — کوئی ٹوٹی ہوئی شئے ہو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

دیارِ اُلفت کے رہنے والوں کا حال کیا پوچھتے ہو ہم سے
کسی کو خانہ بدوش دیکھا کسی کو خانہ خراب پایا

اتنی سی بات کے لئے یہ دار و گیر کیوں — میں کیا مرے گناہوں کا یارب شمار کیا
خفا ہونا بگڑنا روٹھنا انجان ہو جانا — تری ان ٹیڑھی باتوں کو بھی ہم نے بانکپن جانا
گیا وہ وقت کہ روتے تھے آٹھ آٹھ آنسو — اور اب تو ہوش بھی دو دو پہر نہیں آتا
رقیب کیوں مری ذلت کی فکر کرتے ہیں — ذلیل ہونے میں کچھ مجھ کو عار بھی تو نہیں
دینے والے تیرے اس اندازِ بخشش کے نثار — جسکے میں لائق نہ تھا وہ لکھ دیا تقدیر میں
ہزاروں بار یوں گھر سے نکل آتے ہیں ہم باہر — نکلتا ہو کوئی جیسے کسی کے خیر مقدم میں

دل آیا ہے ہمارا جب کسی پر ٹوٹ کر آیا | طبیعت جب کسی پر آئی ہے بے اختیار آئی
مجھے منظور ہے محشر کے میلے کی جو تیاری | دُرِ اشکِ ندامت ٹانکتا ہوں اپنے من پر

ناظم

میر محمد علی خاں نام تھا، حضرت ناصر کے فرزند اور نواب صولت جنگ عابد کے بھانجے تھے، ۱۳۰۷ھ میں تولد ہوئے، حیدرآباد ہی میں تعلیم و تربیت پائی، عربی، فارسی، انگریزی سے بقدر ضرورت واقف تھے فارسی، اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، فارسی ترکی کو دکھاتے تھے اور اردو میں داغ سے مشورہ کرتے تھے صرفخاص مبارک میں ملازم تھے بگھی خانہ آپ کے تفویض تھا،

یوپی کے رہنے والے ایک بزرگ احمد علی ناحی کوٹلہ عالی جاہ میں رہتے تھے جن سے ہم لوگ بتّو ٹیے کی حیثیت سے واقف تھے مگر ناظم ان کے مرید اور خلیفہ تھے ان کا وصال ہونے کے ایک عرصے کے بعد سنا ہے کہ ناظم نے خواب دیکھا کہ انہوں نے ترکِ لباس اور گوشہ گیری کا حکم دیا ہے جس کی بنا پر ناظم نے ملازمت چھوڑ کر رنگین کپڑے پہن لئے اور مکہ مسجد کے سامنے ایک علگی میں عطر کی دوکان کھول لی، اِس طرح چند روز گزار کر ۱۳۵۴ھ میں انتقال کیا،

نہایت وضع دار، شریف الطبع بورگ تھے کیفی کے انتقال کے بعد میں نے اپنا کلام ناظم ہی کو دکھایا ہے جب انہوں نے ترک لباس کیا تو میں نے بھی تُک بندی ترک کردی،

جنگ عظیم کے زمانے میں عثمان گزٹ کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا ایک آدھ ناول بھی چھپوایا اور چند رسالے عروض پر بھی شائع کئے تھے دو دیوان مکمل تھے ان کے ایک صاحبزادے مرفوع القلم ہیں

نہ جانے کہاں پھینک دیا، افسوس ہے کہ میرے پاس بھی جتنا کلام تھا تلف ہوگیا چند شعر جو یاد رہ گئے درج ہیں ؎

ادھورا آج بھی قاصد نہ کام کرکے پلٹ ۔۔۔ ادا تمام ہمارا پیام کرکے پلٹ
رُکی جو تیغ تو ناظم رگِ گلو نے کہا ۔۔۔ ذرا سا کام ابھی ہے تمام کرکے پلٹ

ذرا سے دل کو دعویٰ ہے بڑا عشق و محبّت کا ۔۔۔ الٰہی یہ بھی ادنیٰ ہے کرشمہ تیری قُدرت کا
ہُوا ہے اب تو یہ نقشہ عزیزوں کی محبّت کا ۔۔۔ کہ ہوتا ہے گماں صُبحِ وطن پر شامِ غُربت کا
ملے کیا خاک پُوری طرح سے راحت زمانے میں ۔۔۔ کہ لکھا تک نہیں جاتا ہے مل کر لفظ راحت کا
جبیں پر ہے شکن ابرو پہ بل آنکھوں میں غصّہ ہے ۔۔۔ بنا ہے کیا بُرا نقشہ تمہاری اچھّی صُورت کا

واصفی

عبدالصمد نام تھا حیدرآباد کے قدیم شرفا سے تھے مُلّا عبدالقیوم مرحوم کے خاندان سے قرابت تھی بڑے ہی مسکین اور شریف الطبع تھے، بارہ سال تک اُستاد کی صحبت میں رہے، شعر خوب کہتے تھے، والد مرحوم سے برادرانہ مراسم تھے، ایک زمانہ میں جبکہ میں محلہ عثمان پورہ اور محلہ سُلطان پورہ میں رہتا تھا، میرے پاس بہت تشریف لاتے اور داغ کے قصّے سُناتے تھے، دو تین دیوان مکمل موجود ہیں، ۱۰ر نومبر ۱۹۴۱ء کو انتقال کیا، دو تین فرزند موجود ہیں ہر ایک سے میں نے اُن کا کلام مانگا مگر کسی نے نہ دیا مجبوراً تذکرۂ سخنوران دکن اور کتاب داغ سے یہ شعر نقل کر رہا ہوں ؎

سر اپنا کعبہ کے در پر بھی مدّتوں رکھا ۔۔۔ بُتوں کے در پہ بھی گھستے رہے جبیں برسوں
وُہ بیقرار ہوں مجھ کو کریں گے دفن جہاں ۔۔۔ تو زلزلے میں رہے گی وُہ سرزمیں برسوں
لے کے تم جسکو ملا کرتے ہو بے دردی سے ۔۔۔ وُہ نہیں غنچۂ گُل دل ہے تمنّائی کا

وقت مے نوشی ہمارے کام میں تھے دونوں ہاتھ   دست ساقی ایک میں اور ایک میں پیمانہ تھا

یہ مطلب تھا کہ اظہار تمنا ان پہ ہو جائے   انہیں تصویر میں نے خط میں کھینچ کر بھیجی دل کی
زمانے سے ہے وصل یار کی اے آصفی حسرت   خدا جانے بر آئے آرزو کس دن مرے دل کی

شوخی غضب ہے اس نگہ برق تاب کی   رگ رگ میں چھیڑ ہونے لگی اضطراب کی
کھلتے ہی آنکھ ہو گئی پنہاں کسی کی شکل   اچھی وہی تھی جو مری حالت تھی خواب کی
حاصل سوائے وصل کے گو کچھ نہ ہو مجھے   ہے صرف ان لبوں سے تمنا جواب کی
اچھا کیا جو خاک کیا مجھ کو آپ نے   دامن جھٹک کے کیوں مری مٹی خراب کی
جو رات دن ہیں عیش و مسرت میں آصفی   ان کو ہو کیا خبر مرے حال خراب کی

کیوں اپنی جان عشق میں دیتا نہ آصفی   لازم یہی تھا ایسے وفادار کے لئے

اے خیال یار جب تک تو نہ تھا کچھ بھی نہ تھا   دل میں آتے ہی ترے ہنگامہ آرائی ہوئی

نکالوں کیونکر خیال ان کا بھلاؤں کس طرح ان کو ناصح
جو میری آنکھوں میں بس رہے ہیں جو میرے دل میں سما رہے ہیں

مانگوں شب فراق کسی مست خواب سے   تھوڑی سی نیند دیدۂ بیدار کے لئے
بجلی کی کھینچ کر اسے تصویر بھیج دوں   اظہار اضطراب دل زار کے لئے

داغ کے احباب

داغ کو دوستی کرنے اور دوست بنانے کے فن میں بڑا کمال تھا وہ تو دشمن کو بھی دوست بنا لیتے تھے، حیدر آباد آنے کے بعد انہوں نے ہزاروں دوست پیدا کر لئے تھے، دہلی والے جو حیدر آباد میں تھے ان کے دوست ہی

تھے اور یو پی والوں سے بھی ان کی دوستیاں تھیں اور جن لوگوں سے دوستی نہ تھی یہاں آکر انھوں نے پیدا کرلی تھی، حیدر آبادیوں کو تو انھوں نے بڑی عمدگی سے مسخر کیا تھا، سوا چند حاسدوں کے کوئی ان سے ناراض نہ تھا،

شاگردوں کو داغ دوست بنا لیتے تھے چنانچہ میر حسن علی خاں امیر، ابوالحمید آزاد، ظہور علی وکیل، مُنتجاب خاں خلق، تجلی، واصفی، عزیز یار جنگ عزیز، بارق اور محبّ حسین توخیر ان کے شاگرد تھے مگر میر محمود علی، میر مردان علی، لُقمان الدولہ، محبوب یار جنگ، داور الملک، (داور مرزا) راجہ گردھاری پرشاد باقی، مولوی فضل حق، ڈاکٹر احمد علی، وغیرہ شاگرد نہ تھے مگر داغ کے گہرے دوست اور بے تکلف تھے،

والد مرحوم فرماتے تھے کہ روزانہ صبح سے شام تک داغ کے پاس کم از کم پچاس ساٹھ آدمی ضرور آتے تھے جن میں زیادہ تعداد شاگردوں کی ہوتی تھی اور بقیہ بے تکلف دوست ہوتے تھے، ان شاگردوں اور دوستوں سے داغ کو پوری ہمدردی تھی چنانچہ میر محمود علی، میر مردان علی، حسن علی خاں امیر، دُود احمد خاں وغیرہ کے خانگی معاملات میں بھی داغ دلچسپی لیتے تھے اور یہ لوگ بھی اسی طرح داغ کی خانگی زندگی میں دخیل تھے، یہ روزانہ کے حاضر باش تھے جی تو چاہتا ہے کہ داغ کے دوستوں کا زیادہ سے زیادہ حال لکھوں مگر گنجائش کی کمی کی وجہ سے مجبور ہوں اس لئے صرف چند کا حال لکھتا ہُوں،

سیّد ظہیر الدین ظہیر دہلوی، سیّد جلال الدین حیدر کے بیٹے اور دلی کے شرفا سے تھے، ان کے والد بڑے اچھے خوشنویس اور بہادر شاہ ظفر کے اُستاد تھے جنہیں مرصع رقم خطاب تھا خود ظہیر کم سنی ہی سے شاہی ملازم اور راقم الدولہ خطاب سے سرفراز تھے، چودہ برس کی عُمر سے شاعری شروع کی

اور ذوق کے شاگرد ہو گئے غدر ۱۸۵۷ء میں دلّی سے نکل کر جھجھر، سونی پت، نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی تک پہنچے ارادہ تو لکھنؤ کا تھا مگر وہاں کے حالات ابتر سُنے تو رام پور کا رُخ کیا جہاں داغ نے انہیں نواب رامپور کے داماد کی سرکار میں مُلازم رکھا دیا، چار برس رام پور میں رہ کر دہلی پہنچے اور محکمۂ چُنگی میں مُلازمت کر لی پھر بلند شہر جا کر اخبار جلوۂ طُور کے اڈیٹر بنے، مہاراجہ شیو دھان سنگھ والئ الور نے اخبار کو پسند فرما کر ظہیر کو الور بُلا لیا اور چار برس الور میں بھی بسر ہوئے مگر ریاستی سازش کا شکار ہونا پڑا، اِس لئے الور سے دہلی پہنچے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور پولس میں مُلازم ہو گئے، تقریباً اُنیس ۱۹ سال جے پور میں بسر کئے والئ جے پور کے انتقال کے بعد وہاں سے بھی نکلنا پڑا چونکہ نواب محمد علی خاں والئ ٹونک مدّت سے بُلا رہے تھے اس لئے ٹونک پہنچ گئے نواب نے بڑی عزّت سے رکھا ان کے انتقال کے بعد نواب ابراہیم خاں نے وظیفہ دیدیا اور پندرہ ۱۵ سال ظہیر نے الور ہی میں بسر کئے اس کے بعد حیدرآباد پہنچے، قیام تو دار الشفا میں کسی عزیز کے گھر کیا مگر داغ ان کی مالی امداد کرتے رہے اور پھر مہاراجہ کشن پرشاد سے سفارش کر کے ان کی سرکار میں مُلازم رکھا دیا،

داغ نے ظہیر کے لئے بہت کوشش کی مگر بد نصیبی سے شاہِ دکن کی بارگاہ سے کوئی تنخواہ نہ ہو سکی، آخر تک مہاراجہ ہی اُن کی پرورش کرتے رہے، ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا اور میر مومن کے دائرے میں دفن ہوئے،

تاریخ ادب اُردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا عسکری، مطبوعۂ نولکشور میں لکھا ہے،

"آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا ٹونک سے
رخصت لے کر حیدر آباد آ گئے جہاں آٹھ مہینے کے قیام کے بعد
باریابی ہوئی مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے
ساری امیدوں کا خاتمہ کر دیا"

(تاریخ ادب اردو طبع اوّل ص ۳۷۳)

حقیقت یہ ہے کہ ظہیر ۱۹۰۳ئہ میں حیدر آباد پہنچے اور ۱۹۱۱ئہ میں انتقال کیا آٹھ مہینے نہیں بلکہ آٹھ سال انہوں نے حیدر آباد گذارے اہل دکن کو ان کی باریابی کی کوئی اطلاع نہیں ہے، خوش نصیبی سے مجھے ظہیر کی خدمت میں نیاز حاصل رہا ہے ترکی کے ساتھ وہ غریب خانہ پر بہت آتے تھے ان کے ایک نواسے بشیر سے بھی میرے مراسم ہو گئے تھے جن کی وجہ سے میں بھی اُن کے گھر پر جایا کرتا تھا،

والد مرحوم کو ظہیر سے بہت خلوص تھا اور وہ اُستاد کی طرح اُن کا احترام کرتے تھے کیونکہ خود داغ بھی ظہیر کا ادب و احترام کرتے تھے والد فرمایا کرتے تھے کہ داغ ظہیر کو بھائی پکارتے تھے اور ان کی موجودگی میں کسی طوائف کو آنے نہ دیتے تھے، ظہیر داغ کو بھائی صاحب پکارتے اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے،

ظہیر کے حیدر آباد آنے کے چند مہینے کے بعد کیفی نے ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں داغ تو شریک نہ ہو سکے مگر ظہیر، مولانا شبلی وغیرہ شریک تھے والد مرحوم نے طرح میں مقطع کہا تھا ؎

دم غنیمت ہیں تجلی ہند میں داغ و ظہیر
کوئی ایسا شاعر شیریں زباں ہوتا نہیں

ظہیر کے تین دیوان طبع ہو چکے ہیں آخری دیوان ان کے بڑے نواسے

بشیر کے پاس تھا جو چار پانچ سال ہوئے حیدر آباد ہی میں انتقال کر گئے ان کے چھوٹے بھائی شوق اب دہلی میں ہیں ممکن ہے کہ ان کے قبضے میں ہو،
حیدر آباد ہی میں ظہیر کے سینکڑوں شاگرد ہوئے نادر علی برتر، حاجی وزیر رنگ، فقیر احمد فقیر وغیرہ بڑے تیار شاگرد تھے برتر کے سینکڑوں شاگرد ہوئے جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے،

ظہیر امامیہ مذہب کے پیرو تھے مگر نہایت ہی وسیع القلب تھے وفات بھی معمور رہتے علم مجلس کے ماہر اور بڑے ہی پابند وضع تھے، تھے تو ذوق کے شاگرد مگر مومن کے گرویدہ اور متتبع تھے چنانچہ اس قسم سے شعر بہت کہتے تھے؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھے جب کہ ظہیر   سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

جب کبھی غریب خانہ پر تشریف لاتے مومن کا کلام سناتے اور ادق اشعار کا حل بھی کرتے جاتے میں نے مومن کا کلام سب سے پہلے ظہیر ہی کی زبان سے سنا ہے اور بیشتر شعر جو سمجھ میں نہیں آئے انہیں سے حل کئے ہیں،

ظہیر نے ایک روزنامچہ غدر بھی مرتب کیا تھا جو مدت ہوئی طبع ہو کر ناپید ہو چکا تھا اب آزادی ہند کی صد سالہ یاد مناتے ہوئے پاکستان والوں نے اسے پھر شائع کیا ہے،

۱۲۷۹ھ میں نگارستان کے نام سے ذوق، مومن اور غالب تینوں کے دواوین کو ایک جگہ مرتب کر کے ظہیر نے چھپوایا تھا اور آخر میں کچھ کلام بہادر شاہ ظفر کا اور کچھ اپنا بھی شریک کر دیا تھا جس میں یہ شعر بھی تھے؎

جہاں میں بس اب جی کے کیا کیجئے   کوئی جی بہلنے کا ساماں نہیں
وہ اگلی سی وحشت وہ جوش جنوں   وہ سر اور وہ سنگ طفلاں نہیں

وُہ رمز و کنایہ وُہ شعر و سُخن — وُہ ہم بزمئ بزم یاراں نہیں
وُہ یاروں کا مل بیٹھنا ہائے ہائے — وُہ مذکور رشک رقیباں نہیں
کہاں ہم ظہیر اور فکر غزل — جز ایمائے داغِ سخنداں نہیں

گرامی

شیخ غلام قادر نام تھا، والد کا نام شیخ سکندر بخش تھا جو شہر جالندھر کے خوش باش اور نیل کی رنگائی کے کارخانوں کے مالک تھے، ۱۸۵۶ء میں گرامی پیدا ہوئے، جالندھر ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ ختم کیا ہی تھا کہ والد کا انتقال ہوگیا اور ان کے بہنوئی شیخ غلام احمد ترک علی شاہ ترکی قلندر نے اپنے سائیہ عاطفت میں لے لیا اور تعلیم دلاتے رہے ترکی خود بڑے اچھے شاعر تھے ان کی صحبت میں گرامی کی موزوں طبعی بھی چمکی اور گرامی نے بھی شاعری شروع کردی اور مست تخلص کرنے لگے چونکہ جالندھر میں مزید تعلیم کا انتظام نہ تھا اس لئے جالندھر سے لاہور پہنچ کر اورنٹیل کالج میں شرکت کی، اور منشی فاضل کا امتحان اعزاز سے کامیاب کیا اور پھر وکالت کا امتحان بھی دیا مگر قانون سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اس لئے سند لی اور نہ وکالت کی،

قیام لاہور کے زمانہ میں ٹیوشنز کرتے رہے پھر نواب سر فتح علی خاں قزلباش کے اتالیق مقرر ہوگئے اور وہاں سے امرتسر اور اس کے بعد لدھیانہ پہنچ کر مدرسی کی مگر وارفتہ مزاجی نے ٹکنے نہ دیا مجبوراً وہاں سے نکل کھڑے ہوئے،

ترکی اُن دنوں ریاست کپورتھلہ میں تھے گرامی بھی وہیں پہنچ گئے اور وہاں پولس میں نوکری کرلی مگر پابندی نہ ہوسکی اس لئے یہ بھی چھوڑ دی

اور پٹیالہ، مالیر کوٹلہ وغیرہ کا چکر کاٹ کر رامپور پہنچے جہاں داغ اور امیر، جلال اور اسیر موجود تھے چونکہ نواب رامپور کو فارسی کا ذوق نہ تھا اس لئے گرامی کو کوئی موقع نہ مل سکا اور وہاں سے پھر پٹیالہ واپس ہونا پڑا، خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ نے عرصے تک اپنا مہمان رکھا اور پھر ایک سفارشی چھٹی حیدر آباد دکن کے رزیڈنٹ کے نام لکھ دی، چھٹی لے کر گرامی لاہور گئے اور وہاں سے حیدر آباد کا رُخ کیا حیدر آباد پہنچ کر رزیڈنٹ سے ملاقات کی اور اس نے حضور نظام سے سفارش کر دی،

میر غلام حسین قدر بلگرامی حیدر آباد میں بہ حیثیت شاعر ملازم تھے جنہیں چار سو روپئے ماہوار تنخواہ ملتی تھی ان کے انتقال کے بعد سے یہ اسامی خالی تھی، گرامی کا تقرر اسی جگہ ہوا مگر تنخواہ دو سو روپئے ماہوار دی جانے لگی، افسوس ہے کہ سرکاری ریکارڈ میں گرامی کے تقرر کا کوئی داخلہ نہیں ہے، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۹۸ف ۱۸۸۸ء سے دو سو روپئے تنخواہ گرامی کے نام جاری ہے،

عزیزہ ملک نے مجلہ نقوش لاہور کے شخصیات نمبر جلد اول (ص ۵۶-۶۲) جنوری ۱۹۵۶ء میں ایک مقالہ گرامی پر لکھا ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ حضور نظام نے گرامی کا تقرر کر کے بلایا مگر یہ سراسر غلط ہے گرامی رزیڈنسی کے سفارشی تھے، ابتدا رزیڈنسی ہی کے محلّے میں رہے اور رزیڈنسی والوں ہی میں اُٹھتے بیٹھتے تھے،

گرامی کی مسل (فائل) میں گرامی کی لکھی ہوئی ایک درخواست ہے،

"خداوند نعمت! خاکسار نے سات سال سے کسی قسم کی رخصت نہیں لی اب پنجاب میں میری والدہ صاحبہ سخت علیل ہیں اگر مجھے یکم جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ سے تین ماہ کی رخصت معہ تنخواہ

پیشگی ایامِ رخصت مرحمت فرمائی جائے تو والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر رہ کر سعادتِ دارین حاصل کروں فقط زیادہ حدِ ادب" اِس درخواست سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ گرامی کا تقرر ۱۳۰۶ھ میں ہوا ہے،

۱۳۰۱ھ میں جبکہ داغ نے مثنوی فریادِ داغ کہی تھی گرامی رامپور میں موجود تھے اور داغ کے پاس زیادہ آمد و رفت تھی چنانچہ اسی وجہ سے انہوں نے فریادِ داغ پر ایک طویل نظم کہی ہے جو طبع اوّل کے ساتھ چھپی ہے چونکہ نظم دلچسپ ہے اس لئے نقل کی جاتی ہے ؎

بیا اے بلبلِ کلکِ خوش آہنگ
بمدحِ داغ سر کن نغمۂ چنگ

فصاحت خندۂ صبحِ خیالش
بلاغت نغمۂ مرغِ کمالش

بلندی از دماغش بہرہ بردہ
نزاکت با خیالش شیر خوردہ

بہارستانِ صبحِ زندگانی
ادا فہمِ رموزِ نکتہ دانی

اگر پر بر زند فکرِ بلندش
رسد مرغِ معانی در کمندش

چناں در مثنوی شد سحر پرداز
کہ سحرش خط کشد بر حرفِ اعجاز

کند گر در غزل گوہر فشانی
فغانہا سر دہد روحِ فغانی

بمیدانِ فصاحت چوں در آید
گرہ از خاطرِ عرفی کشاید

اگر با مثنوی الفت گزیند
نظامی در پسِ زانو نشیند

ز رشکِ آں محیطِ خوش خیالی
بود غرقِ عرقِ فکرِ زلالی

زسرِ عالمِ بالا خبر گیر
کہ خواہد سر نوشتِ خطِ تقدیر

چناں تمثیل را دادہ رواجے
کہ از فکرِ غنی گیرد خراجے

ربود آں معنیٔ آرائے نکوئی
زہاتف گوئے از تاریخ گوئی

بکف بہر رقم گر خامہ گیرد   دبیر چرخ از حسرت بمیرد
چو شاگرداں بگردش حلقہ بندند   فلاطوں را بخدمت کم پسندند
عطارد چاکرش خود را شمارد   زشاگردیش پا بر چرخ دارد
دماغ ہوشمندی را تمیزے   بود مصر محبت را عزیزے
نژادش را گہر سوگند خوردہ   نجابت گوہرش را سجدہ کردہ
در اقلیم سخندانی امیری   بہ بزم معنی آگاہاں نظیری
زقدر مرتبت عالی جنابے   سپہر مردمی را آفتابے
سر سر کردۂ صاحب کمالاں   قبول خاطر رنگیں خیالاں
اگر مرغ خیالش پر کشاید   خیال عقل کل از پا در آید
حقیقت فہم اسرار معانی   شناسائے مزاج نکتہ دانی
حیا پروردۂ نور نگاہش   ادب یک گوشۂ طرف کلاہش
نیاید از زبان نکتہ پرور   گرامی مدحت داغ سخنور

۱۸۸۸ء میں گرامی کا تقرر حیدرآباد میں ہوا اور اسی سال داغ حیدرآباد آئے اور گرامی سے ملاقاتیں ہونے لگیں پھر دہلی جا کر جو واپس آئے تو مستقل طور پر حیدرآباد ہی میں رہے اور گرامی سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں میں نے جہاں تک تحقیق کی ہے، داغ اور گرامی کے تعلقات آخر تک نہایت اچھے اور مخلصانہ رہے کبھی کوئی اختلاف آپس میں نہیں ہوا"
والد مرحوم ترکی کے شاگرد اور دوست تھے دونوں کے مراسم بڑے گہرے تھے اور ترکی کی وجہ سے گرامی سے بھی مراسم ہو گئے تھے اور خاصی بے تکلفی تھی، داغ سے تو ان کے خصوصی مراسم تھے اس لئے وہ دونوں سے بہت زیادہ واقف تھے انہوں نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ داغ اور گرامی میں بڑا خلوص تھا اور

دونوں بڑی محبت سے ملتے جلتے تھے، بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ دونوں بڑے باری شاعر تھے اور دونوں میں لازماً نوک جھونک ہوتی ہوگی بعض گپتیں ہانک دیں مگر یہ سب غلط ہیں انہیں بے سروپا افواہوں کو حسن کر عزیز ملک نے دونوں کی آویزش ظاہر کی ہے جو غلط ہے،

گرامی کا تقرر شاعر کی حیثیت سے ضرور ہوا تھا اور وہ خاص خاص مواقع پر حاضر دربار ہوتے تھے مگر سالگرہ اور بعض خاص تقاریب ہی میں انہیں دربار میں آنے کی اجازت تھی عام طور پر وہ حضور میں باریاب نہ تھے اور نہ حضور کو ان سے کوئی دلچسپی تھی اس کی وجہ حضور نظام کی فارسی سے ناواقفیت یا بیزاری نہ تھی بلکہ حیدر آباد میں گرامی کو رزیڈنسی کا آدمی خیال کیا جاتا تھا، رزیڈنٹوں کا عام طریقہ یہ تھا کہ کسی کو سفارش کر کے نوکر رکھا دیتے تو اس سے اپنے تعلقات قائم رکھتے اور اکثر رزیڈنسی میں بلا کر اس سے حالات پوچھتے اور اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے تھے انہیں وجوہ سے حیدر آباد کے امراء گرامی سے دور دور رہے اور گرامی بھی سب سے الگ تھلگ رہتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے جب وطن میں قیام کرنے کی اجازت مانگی تو فوراً منظوری دیدی گئی اور وہ ۱۹۱۶ء میں حیدر آباد سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے، اور ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے گرامی کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ اقبال بیگم کے نام پچاس روپیہ وظیفہ ۱۴ اپریل ۱۹۲۸ء سے حضور نظام نے جاری فرمایا جن کا انتقال ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو ہوشیارپور میں ہوگیا،

ترکی کی وجہ سے میری آمد و رفت بھی گرامی کے پاس تھی اور اقبال بیگم مجھ پر بڑی شفقت فرماتی تھیں گرامی تو بس کھوئے ہوئے رہتے تھے

چلائے پلوادیتے اور پھر کھو جاتے، گرآمی کی شعر خوانی کا انداز مجھے بہت پسند تھا بڑی ہی سادگی سے شعر پڑھا کرتے تھے،

جی تو چاہتا ہے کہ داغ کے اور احباب کا حال بھی لکھوں مگر کتاب کی ضخامت بڑھتی جارہی ہے اس لئے مجبوراً اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں،

داغ سے احسن مارہروی نے خواہش کی تھی کہ نومشق شاگردوں کے لئے ایک پند نامہ نظم کردیں چنانچہ داغ نے یہ پند نامہ کہہ دیا تھا جسے احسن نے جلوۂ داغ میں شائع کیا ہے، چونکہ یہ قطعہ کارآمد ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے :-

پند نامۂ داغ

اپنے شاگردوں کی ہے مجھ کو ہدایت منظور
کہ سمجھ لیں تہِ دل سے یہ بجا اور بے جا

شعر گوئی میں رہیں پیشِ نظر یہ باتیں
کہ بغیر ان کے فصاحت نہیں ہوتی پیدا

چست بندش ہو نہ ہو سست یہی خوبی ہے
وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دبا

عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں
حرفِ علّت کا برا ان میں ہے گرنا دبنا

الف وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں
لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا

جس میں گنجلک نہ ہو تھوڑی بھی صراحت ہے وہی
وہ کنایہ ہے جو تصریح سے بھی ہو اولیٰ

عیب و خوبی کا سمجھنا ہے اک امرِ نازک
پہلے کچھ اور تھا اب رنگِ زباں اور ہوا

یہی اردو ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے
اہلِ دہلی نے اسے اور سے اب اور کیا

مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلّی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

جوہری نقدِ سخن کے ہیں پرکھنے والے
ہے وہ ٹکسال سے باہر جو کسوٹی نہ چڑھا

بعض الفاظ جو دو آتے ہیں اک معنی میں
ایک کو ترک کیا ایک کو قائم رکھا

ترک جو لفظ کیا اب نہیں وہ مستعمل
اگلے لوگوں کی زباں پر ہی تھا مزا

گرچہ تعقید بری ہے مگر اچھی ہے کہیں
ہو جو بندش میں مناسب تو نہیں عیب ذرا

شعر میں حشو و زوائد بھی برے ہوتے ہیں
ایسی بھرتی کو سمجھتے نہیں شاعر اچھا

گر کسی شعر میں ایطائے جلی آتا ہے
وہ بڑا عیب ہے کہتے ہیں اسے بے معنیٰ

استعارہ جو مزے کا ہو مزے کی تشبیہ
اس میں اک لطف ہے اس کہنے کا پھر کیا کہنا

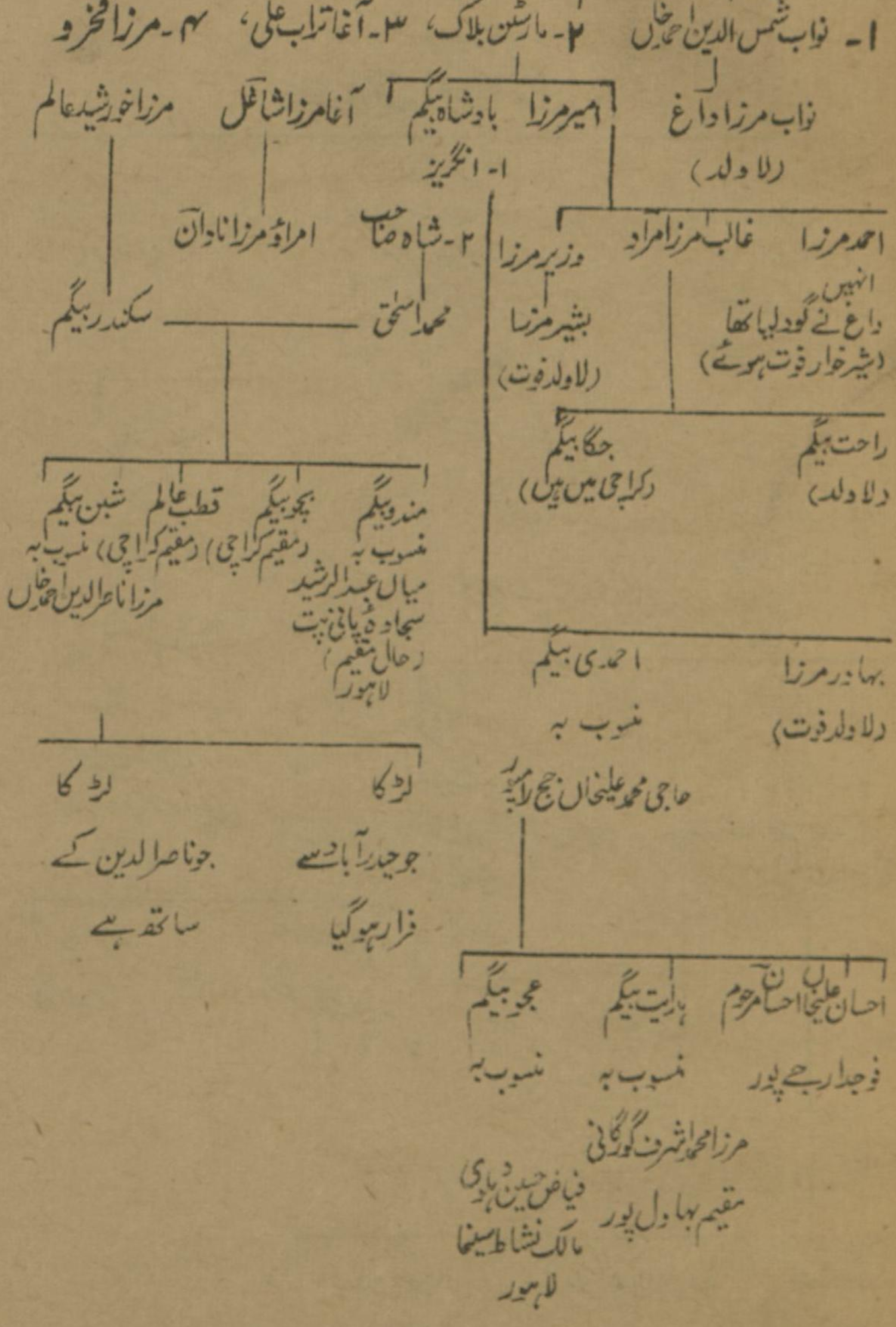
اصطلاح اچھی مثل اچھی ہو بندش اچھی
روزمرہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا

ہو اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو
ایک مصرع میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا

عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے — وہ بھی آئے متوالی تو نہایت ہے بُرا
لف و نشر آئے مرتب وہ بہت اچھا ہے — اور ہو غیر مرتب تو نہیں کچھ بیجا
شعر میں آئے جو ایہام کسی موقع پر — کیفیت اسمیں بھی ہے وہ بھی نہایت اچھا
جو نہ مرغوب طبیعت ہو بُری ہے وہ ردیف — شعر بے لطف ہے گر قافیہ ہو بے ڈھنگا
ایک مصرع میں تو تم دوسرے مصرع میں ہو تو — یہ شتر گربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا
چند بحریں متعارف ہیں فقط اردو میں — فارسی میں عربی میں ہیں مگر ان کے سوا
شعر میں ہوتی ہے شاعر کو ضرورت اس کی — گر عروض اس نے پڑھا ہے وہ سخنور دانا
مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت اُستاد — دین اللہ کی ہے جس کو یہ نعمت ہو عطا
بے اثر کے نہیں ہوتا کبھی مقبول کلام — اور تاثیر وہ شئے ہے جسے دیتا ہے خدا
گرچہ دُنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر — کسب فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا
سیّد احسن جو مرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں — جن کو اللہ نے دی فکر رسا طبع رسا
شعر کے حسن و قبائح جو انہوں نے پُوچھے — اُن کی درخواست پہ اک قطعہ برجستہ کہا

پند نامہ جو کہا داغ نے بیکار نہیں
کام کا قطعہ ہے یہ وقت پہ کام آئیگا

وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم



راحت النساء بیگم ہمشیرہ چھوٹی بیگم

منسوب بہ

حافظ ولی محمد ولد عبدالصمد کشمیری

- فاطمہ بیگم
  منسوب بہ
  داغ دہلوی
  - مرزا عبدالغفور
    عرف
    حاجی عبدالغفار
    - احمد النساء بیگم
      منسوب بہ
      سراج الدین
      ولد حافظ غیاث الدین
      دہلوی
      - محمودہ بیگم (فوت)
      - سعیدہ بیگم (مقیم لاہور)
  - کلثوم بیگم
    منسوب بہ
    میر تصدق حسین میرٹھی
    - صغرا بیگم
      منسوب بہ
      حافظ مرزا منیر الدین ضیا
      گورگانی دہلوی
      (لاولد فوت)
    - لاڈلی بیگم
      منسوب بہ
      ۱- مرزا ممتاز الدین احمد خان
      ۲- مرزا سراج الدین احمد خان
      - (۱ سے) مرزا ناظر الدین احمد خاں
        زوجہ
        شبن بیگم بنت سکندر بیگم
        نبیری مرزا خورشید عالم
      - (۲ سے) مرزا قطب الدین احمد خاں
        ان سے مرزا عبدالرب کی لڑکی بیاہی گئی
      - مرزا غلام نظام الدین احمد خاں
      - قدسیہ بیگم
- اولیاء بیگم
  منسوب بہ
  مرزا غلام قدوس
  (میرٹھ)
- عزیز بیگم
  منسوب بہ
  محمد جان
  (نو مسلم جان بل)
  - مرزا قطب الدین
    (نوجوان ڈوب مرے)

اِختتامیہ

مَیں چاہتا تھا کہ دو ڈھائی سَو صفحات کی کتاب داغ کے متعلق مرتّب ہو جائے اور خاص خاص واقعات اِس میں آجائیں، مگر جیسے ہی مَیں نے مسودہ مکمل کیا وُہ پھول جو گُلدستۂ طاقِ نسیاں بن گئے تھے پھر ایک ایک کر کے سامنے آگئے اور بہت سا مواد اِدھر اُدھر سے بھی مِل گیا جسے دوبارہ ترتیب دینا پڑا، دُوسرا مسودہ صاف کر رہا تھا کہ اور کچھ مواد مِلا جسے شریک کرنے کی خاطر پھر ترتیب بدلنی پڑی اور تیسرا مسودہ مرتّب ہُوا ؞

جیسی کتاب مَیں مرتّب کرنا چاہتا تھا افسوس ہے کہ ویسی مرتّب نہ کر سکا کیونکہ خاطر خواہ مواد نہ مِل سکا مگر میری کوشش جاری ہے اور اتفاق سے مواد ملتا جا رہا ہے چُنانچہ مسودہ مکمل ہو کر پریس کو جانے کے بعد بھی مجھے خاصا مواد ملا ہے جسے اِختتامیہ میں پیش کر رہا ہوں، اِس کے بعد جو مواد ملے گا انشاء اللہ تعالےٰ طبع ثانی میں پیش کروں گا ؞

صفحہ ۲۳۲ پر ناصر جلیل صاحب کی جو روایت مَیں نے لکھی ہے حالیہ مواد کی روشنی میں بالکل غلط ہے داغ کے خُسر شہزادگان دہلی سے نہ تھے بلکہ کشمیری ہی تھے، چُنانچہ آپ شجرۂ خاندان دیکھ رہے ہیں ؞

صفحہ ۱۷ پر داغ کے اُس مکان کا ذِکر کیا گیا ہے جس میں وُہ قیام رامپور کے زمانے میں رہا کرتے تھے، اب عزیزم جناب میر اکبر علی خاں سلمہ نے اس مکان کی ایک تصویر بھی فراہم کر دی ہے جو شائع کی جا رہی ہے ؞

لاڈلی بیگم صاحبہ نے کتاب "بزمِ داغ" سے متعلق اپنے تاثرات اخبارِ دِلشاد

کوٹہ راجستھان میں شائع کرائے ہیں، ان میں داغ کے معاشقۂ حجاب اور سفر کلکتہ کو انہوں نے نواب صاحب رام پور کے حکم کا نتیجہ ظاہر کیا ہے، یہ ہمارے لئے ایک نئی اطلاع ہے ممکن ہے کہ آئندہ کوئی تفصیل معلوم ہو، اس لئے کتاب میں اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرماتے ہوئے یہ بیان بھی پیش نظر رہے۔

صفحہ ۱۹۷ پر لوح مزار داغ کا کتبہ نقل ہوا ہے، اب یہ مزار مرمریں بن گئی ہے اور تصویریں بھی شائع کی جارہی ہیں۔

صفحہ ۲۴۵ پر ہم نے داغ کی پروردہ چھوکریوں کے متعلق تفصیل لکھی ہے اور بزم داغ کی روایت کی تکذیب کی ہے چنانچہ لاڈلی بیگم صاحبہ نے بھی اپنے تاثرات میں اس کی تکذیب کی ہے جس سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

بزم داغ ہی کے زیر اثر ہم نے کتاب میں ایک آدھ جگہ داغ کے "جانور خانے" کا ذکر کیا ہے، جس کی تردید اپنے تاثرات میں لاڈلی بیگم صاحبہ نے کی ہے اور ہم نے بھی جہاں تک تحقیق کی ہے داغ نے کوئی جانور خانہ رکھا ہی نہیں تھا۔

حال ہی میں یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم والدۂ داغ نے مارسٹن یا بلاک نامی ایک انگریز سے جو جے پور کا رزیڈنٹ یا وہیں کسی اور عہدے پر تھا، ایک لڑکا امیر مرزا اور ایک لڑکی بادشاہ بیگم نامی کو بھی جنم دیا تھا، داغ نے اپنے جس شیرخوار فرزند "احمد" کا تذکرہ گلزار داغ میں کیا ہے وہ امیر مرزا ہی کا لڑکا تھا جسے داغ نے گود لیا تھا اس کے علاوہ غالب مرزا، مراد اور وزیر مرزا بھی امیر مرزا کے بیٹے تھے مرزا مراد کی ایک بیٹی لاولد انتقال کر گئیں اور ایک اب کراچی میں ہیں، وزیر مرزا کے بیٹے بشیر مرزا البتہ لاولد مرے، بادشاہ بیگم خفی کے متعلق تذکرہ نویسوں نے بڑی گڑبڑ کی ہے ہماری تحقیق میں یہ آیا ہے کہ بادشاہ بیگم ابتداً کسی انگریز سے متعلق رہیں جس سے

ایک لڑکا بہادر مرزا اور ایک لڑکی احمدی بیگم ہوئیں، بہادر مرزا لاولد فوت ہوئے اور احمدی بیگم کا عقد ۲۴ راکتوبر ۱۸۷۷ء کو حاجی محمد علی خاں جج رامپور سے ہوا جن سے ۱۰ راکتوبر ۱۸۸۶ء کو میاں احسان علی خاں احسان تولد ہوئے جو جے پور میں فوجدار رہے اور پھر ریٹائر ہو کر بہتر برس کی عمر میں ۱۹۵۸ء میں جے پور ہی میں انتقال کیا اُن کی اولاد اب پاکستان میں موجود ہے، احسان بڑے اچھے شاعر تھے تذکرۂ شعراء جے پور میں اُن کا کلام موجود ہے ؞

بادشاہ بیگم نے انگریز کے بعد ایک شاہ صاحب[1] سے جو جے پور کے صاحب خرقہ وسجادہ بزرگ تھے عقد کیا تھا جن سے محمد اسحٰق نامی ایک لڑکا تھا جس سے مرزا خورشید عالم کی لڑکی سکندر بیگم بیاہی گئیں جن کی ۲ دو لڑکیاں منارہ بیگم اور بچو بیگم اب پاکستان میں ہیں اور ایک فرزند قطب عالم کراچی میں ہیں، مرزا ناصر الدین احمد خاں کی بیوی شبن بیگم بھی محمد اسحٰق ہی کی بیٹی تھیں جن کا ذکر کتاب میں آچکا ہے ؞

میاں احسان جے پوری کی ۲ دو بہنیں ہدایت بیگم اور عجو بیگم بھی اب پاکستان ہی میں ہیں ؞

داغ کی ایک خالہ راحت النساء بیگم بھی تھیں جو حافظ ولی محمد ولد عبد الصمد کشمیری سے بیاہی گئی تھیں چنانچہ داغ کی بیوی فاطمہ بیگم انہیں کی بڑی بیٹی تھیں، جن کی بہن اولیاء بیگم تھیں جو مرزا غلام قدوس میرٹھی سے بیاہی گئی تھیں ان کے بیٹے مرزا عبد الغفور عرف حاجی عبد الغفار کی اولاد اب پاکستان میں ہے اور انہی کی بیٹی کلثوم بیگم جو میر تصدق حسین میرٹھی سے بیاہی گئی تھیں کی

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے پہلے بادشاہ بیگم کو مُرید کیا پھر نکاح کر لیا جن کی وجہ سے بادشاہ بیگم بھی پابند صوم وصلواۃ ہو گئی تھیں ؞

بیٹی لاڈلی بیگم تھیں جنہیں داغ نے گود لیا تھا اور وُہ اب بھی پاکستان میں موجود ہیں، لاڈلی بیگم کی بڑی بہن صُغرا بیگم حافظ مرزا منیرالدین ضیا گورگانی خلف مرزا احیا سے بیاہی گئی تھیں جو مرزا ضیا کے ساتھ حیدرآباد میں رہیں اور یہیں دونوں کا انتقال ہُوا ٭

تفصیل کے لئے شجرے بھی مرتّب کردئے گئے ہیں ٭

اِن معلومات کے لئے مَیں جناب فاضل زیدی کا ممنون ہُوں کہ انہوں نے ابتدأً یہ تفصیلات فراہم کیں اس کے بعد جناب احترام الدین شاغل جے پوری، نواب خسرو مرزا دہلوی، مجبّی امتیاز علی خاں عرشی، جناب راز یزدانی رامپوری اور مجبّی مالک رام نے بھی اپنی معلومات سے نوازا ٭

افسوس ہے کہ امیر مرزا سے متعلّق تفصیل معلوم نہ ہوسکی صرف اتنا معلوم ہُوا کہ وُہ جے پور پولیس کے ڈپٹی سُپرنٹنڈنٹ تھے اور داغ کے بعد زندہ تھے، چُونکہ وُہ دو تین دفعہ حیدرآباد آچکے اور داغ کے مہمان رہ چکے تھے اِس لئے شاگردانِ داغ یہ تو بیان کرتے تھے کہ امیر مرزا نامی داغ کے ایک عزیز جو بہت سُرخ و سفید جوان تھے داغ کے مہمان ہوا کرتے تھے مگر اِن لوگوں کو اس قرابتِ قریبہ کا عِلم نہ تھا ٭

۱۳۱۶ھ میں جب داغ کی بیوی کا انتقال ہُوا تو داغ نے قبر پُختہ بنوا کر اپنی کہی ہوئی تاریخ کندہ کرا کر لگوا دی تھی، جب داغ کا انتقال ہُوا تو وُہ بھی اپنی اہلیہ کے پہلو میں دفن ہوئے اور سائل نے پُختہ قبر بنوا کر اپنی کہی ہوئی تاریخ کندہ کرا کر لگوا دی تھی جو حال تک محفوظ تھی مگر بارش کی وجہ سے نہ صرف داغ کی بیوی کی مزار جگہ جگہ سے کٹ گئی تھی بلکہ لوح مزار بھی نکل گئی تھی جسے متولّیٔ درگاہ نے محفوظ کر دیا تھا، اِن دونوں قبروں کا حال دیکھ کر داغ کے

چاہنے والے بیچین ہو گئے اور انہوں نے تعمیر مزار داغ کے لئے ایک کمیٹی بنا کر اپیل کی اور رقم بھی مہیا ہو گئی جس سے داغ اور ان کی بیوی کے مزار سنگ مرمر کے بنا دئے گئے اور اطراف ایک مختصر سا کٹہرہ بھی سنگ مرمر کا نصب کر دیا گیا، اور ان قبروں کی لوحیں بھی دو جدید کتبوں کے ساتھ لگا دی گئیں ۔

داغ کی مزار پر وہی سائل کی کہی ہوئی تاریخ کا کتبہ لگا دیا گیا ہے جو صفحہ ۱۹۷ پر نقل کیا جا چکا ہے البتہ اس کے نیچے ایک اور کتبہ اس عبارت کا بھی لگا دیا گیا ہے،

غفر لھما

ضریح شاعر نامور نواب مرزا داغ د قبر زوجہ کریمہ بجنب یک دیگر بود بمرور ایام کہنہ و بوسیدہ شدہ بود، درین آوان رذی حجہ ۱۳۷۵ھ ہجری بحسن سعی بعض قدر دانان شاعر مغفور تجدید ہر دو قبور و تنصیب کٹہرہ و فرش سنگ مرمر و تعویذ ہائے مرمر بعمل آمد

(اسمائے معطین جلیل القدر)

۱۔ امنائی نظامس چیریٹی فنڈ، ۲۔ حیدر آباد کارپوریشن ،

۳۔ نواب سید محمد رضا علی خاں سابق فرمانروائے ریاست رامپور،

۴۔ سر رشتہ اوقات حیدر آباد، ۵۔ بعض اصحاب خیر،

کارگزاران

غلام یزدانی ، عابد علی خاں ، سید محمد یونس ، حبیب الرحمان ، فضل الرحمن ، جانکی پرشاد ، یٰسین علی خاں ،

داغ کی بیوی کی مزار کا کتبہ چونکہ مدّت سے نہ تھا اس لئے کتاب میں نقل نہیں کیا جا سکا، اب یہ کتبہ بھی نصب ہو گیا ہے جسے نقل کیا جا رہا ہے ؎

ہُوالغفّار

بروز جُمعہ چو ہمنام فاطمہ بیگم
پسِ نماز بدرگاہ زیرِ خاک نہفت
بفکرِ سالِ دلِ داغدارِ داغِ حزین
مزارِ اہلیۂ داغ آہ آہ بگفت

۱۲ ھ ۱۶

۱۶۰ ۱۳ھ

غفر لھا

اِس کتبے کی پُشت پر کمیٹی نے یہ کتبہ بھی لگا دیا ہے،

غفر لھا

مزار زوجۂ کریمۂ
حضرت داغ دہلوی
تاریخ وفات ۱۳۱۶ھ

کمیٹی نے دونوں کتبے مشہور خوش نویس جابر سے لکھوائے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ امیر مینائی اور اُن کی صاحبزادی کے مزار جو ملے ہوئے ہیں سنگ مرمر کے بنوا دئے ہیں،

اس کے لئے پدما بھوشن ڈاکٹر غلام یزدانی شکریہ کے مستحق ہیں۔

خان بہادر نقی محمد خاں صاحب خورجوی نے اپنی آپ بیتی "عمرِ رفتہ"

نام سے شائع کی ہے اس میں داغ کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ داغ حیدرآباد آنے سے پہلے خورجہ بھی گئے تھے اُن کے قیام خورجہ کے دوران میں خورجہ کے دو پٹھان داغ کو چھیڑنے کے خیال سے اُن سے ملے اور ایک شخص نے کہا میرے یہ ساتھی شاعر ہیں اور ولی تخلص کرتے ہیں مگر کلام سناتے ہوئے شرماتے ہیں آپ کی اجازت ہو تو ان کا کلام میں سناؤں، داغ نے اجازت دی اور انہوں کہا کہ یہ غزل آپ ہی کی غزل سے

فغاں میں آہ میں فریاد میں شیون میں نالے میں
سناؤں دردِ دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

پر کہی گئی ہے، چنانچہ چند شعر سنا کر یہ مقطع سنایا ؎

ولی خورجہ میں آنا داغ کا ایسا تعجب ہے
کہ بھینسا پھنس گیا ہو جس طرح مکڑی کے جالے میں

اِس واقعہ کو لکھتے ہوئے خان بہادر نے لکھا ہے کہ

"داغ نے غزل کے بعض اور شعر سن کر تو داد دی لیکن مقطع سن کر ہنسے اور خاموش ہو گئے۔" (عمر رفتہ ص۲۵ مطبوعہ ٹائمز پریس کراچی)

بعض لوگوں کو داغ کی اِس سنجیدگی اور متانت پر حیرت ہو گی کہ ایسا طنز بلکہ کھلا ہوا پھکڑ مزاح وہ کس طرح برداشت کر گئے مگر یہ حیرت کی کوئی بات نہیں، رامپور میں اُن پر مشکی خر کی پھبتی کسی گئی اور اصطبل میں داغ ہونے کا فقرہ جست کیا گیا تو وہ ہنس کر خاموش ہو گئے، حیدرآباد میں اُن کی ٹوپی اور سیاہ فامی کا مضحکہ "کسوٹی پر سونا" کہہ کر اُڑایا گیا تو وہ ہنستے رہے۔

داغ کے ایک شاگرد بیان کرتے تھے کہ جب انہوں نے "صحنِ زمین سطحِ فلک" والا قصیدہ کہا اور اس کی شہرت ہوئی تو حیدرآباد کے ایک

من چلے نے جو اُن کا مخالف تھا اِس قصیدے کی مٹّی پلید کی اور اس میں گندہ الفاظ بڑھا کر عجیب و غریب بنا دیا اور ایک روز خود اُن کی خدمت میں پہنچ کر کہا کہ اُستاد مَیں نے ایک قصیدہ کہا ہے بہ نظرِ اصلاح مُلاحظہ فرمائیے اور پھر قصیدہ سُنانا شروع کیا، چُنانچہ ایک ہی شعر مجھے یاد رہ گیا ہے جو نقل کیے دیتا ہُوں ؎

شاہِ دکن کا بادپا مشرق سے کب مغرب گیا
جھُوٹے کی ماں کا.... صحنِ زمیں سطحِ فلک

سُنا ہے کہ پُورا قصیدہ ایسا ہی مغلّظ بنا دیا گیا تھا داغ نے سُنا اور خوب داد دی اور وہ شخص خود [illegible] ہوا چلا گیا،

حیدر آباد میں داغ کے ایک شعر کو کسی نے بدل کر مشہور کر دیا اور وہ اکثر لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا، داغ کا شعر تھا ؎

ہزار کام محبّت میں ہیں مزے کے داغ　　جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

کِسی نے یُوں شہرت دی تھی ؎

تمام رات لِٹا کر بغل میں مہ رو کو　　جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

جب لوگ یہ شعر سُنتے اور اُستاد کو سُناتے تو اُستاد ہنستے اور فرماتے، کمال ہے کمال!

غرض داغ اتنے متین ایسے ضابطہ اور طبیعت دار تھے کہ ان کو پانا بڑا مُشکل تھا۔

مولانا شبلی سے داغ کے مراسم بہت پُرخلوص تھے مولانا ان کی عُمر اور ان کی شاعری کی وجہ سے اُن کا بہت احترام کرتے تھے اور داغ مولانا کے علم و فضل اور اُن کی شخصیّت کے احترام میں بہت مبالغہ کرتے تھے، مولانا شبلی نے

ایک قصیدے میں داغ کا نام اپنے ساتھ اِس طرح لیا ہے، ع

شبلیؔ سحر فن و داغ سخنداں از نسبت!

مولانا حالی داغ سے جتنا خفا تھے مولانا شبلی داغ سے اُتنے ہی خوش تھے، حالانکہ غالب کے تعلق سے حالی کو داغ سے مانوس ہونا چاہیئے تھا مگر خُدا جانے کیا بات تھی کہ وہ مکدر رہتے تھے،

شبلی تو خیر بڑے وسیع القلب تھے اور مشاہیر بھی داغ کے معترف اور مداح تھے چُنانچہ سبھوں نے داغ کو خراج تحسین پیش کیا ہے جن کا اعادہ باعثِ طوالت ہوگا۔

تصاویر، مجھے توقع تھی کہ سترہ سال تک داغ نے شاہی تقاریب اور درباروں میں جب مسلسل شرکت کی ہے تو اُن کے مرقع محفوظ ہوں گے چُنانچہ اِسی اُمید پر شاہی مصوّر "راجہ دین دیال مصوّر جنگ" کے نگار خانے کی چکریں کاٹیں اِس نگار خانے کے موجودہ مالک رائے حُکم چند بھی میرے پُرانے شناسا اور مُلاقاتی ہیں انہوں نے بھی ڈیڑھ دو مہینے پُورے نگار خانہ کا جائزہ لیا اور سارے مرقع دیکھ ڈالے مگر کوئی مرقع ایسا نہ مِلا جس میں داغ ہوں، دربار کا نہ کسی تقریب کا نہ شکار کا، لُطفِ خاص یہ کہ داغ کی وہ تصویریں جو راجہ دین دیال کے نگار خانے میں لی گئی تھیں اور عام طور پر فروخت ہوئیں اب ان کے آئینے بھی نہیں اس طرح مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

مجبوراً مَیں نے حیدرآباد کے نوجوان مصوّر عبدالغفار صاحب سے داغ کا ایک پنسل کا خاکہ بنوا لیا ہے جو پیش ہے اس کے لئے مَیں غفار صاحب کا ممنون ہوں۔

۱۹۰۷ء میں کیفی حیدرآبادی نے داغ کی چند تصویریں کھنچوائی تھی چُنانچہ

ایک مرقع جس میں نوح ناروی بھی موجود ہیں مجھے برادرم میر یاسین علی خاں کے پاس سے مل گیا جو پیش کیا جا رہا ہے اس میں داغ کے پندرہ شاگرد اور اُن کے بھتیجے ناداں اور داماد سائل اور بھائی خورشید عالم اور کاتب دیوان غلام رسول اور ملازم خاص حمید تک موجود ہیں، اُسی روز کیفی نے ایک اور تصویر اُسی جگہ کھنچوائی تھی جس میں کیفی، داغ اور سائل بیٹھے ہوئے اور ناصرالدین احمد خاں اور حامد حسن بے دل کھڑے ہوئے تھے، اس تصویر کا ایک ٹکڑا حضرت مولانا سید خورشید علی کے ذخیرے سے ملا جو تقریباً از کار رفتہ ہو گیا تھا مگر اسے جوڑنے سے داغ اور کیفی اور ناصر الگ الگ رہ گئے، اس کو میں نے درست کرانے کی کوشش کی اور غفار صاحب نے مہینوں ڈال رکھا مگر وہ کچھ اپنی مصروفیت اور کچھ کاہلی کی وجہ سے درست نہ کر سکے مجبوراً اسی طرح پیش کر رہا ہوں، جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے داغ کا یہ مرقع اور یہ تصویر سب سے آخری ہیں ان کے بعد داغ کی تصویریں نہیں لی گئیں اس لئے ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

یہ تصویر اسی کوٹھی کے برآمدے کے سامنے لی گئی ہے جس میں داغ کا انتقال ہوا اور اب یہ رائے رام چند راستھانہ کی ملک ہے یہ کوٹھی جوں کی توں اب تک موجود ہے چنانچہ اس کی تصویر شائع کی جا رہی ہے،

داغ نے پہلی مرتبہ حیدر آباد آ کر جس دو منزلہ پر قیام کیا تھا اس کی صورت اب بدل گئی ہے اور جرمن ڈیبو اُمن بن کر رہ گیا ہے مگر ہے وہی اس لئے اس کی تصویر بھی پیش ہے،

افضل گنج میں داغ نے "عیش منزل" بنائی تھی اندرونی حصہ تو اب بالکل بدل گیا بیرونی حصہ اور دو منزلہ کا کچھ حصہ البتہ اب بھی موجود ہے جس کی تصویر

شائع کی جا رہی ہے،

ترپ بازار کی کوٹھی کا ذکر آ چکا ہے، داغ کی آرامگاہ کے دو مناظر سرہانے اور پائین کے الگ الگ پیش ہیں، یہ تصویریں سیّد علی کاظمی سلمہ نے لی ہیں۔

داغ کے خط کی تصویر افسوس ہے کہ نئی نہ مِل سکی وہی پُرانی پیش کی جا رہی ہے انشاء اللہ طبع دوم میں کوئی نئی تحریر پیش کی جائے گی ؛

مجھے اعتراف ہے کہ مَیں کامیابی کے ساتھ سوانح نگاری نہ کر سکا اور کرتا بھی کس طرح جب مواد ہی میسّر نہ ہو پھر بھی مَیں نے "سُنی سُنائی" کے علاوہ "فرضی مواد" بھی فراہم کیا ہے اور ایک ایسی کتاب مرتّب کر دی ہے جو آپ کو داغ کے قریب پہنچا دیتی ہے ؛

یقین ہے کہ اربابِ علم میری مجبوری پر نظر رکھ کر مواد کی عدم میسّری اور فروگزاشت میں امتیاز فرمائیں گے، اور میری کوتاہیوں سے مجھے باخبر فرما کر ممنون فرمائیں گے تاکہ آئندہ ان کی تلافی کر سکوں ؛

ممکن ہے کہ یہ کتاب میرے دُوسرے مُنتشر مسودات کی طرح پڑی رہتی کیونکہ مَیں اپنے آلام و افکار اور صحت کی خرابی کی وجہ سے اِس کی ترتیب اور صاف نویسی کی طرف متوجہ ہی نہ تھا مگر مکرمی جناب فضا جالندھری کی تحریک اور مکرمی جناب عبدالسلام صاحب (آئینۂ ادب، لاہور) کے پیہم تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے صرف مرتّب بلکہ صاف بھی کرنا پڑا اور سلام صاحب نے اِس "عروسِ جمیل" کو "لباسِ حریری" بھی پہنا دیا ؛

مَیں خوش ہوں کہ بُری بھلی ایک سوانح عُمری داغ کے شایانِ شان ضرور شائع ہو رہی ہے، خُدا کرے داغ کے کلام کی طرح اسے بھی پسند کیا جائے ؛

تمکین کاظمی
یکم جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

سُلطان شاہی حیدرآباد دکن ۲
(آندھرا پردیش)